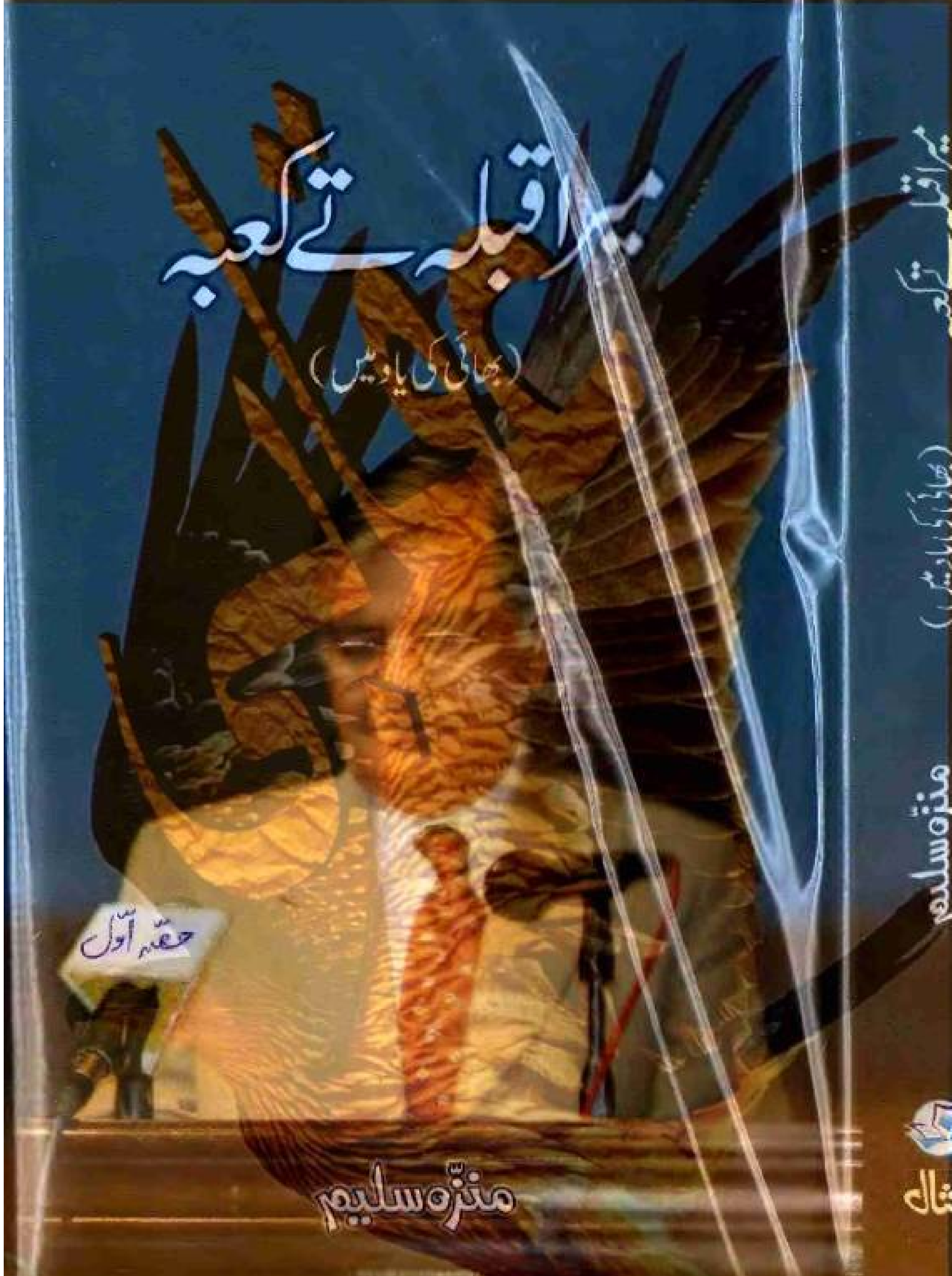
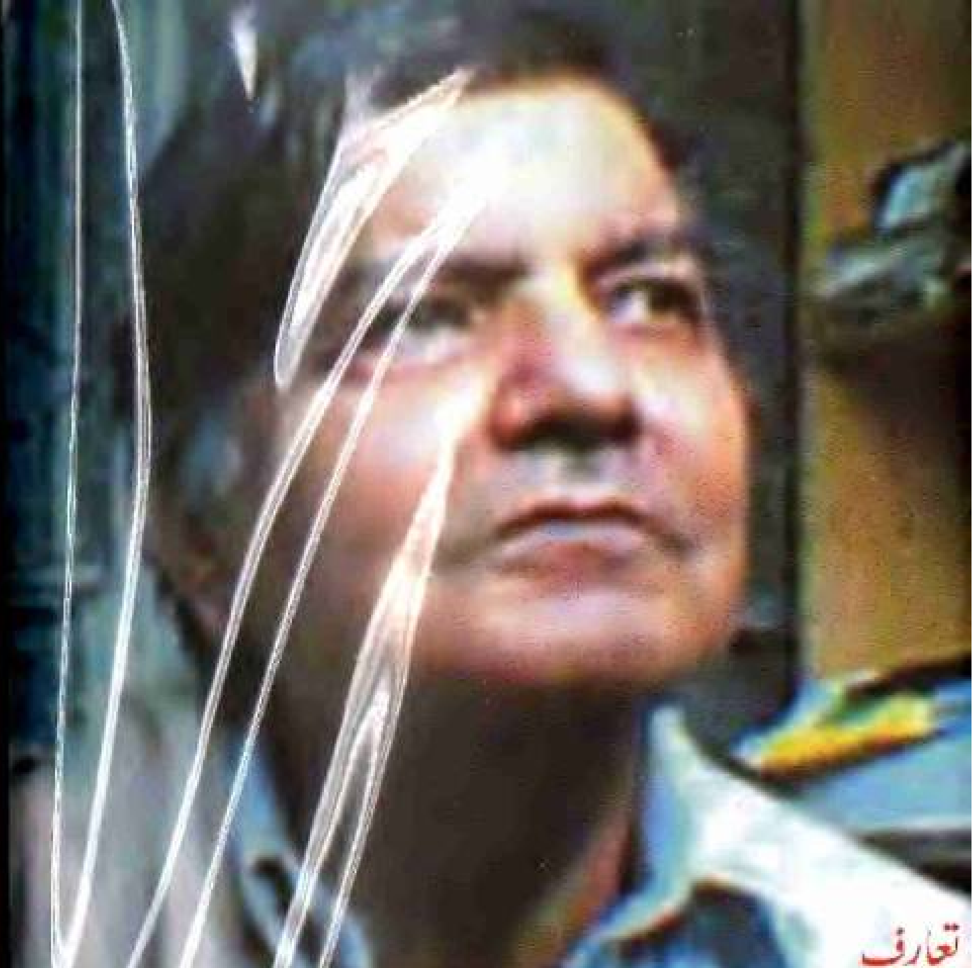


میرا قبلہ تے کعبہ (بھائی کی یاد میں) منزّہ سلیم

مثال



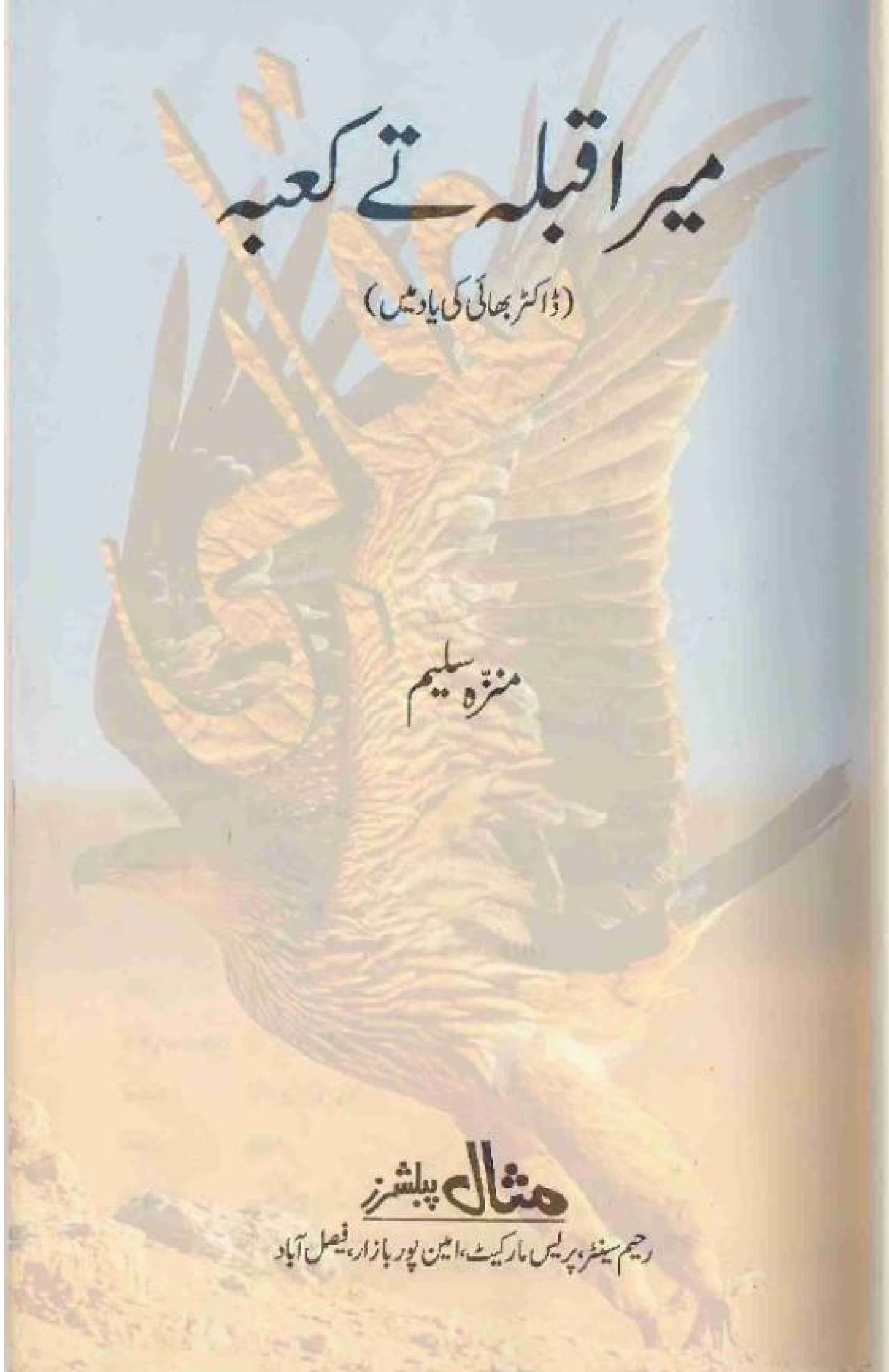
تعارف

ڈاکٹر مقبول اختر، 13 نومبر 1938ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ا... ایس...
گورنمنٹ کالج لاہور سے اور پھر 1962ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا...
کچھ عرصہ اپنے ننھیال (میجر اسحاق محمد) کے گاؤں اور پھر لائل پور میں پریکٹس کرنے کے
بعد 1964ء میں مسقط چلے گئے۔ 1966ء میں واپس آ کر دوبارہ لائل پور میں پریکٹس شروع کر دی۔
1986ء میں M.C.P.S سائیکیٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد سوشل سکیورٹی ہسپتال فیصل آباد میں
بطور ماہرِ نفسیات تعینات ہو گئے اور شام میں ستیانہ روڈ پر پرائیوٹ پریکٹس کرنے لگے۔
18 جنوری 2010ء کو ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور 10 اگست 2010ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا
اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اپنے آبائی قبرستان، شیر سنگھ والا فیصل آباد میں اپنی والدہ محترمہ کے
قدموں اور اپنی اہلیہ کے پہلو میں ابدی نیند جا سوئے۔



”جس طرح رونا چاہیے اس طرح تو مجھے
آتا ہی نہیں بس یونہی بیٹھی ہوئی ہوں
آنسوؤں سے تر ہاتھ سر پر رکھ کر“

(شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ)



میرا قبلہ تے کعبہ

(ڈاکٹر بھائی کی یاد میں)

منزّہ سلیم

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

سُچجّی، سُنلّھی تے مِٹھڑی

کریماں بی بی

دے ناں

جہدے پیراں تھلّے میری جنت سی

تے جہنے مینوں

اوڈے ای سُچجے، سُگھڑ تے مِٹھڑے ویرے دِتّے

طلوعِ اول: 2011

کتاب: میرا قبلہ تے کعبہ

مصنفہ: عزہ سلیم

ہاؤس نمبر 76، سٹریٹ نمبر 2، شادمان ٹاؤن،
سرگودھا روڈ، فیصل آباد، فون: 041-8789494

ناشر: محمد عابد

ٹائٹل کی تصاویر: عاصم برادر احمد عزیز

مطبع: شرکت پریس، لاہور

تعداد: 200

اہتمام: مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalph@gmail.com

فہرست

ع ناۓ اساں ونڈ لئے نے ہنجواں دے ٹک ٹک
ڈاکٹر مقبول اختر کے احباب کے مضامین

تلسی داس نوں کسے پچھیا!

''ایڈے وڈے عالم، فاضل ہو کے تساں سنسکرت چھڈ کے ہندی نوں کیوں اپنایا اے؟

تلسی داس نے پرتاودِتا!

''سنسکرت اک اجیہا سونے دا منقش پیالہ ہے جہدے وچ زہر بھری ہوئی ہے۔
پر میری ماں بولی ہندی اُک اجیہا مٹی دا پیالہ ہے جس وچ امرت بھریا ہویا ہے۔''

میں تلسی داس تے نہیں بن سکدی پر اپنی ماں بولی نال پیار تے کر سکدی آں ناں؟ ساری عمر اردو وچ پڑھیا تے لکھیا اے۔۔۔ ایدھی اپنی مٹھت اے۔ اے کتاب وی اردو وچ ای لکھی اے پر ایدھے وچ میں، سرناویں پنجابی وچ لکھ کے پنجابی زبان نوں "I Love U" آکھیا اے۔

○○○

پچھا نہہ مڑکے کی لبھدے او؟

Nostalgia سے مراد ماضی کی للک ہے، عام طور پر مثالی، معیاری، کامل اور اعلیٰ ترین انداز میں۔ یہ یونانی زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ N'otos جس سے مراد 'گھر کو واپسی' ہے اور A'lgos جس کا مطلب 'درد یا دکھ' ہے۔۔۔ یعنی ماضی کی یادوں میں کھو کر دکھی ہو جانا۔ اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ ماضی کے ادوار، اس کی شخصیات، واقعات اور خاص طور پر "Good old days" کو یاد کرنا۔ انہیں اپنے لیے مینار نور بناتے ہوئے۔ کبھی اچانک سے کسی واقعہ کا 'بازتصویر' سامنے آ جانا یا بچپن سے کچھ اخذ کرنا۔۔۔ ستائشی محسوسات کے ساتھ۔

جناب مشتاق احمد یوسفی اپنی کتاب 'آبِ گم' کے دیباچہ 'تصنیف رامصنف' میں ناسٹل جیا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یاد رہے کہ بڑھاپے کا 'جوانی' لیوا حملہ کسی بھی عمر میں۔۔۔ بالخصوص بھری جوانی میں۔۔۔ ہو سکتا ہے۔۔۔ غور سے دیکھا جائے تو

ایشیائی ڈرامے کا ولن ماضی ہے۔ پاستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤسی رقص دیدنی ہوتا ہے کہ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ناسٹل جیا اسی لمحۂ منجمد کی داستان ہے۔''

میں بھی نشۂ ماضی میں سرمست، ناسٹل جیا کی ایک مریضہ ہوں۔

میں نے اپنی بھری جوانی، یعنی تیس برس کی عمر میں، تین سال کے عرصہ کے دوران والدین اور دو جوان بھائیوں کا صدمہ دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا حال میرے ماضی میں تبدیل ہو گیا تو میں اس 'جوانی' لیوا مرض میں مبتلا ہو گئی اور Unfinished Bereveament کی وجہ سے آج تک صحت یاب نہ ہو پائی۔

زندگی دکھ اور سکھ کا مونتاژ ہے۔ دھوپ اور سائے۔۔۔ ماضی بن جانے والا میرا حال مجھے سونے نہیں دیتا، لیکن میں صحت یاب ہونا نہیں چاہتی کیونکہ میرے ماضی کی یادیں، وہ ریت ہیں جن میں مَیں اپنے حال کے طوفانوں کو دیکھ کر منہ چھپا لیتی ہوں اور میرے ماضی کی روشن یادوں کے ہنڈولے مجھے بھٹکنے نہیں دیتے۔

میں نے اپنے میکے کی یادوں کی خوشبو میں بسی پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' میں 'پیار کا ساون' کے عنوان سے لکھا ہے۔

'ناسٹل جیا۔۔۔ ناسٹل جیا کیوں؟ ماضی میں جینا کس لیے؟ جانتی ہوں کہ منہ پھیر کر دیکھتے رہنے کو آپ پسند نہ کریں گے، لیکن اگر ماضی میں

'پیار کا ساون ہو
محبتوں کی برسات ہو
قہقہوں کے جھولے ہوں
اور سب ساتھ ہوں'

تو کیا اس سے منہ پھیرا جا سکتا ہے؟ زندگی میں اور کس چیز کی ضرورت ہے؟

بے انتہا تشکر کہ خدا نے میرے حال کو رشتوں کی محبتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔۔۔ بہت کچھ ہے، بے بہا، بے شمار، بے پناہ۔۔۔ سب سے بڑھ کر میری نواسیاں۔۔۔ 'مایۂ خویش' لیکن انسانی رشتوں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک رشتے کی جگہ، دوسرا رشتہ نہیں لے سکتا۔۔۔ ورنہ کوئی روئے کیوں؟ اور پھر رونے میں شرمندگی کیسی؟

ایک ہی والدین کے بچے، آپس میں بہن بھائی ہی ہوتے ہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ جیسے بہن بھائی ہم تھے، دنیا میں کم ہی ہوں گے۔

یہ کتاب میں نے اپنے منجھلے اور آخری حیات بھائی 'ڈاکٹر مقبول اختر' کی یاد میں لکھی ہے۔ وہ میرے لیے باپ، بھائی، دوست، معالج، صلاح کار اور بہترین ساتھی تھے۔ جن کے سہارے میں اپنی زندگی کے دکھوں، پریشانیوں اور محرومیوں کو برداشت کرتی رہی۔

جن کے رخصت ہو جانے سے صرف ایک گھنٹہ قبل میں نے ان کے سینے پر سر رکھا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں مجھے نصیحت (یا وصیت) کی کہ

''ہنستی رہنا، کتاب مکمل کرنا اور سب کا خیال رکھنا''

میں نے مسکراتے چہرے اور روتے دل کے ساتھ، ان کے سینے سے سر اُٹھایا اور ان کی بات کا جواب، اشاروں کی زبان میں دیتے ہوئے، ان کی فکرمندی کو وقتی طور پر دور کرنے کی ناکام کوشش کی (برین ہیمرج کی وجہ سے ان کی قوتِ سماعت مکمل طور پر جاتی رہی تھی)

ان کے جدا ہو جانے کے بعد میں نے سوچا کہ کیا میں یہ سب کر پاؤں گی؟ ان کی محبت، رہنمائی اور سہارے کے بغیر۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا، جس کا فیصلہ مستقبل کو کرنا تھا، ہر اس کام کی طرح جو ناممکن نظر آتا ہو۔۔۔ اور اس کا جواب یہ تھا کہ مجھے

یہ سب کرنا ہوگا۔۔۔ اس ساٹھ سالہ 'بچی' کو۔۔۔ وہ 'بچی' جوان کے رخصت ہوتے ہی، یکلخت ایک نحیف، تنہا اور عمر رسیدہ بڑھیا میں تبدیل ہو گئی تھی۔۔۔ لمحاتی کرشمہ۔۔۔

ان کے جانے کے چار ماہ بعد میں نے اپنی دوسری کتاب 'ادھوری عورت' جو کہ ایک ناول ہے، مکمل کر لی۔ کیسے کی؟ مجھے خود پر حیرت ہے کہ شدید صدمے کی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہوا؟ بس وہی جذبہ، جس کے تحت 'پیر و مرشد' کے کہنے پر جان وارنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

سب کا خیال رکھنے کی بات آتی ہے تو میں اپنی سی کوشش تو کر سکتی ہوں۔۔۔ ان کے لیے جو اس بات پر راضی ہوں۔۔۔ لیکن بھائی جیسا حوصلہ مجھ میں کہاں؟

اور ہنستے رہنے والی نصیحت کا احوال یہ ہے کہ ایک طرف تو مجھے ہنستے رہنے کو کہا اور جاتے جاتے مجھ سے 'Hand' کر گئے۔ چپکے سے میری ہنسی اپنے ساتھ لے گئے۔ جو ابھی تک تو واپس نہیں آئی، آئندہ کے لیے کیا کہوں؟

ان سے میرا تعلق ایسا تھا جس میں خاموشی بھی زبان بن جاتی ہے۔۔۔ بنا کچھ کہے۔۔۔ بنا کچھ سنے، ہم ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اب کوئی ہم سخن، کوئی ہم زبان مجھے میسر نہ آ سکے گا۔ ان کا جانا نوشتۂ دیوار ہے لیکن اسے پڑھنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں؟

ے تمہی کیوں اُٹھ کے چل دیے
کہ دیدنی تھا دن ابھی
اور دیدنی تھی شام بھی

ماضی انمول ہے اور واپسی کا سفر ناممکن۔۔۔

ہم دونوں میں صرف یادوں اور دُکھوں کی سانجھ ہی نہیں تھی، ہم بہت مزے مزے کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ لطیفہ گوئی، سیاست، انسان دوستی، ادب، شاعری، موسیقی۔۔۔ وہ علم کا خزینہ تھے۔ وہ کیا تھے؟ میرے احساسات کو الفاظ میں مقید کرنا ناممکن ہے۔

مر گئے ہم تو یہ کتبے پہ لکھا جائے گا
سو گئے آپ زمانے کو جگانے والے

اور اب میں لکھوں تو کیونکر کہ وہ شخص، میرے ماضی کا حصہ بن چکا ہے، جو جانے کے بعد بھی میرے سامنے، میرے قریب ہے۔ جس کی محبت، اس محبت کی ساری شدت اور اس محبت کی چاشنی، پاکیزگی اور بلند قامتی میری محدود سی دنیا کا سرمایہ ہے یا جس کی غیر موجودگی کو ابھی تک دل نے تسلیم نہ کیا ہو، جس کے 'ہونے' کا یقین محکم اب بھی ہمراہ ہو۔۔۔ پورے جہاں معنی کے ساتھ۔ کیسے لکھوں کہ وہ سدا کے لیے میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ جب سجدے جبیں پر مچل رہے ہوں اور قبلہ نظر نہ آئے تو اس کیفیت کو کیسے بیان کروں۔ جب بچہ میلے کی بھیڑ میں کھو جائے تو اسے اردگرد کی رنگینیاں نظر نہیں آتیں۔ اس کے سامنے صرف ایک لگن ہوتی ہے۔۔۔ کھوئے ہوؤں کو پا لینے کی لگن۔۔۔ میرے نزدیک یہی ناسٹل جیا ہے۔

منزّہ سلیم

ooo

گوٹے رنگے دِن

سنہرے دور کی اصطلاح یونانی دیومالا سے آئی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے چار پانچ مراحل میں پہلے درجے پر آتی ہے۔ اس کے بعد روپہلی، کانسی، فولادی اور پھر حال۔۔۔ وہ بھی جو زوال کی سمت رواں ہے۔

سنہرا دور، وہ دور ہے جس میں امن، توازن، استحکام اور خوشحالی ہے۔ ہندو دیومالا میں بھی اسی طرح درجہ وار یوگ یعنی ادوار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ہی مشرقِ وسطیٰ اور قدیم دُنیا میں بھی۔

سنہری کے بعد، روپہلا جو سنہری کی نسبت کم لیکن قدرے بہتر دور ہے۔ کانسی اور فولادی دور وہ ہے جہاں انسان کو دُنیا کی سختی، لالچ اور بداخلاقی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر۔۔۔ میرے آخری حیات بھائی۔۔۔ میرے سنہری دور کی نشانی تھے۔ زندگی کی تمازتوں میں ان کا پیار، چھاؤں سا تھا۔ زمانے کی کڑی دھوپ نے بہتیرا اثر پایا لیکن میرے میکے کے گھنے نخلستان کا آخری چھتنار پیڑ ابھی باقی تھا جس کی خنک ٹھنڈک میں ستا لیتی تو پھر آگے بڑھنے کے قابل ہو جاتی۔

غم کی حدت میں ان کا طرزِ تپاک
سرد جھونکوں، گھنی گھٹاؤں سا تھا

کھیڈن دے دن چار

بچپن میں میرے پاس ایک کتاب تھی' پچاس چیزیں جو ایک لڑکی بنا سکتی ہے' اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً کارڈ، Origami, Stuffed Toys اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں، جیسے مشروبات اور سینڈوچ وغیرہ بنانے کی تراکیب شامل تھیں۔ اس میں چاکلیٹ بنانے کا طریقہ بھی درج تھا۔ ڈاکٹر بھائی چھٹیوں میں گھر آتے تو میں اور وہ مل کر چاکلیٹ بناتے جو مجھے اور ڈاکٹر بھائی دونوں کو بہت پسند تھے۔ آپا جی نہ تو کھاتیں اور نہ کچھ کہتیں۔ چھوٹے بھائی کہتے۔

"آپ لوگ تو فیشن کے طور پر کھاتے ہیں۔ ورنہ ہے کیا یہ؟ Brooklax"

(اس زمانے میں قبض کے لیے ایک دوا ہوتی تھی)

بڑے بھائی جان ہمیں چاکلیٹ کھاتے دیکھ کر کہتے،

"توں وی پاگل ایں تے اووی"

میں اور ڈاکٹر بھائی، بہت ہلکی آنچ پر مکھن کو پگھلاتے۔ اس میں پسی ہوئی چینی اور Cadbury's کا وہ Drinking Chocolate ملاتے جو بھائی دودھ میں ملا کر پیتے تھے پھر اسے خوب پھینٹتے، جب وہ پھول جاتا تو اسے پلیٹ میں جما کر ٹکڑیاں کاٹ لیتے اور

مزے لے لے کر کھاتے۔ میرے بچپن میں چاکلیٹ عام طور پر ملتے ہی نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو پہنچ سے باہر۔

جب ڈاکٹر بھائی مسقط گئے تو کسی آنے جانے والے کے ہاتھ، بہت عمدہ قسم کے چاکلیٹ بھیجتے۔ Cadbury اور Black Magic کی ٹرے۔۔۔ میرے مزے ہو جاتے کیونکہ اور کوئی تو کھاتا نہیں تھا۔

بھائی کے رخصت ہونے تک، ہمارے آپس کے تعلقات ایسے ہی تھے۔ جیسا کہ Charlette Gray کہتا ہے۔

"Me and my Sister may look old and wise to the out side world, but to each other, we are still in junior high."

میرے تینوں بھائیوں کا دوستانہ انداز میرے دل و روح کے لیے ایک دلنشیں تحفے کی مانند تھا۔۔۔ جیسے سنہری ریشم کی ڈور۔۔۔

OOO

ے میری چھّی دے وچوں پونی مکّی
میری چکّی چوں مک گیا گالا (شاہ حسین)

میرے ایف۔ایس۔سی کے پیپر ہو رہے تھے۔آخری پیپر سے ایک روز پہلے میں شدید بخار میں مبتلا ہو گئی۔بخار کی شدت، چکر اور قے نے میری حالت خراب کر دی۔مجھے نہیں لگتا تھا کہ میں پرچہ حل کر پاؤں گی لیکن بھائی جان نے حوصلہ دلایا اور خود ساتھ گئے اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین کارخانہ بازار کے گیٹ کے پاس بوڑھے برگد کے نیچے چپس کے بنے ہوئے چوکیدار کے بنچ پر، شدید گرمی میں تین گھنٹے بیٹھے رہے، اپنے میڈیکل بیگ کے ساتھ اور میں صرف اس سہارے پر کہ بھائی باہر موجود ہیں جیسے تیسے پرچہ حل کر پائی۔

لیکن۔۔۔آج زندگی کے کڑے امتحان میں میرا ساتھ چھوڑ دیا۔۔۔کیوں؟

میں کدھر دیکھوں؟

ع ویر میرا مینوں دسدا نا ہیں تے میں او ہلے بہہ بہہ روواں

OOO

پیار یا سانوں مٹھڑا نہ لگدا شور (بلّھے شاہ)

ہم پانچ بہن بھائی تھے۔دو بہنیں اور تین بھائی، امی، ابا جی نے ہماری پرورش اس طرح سے کی کہ بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔نہ تعلیم دلاتے وقت، نہ برتاؤ میں، نہ اعتماد میں اور نہ ہی مصروفیات میں۔ہم پانچوں بہن بھائی کو ایجوکیشن میں پڑھے۔ہم لوگ اکٹھے بیٹھتے، گپ شپ لگاتے، کتابیں پڑھتے اور بے تکلفی سے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں سے ملتے۔میں تو سکول کے زمانے میں سائیکل اور سکوٹر اور بعد میں کار چلاتی رہی۔اس لیے مجھے اپنا لڑکی ہونا کبھی مصیبت نہیں لگا۔جیسے کہ عام طور پر لڑکیاں خواہش کرتی ہیں کہ کاش ہم لڑکا ہوتیں۔وجہ وہ تخصیص ہے جو ان کے گھر والے روا رکھتے ہیں۔

موسیقی کا شوق ہم سبھی کو تھا۔بڑے بھائی جان تو وائلن اور بانسری بجاتے اور ڈاکٹر بھائی ماؤتھ آرگن۔میں اور چھوٹے بھائی صرف ریڈیو سننے پر اکتفا کرتے۔جب ڈاکٹر بھائی مسقط گئے تو وہاں سے بہت اچھا Grundig کمپنی کا ریڈیو گرام لے کر آئے۔میں اور بڑے بھائی اس پر غزلوں کے ریکارڈ بجاتے اختری بائی، کے ایل سہگل، مکیش، اقبال بانو اور ایسے ہی بڑے گانے والے۔

مجھے اور ڈاکٹر بھائی کو انگلش موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ سمفنی، جاز۔۔۔ ایلوس پریسلے، ارل گرانٹ، نینا فریڈرک اور فرینک سناٹرا کے ریکارڈ بجاتے اور بجاتے چلے جاتے۔ LP ختم ہوتا تو میں ریڈیوگرام کی سوئی اُٹھا کر پھر سے شروع پر رکھ دیتی اور ساتھ ساتھ پڑھتی رہتی۔

کبھی کبھار میرے ابا جی کہتے کہ یہ کیسی پڑھائی ہے کہ ساتھ ساتھ میوزک چل رہا ہے لیکن میرے رزلٹ سے چونکہ وہ ہمیشہ مطمئن رہے اس لیے منع نہ کرتے۔

ڈاکٹر بھائی کی وفات کے بعد، میں اپنی نواسیوں سے بھائی کے بارے میں باتیں کررہی تھی تو انگلش گانوں کا سن کر انہیں بھی تجسس ہوا (وہ دونوں بھی انگلش موسیقی کی رسیا ہیں اور Miley Cyrus, Selena Gomez, Justin Bieber اور Lady Gaga کے گانے سنتی ہیں۔) انھوں نے میرے بتائے ہوئے گانے انٹرنیٹ پر تلاش کرکے سنے اور بہت Enjoy کیے لیکن مجھے تو ان میں سے دبی دبی آہوں اور سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

ع تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

ooo

نج جننیندیئے بھولیئے مائے (شاہ حسین)

بھائی جان کے بال بالکل سیدھے تھے۔ ان میں کوئی خم نہیں تھا۔ وہ جب ماتھے پر جھک آتے تو بھائی انھیں ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے۔ یہ بے اختیار انداز تھا، بغیر کسی بناوٹ کے، لیکن اِتنا اچھا لگتا کہ۔۔۔ جب کبھی وہ امّی کے پاس بیٹھے ہوتے اور بال ماتھے پر آجاتے تو امّی اپنے ہاتھ سے بال پرے کرتیں اور بہت پیار بھرے لہجے میں کہتیں:

''اے بڑے نافرمان بال نیں''

ooo

چھیتی بوڑھیں وے طبیبا

میرے میکے گھر میں، روزانہ رات کے کھانے کے بعد اور چھٹی کے روز ناشتے اور کھانے کی میز پر بیٹھ کر سب گھر والے گپ شپ لگاتے۔ جس میں گھریلو امور، سیاست، کتابوں اور روزمرہ تجربات پر بات ہوتی۔ ہنسی مذاق چلتا، قہقہے گونجتے ٹی وی کی ایجاد کے بعد لوگ اکثر اس مسئلہ پر بات کرتے کہ اب گھر کے افراد کو ایک دوسرے کو دینے کے لیے وقت نہیں ہے، لیکن ہمارے گھرانے میں پھر بھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ جو بات ہمیں ایک دوسرے کی دوسراہٹ میں محسوس ہوتی تھی اس کا کوئی نعم البدل آج تک ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔

ایک روز ڈاکٹر بھائی بتانے لگے۔

''آج میں کلینک کے مردانہ حصہ میں مریض دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا گھبرایا ہوا اندر آیا اور کہنے لگا کہ میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ آپ برائے مہربانی پہلے انہیں دیکھ لیں۔ میں جلدی سے خواتین کے کمرے میں گیا تو ایک بہت موٹی، ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی ہانپ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

''جی بتائیے''

''پتر کی دساں۔۔۔ بڑے دناں دی تیرے کول آونا چاہندی ساں پر آ نہیں سکی تے ایہہ حال ہو گیا اے۔''

''جی۔۔۔ کیہ محسوس کردے او''

''محسوس گھنّا (خاک) کرنا اے۔ تیرے سامنے ای اے۔ بس کھادا پیتا نہیں لگدا۔''

ooo

ع علموں بس کریں او یار (بلھے شاہ)

ایک روز میں بھائی جان کو بتانے لگی۔

''بھائی جان آج میں بازار گئی، مجھے ایک دوپٹہ خریدنا تھا، لیکن دکاندار بہت زیادہ قیمت بتا رہا تھا۔ یہ لوگ تو منافع کی شرح کا کچھ خیال نہیں رکھتے۔ میں نے قیمت کم کرنے کو کہا، تو کہنے لگا۔

''آپ تو پڑھی لکھی ہیں، آپ تو میری بات سمجھیں نا!''

اور پھر تھوڑی سی تکرار کے بعد، یقین مانیں، وہی دوپٹہ تقریباً آدھی قیمت میں دے دیا۔

بھائی جان کہنے لگے:

''تمہیں تو اسے دوگنا قیمت ادا کرنا چاہیے تھی۔''

''وہ کیوں؟''

''بہت بھلا آدمی ہوگا، جسے تم 'پڑھی لکھی' تو لگیں۔ اب بے شک کتابیں شتابیں پڑھنا چھوڑ دو۔''

OOO

''ہور چوپو''

میں کالج جاتی تو ٹی بریک میں سب مجھ سے لطیفہ آف دی ڈے اور شعر آف دی ڈے کی فرمائش کرتے۔ لطیفے سننا اور سنانا میرے میکے گھر میں سبھی کا شوق تھا۔ ڈاکٹر بھائی اور میں تو اس کے بہت ہی رسیا تھے۔

ایک روز میں نے ضیا جالندھری کا ایک شعر سنایا جو مجھے بہت پسند ہے۔

ے میں کہاں پہنچا کہ ہر بت جسے پوجا اب تک
ہے شکستہ سرِ خاک اور میں شکستہ تر ہوں

میری ایک کولیگ جو اسلامیات پڑھاتی ہیں، بھی اتفاق سے ادھر ہی بیٹھی تھیں۔ ویسے وہ ہمارے میس میں شامل نہیں تھیں۔ انہوں نے شعر بغور سنا، بہت تعریف کی اور پھر اس کی 'تشریح' کرتے ہوئے حضرت ابراہیم والا واقعہ سنایا کہ کس طرح وہ خانہ کعبہ کے بت گرا دیا کرتے تھے اور لوگوں کے استفسار پر انہوں نے کہا تھا کہ انہی بتوں سے پوچھو کہ ان کی یہ حالت کون بناتا ہے؟

اس کے بیان بالتفصیل کے بعد انہوں نے یقینِ کامل کے ساتھ کہا:

''بس مس جی، بت تو پھر شکستہ ہی ہوتے ہیں نا!''

باقی سب لوگ خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ ایسی بات پر ہنس کر اسلام کے دائرہ (جو کچھ لوگوں نے نہ جانے کہاں بنا رکھا ہے؟) سے خارج تو نہیں ہونا تھا نا!

میں نے بھائی جان کو سب بتایا تو دل کھول کر ہنسے اور کہنے لگے:

''ہور چوپو''

ooo

چار چوفیرے، درد ھنیرے، ہنجوڈیرے ڈیرے

میں اور بھائی جان جب بھی اکٹھے بیٹھتے، تو کسی نہ کسی معاشرتی مسئلہ پر بات شروع ہو جاتی۔ وہ انتہائی زیرک اور باریک بین تھے۔ ان سے بات کرنے کے بعد مجھے احساس ہوتا کہ جس انداز سے اور جس پہلو سے وہ اس معاملے کو دیکھتے ہیں میں نے تو کبھی اس طرح سے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ ان سے گفتگو، پر مغز ہوتی جو وہ نہایت لطیف انداز میں کرتے۔ کبھی خطیبانہ جوش و جذبہ میں نے ان میں نہیں پایا۔۔۔ بس صرف سکون اور ٹھہراؤ۔۔۔ مدھم سی مسکراہٹ اور شگفتگی کے ساتھ، ماتھے پر بل ڈالے بغیر۔

ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے جو گھٹن پائی جاتی ہے ایک روز اس پر بات ہونے لگی کہ اخباریں اور ٹی وی کے خبرنامے، عورت پر جسمانی تشدد اور غیرت کے نام پر قتل سے بھرے پڑے ہیں۔ آخر کیوں؟ تو کہنے لگے۔

''یہ ہمارے معاشرے کے دوہرے معیار ہیں وہی بھائی، جو دوستوں میں بیٹھ کر اپنے متعدد معاشقوں کا ذکر بہت فخر سے کرتا ہے۔ بہن کی شادی کرتے ہوئے اس کی رضامندی جاننا بھی گوارا نہیں کرتا اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنی چار شادیوں میں اسی مذہب کو اپنی ڈھال بنائے رکھتا ہے۔ جس کے مطابق شادی کے وقت لڑکی کی رضامندی جاننا انتہائی مستحسن خیال کیا جاتا ہے اور اکثر اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر بہن، اپنے والد کی

جائیداد میں سے اپنا حصہ مانگے تو اس کو قتل کر کے غیرت کا لیبل لگا دیتے ہیں اور آلۂ قتل کے ساتھ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں تا کہ فوری اشتعال یا غیرت کے نام پر ان سے رعایت برتی جائے۔۔۔ پھر انہوں نے اپنی ایک پنجابی نظم سنائی (وہ پنجابی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے)

اک کُڑی پنجابن

سن او ربا میریا
میں ڈبدی ڈبدی جاں
ہُنوں ویر دے ربا میریا
کرے سر میرے تے چھاں

اوہ گھبرو ہووے پنجاب دا
اوہدے ہتھ ہووے تلوار
میں ویاہ کراں جے جی لگدا
کرے ٹوٹے میرے چار

ہووے دھون نیویں اوہدے ویریاں
اوہدے مچھاں وٹن یار
مینوں وڈھ کے ٹھانے ٹرجاوے
جا دتے ٹھانے دار نوں

میں وڈھ لئی بھین اج اپنی
نالے وڈھیا اس دا یار
اوس میتھوں پچھیاں بنا ای
کھلوا لئی اپنی نتھ

مینوں پھاہے ناں لاناں ویریو
بس لایو ترے سو ست (۳۰۷)

OOO

لنگھ آؤ

ڈاکٹر بھائی، مجھ سے بارہ سال بڑے تھے۔ میرے لیے بہت محترم تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ، بے تکلفی اور دوستی بھی بہت تھی۔ بہت سے بہن بھائی جن میں ایسے تعلقات نہیں ہوتے اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم دونوں لطیفہ گوئی کے شوقین تھے۔ دیگر لطائف کے علاوہ، وہ مجھے پروفیسروں کے لطائف سناتے اور میں انہیں ڈاکٹروں کے۔

ایک روز میں نے چہک کر کہا: ''بھائی جان، لطیفہ سنیے۔

ایک شخص کا گلا خراب تھا، وہ ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے ان کے گھر گیا اور بیٹھی بیٹھی آواز میں کہنے لگا: ''ڈاکٹر صاحب، گھر پر ہیں؟''

ڈاکٹر کی بیوی نے، جواباً راز دانہ انداز میں کہا: ''نہیں ہیں۔۔۔ چلے آؤ۔''

بھائی جان بہت ہنسے۔ ایسی فضول باتوں پر (جو میں اکثر و بیشتر کرتی ہی رہتی تھی) وہ بڑے پیار سے کہتے۔

''باندری''

اور یہ لفظ اتنا محبت بھرا ہوتا کہ میرا دل چاہتا 'باندری' ہی بنی رہوں۔

OOO

انّھے اگّے رونا، اکھیاں دا اُجاڑا

میرے ابا جی، پیروں فقیروں، درگاہوں اور گنڈے تعویزوں کے قطعی طور پر قائل نہیں تھے۔ میں نے اپنی امّی کے منہ سے بھی کبھی ایسا ذکر نہیں سنا۔ یہی بات ہم بہن بھائیوں میں بھی ہے۔ ہماری معاشرے میں نفسیاتی امراض کو جنّوں اور پریوں کے کھاتے میں ڈال کر نام نہاد پیروں اور عاملوں سے مدد چاہی جاتی ہے۔ وہ موٹی موٹی رقمیں اور زیورات ہتھیانے کے علاوہ خاندانوں میں دُشمنیاں پیدا کرنے کے بھی ماہر ہیں۔ گرم سلاخوں سے داغنا، جسمانی تکالیف پہنچانا اور بعض اوقات اِتنا تشدد کہ جنّوں کے شکار کا اپنی جان سے گزر جانا معمولی بات ہے۔

بھائی جان کہتے تھے کہ میں اپنے مریضوں کو یہ سب سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں لیکن صدیوں سے چلی آ رہی یہ بات اتنی جلد سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ اس لیے اب میں اپنے مریضوں سے کہتا ہوں کہ گنڈا تعویز جو دِل چاہے کروائیں لیکن ساتھ ساتھ براہِ کرم میری بتائی ہوئی دوا ضرور کھائیں اور جب ٹھیک ہو جائیں تو پیر صاحب کی درگاہ پر کالا بکرا چڑھا آئیں۔

ooo

ع روندا مول نہ سوندا ای (شاہ حسین)

بھائی بتاتے ہیں۔

"2-D سے اتر کر مریض میرے چھوٹے سے کلینک میں آتا ہے۔ گردن موڑ کر دیکھتا ہے کہ پرانا A.C صحیح طور پر کام نہیں کر رہا۔ سفید کلف سے کڑکڑاتا سوٹ جس میں سونے کے کف لنکس لگے ہیں کا کالر کھینچ کر پیچھے کرتا ہے۔ ہاتھ میں بلیک بیری ہے۔ ماتھے پر بل اور پریشانی کے آثار۔ میں متوجہ ہوتا ہوں۔

"جی کہیے، کیسے ہیں؟"

"کہنا کی اے۔ پریشانیوں نے زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ دن بے چینی میں گزرتا ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ فکریں جان کو لگی ہیں۔"

میں ایک سائیکاٹرسٹ ہوں، سنتا زیادہ اور کہتا کم ہوں۔ مریض کہے جا رہا ہے۔

"کوئی ایک مصیبت ہو تو انسان برداشت کر لے۔ یہاں تو ڈھیر لگے پڑے ہیں۔ تین بیٹوں کو تو میں نے الگ الگ فیکٹریاں لگا دی ہیں۔ چوتھے کی ابھی تک نہیں لگا سکا۔ ملک کے حالات ہی بھین۔۔۔ اتنے خراب ہیں۔ دو بیٹیوں کی شادی کر لی ہے۔ انہیں ڈیڑھ ڈیڑھ سو تولے سونا ڈالا ہے۔ باقی چیزوں کو تو چھوڑیں۔۔۔ اب دو کی باقی ہیں، انہیں بھی اتنا ہی دوں گا۔۔۔ یہ میرا 'اصول' ہے۔ حکومت کی ماں۔۔۔ بندہ یہاں کیا کرے؟ کوئی

دوائی لکھ دیں، کم از کم رات کو تو نیند آ جائے۔ ورنہ سکون کی تو۔۔۔"

میں نے کہا:

"جی، دوا میں لکھ دیتا ہوں، لیکن ایک بات بتائیں کبھی شکر بھی کیا ہے؟

جواب ملا:

"کادا؟"

ooo

اَسیں موریوں لنگھ پیا سے (شاہ حسین)

بھائی جان میرے ہاں آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، جس میں دوا کا Sample تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فلاں دوا جو تم کھا رہی ہو، جب ختم ہو جائے تو اُس کی جگہ یہ کھانا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے دوا تبدیل کر دی ہے تو کہنے لگے کہ نہیں یہ وہی دوا ہے۔ دوسری کمپنی کی ہے۔ آئندہ یہی خریدنا۔ قیمت میں کافی فرق ہے۔

پھر انہوں نے وضاحت کی۔

"ایک کمپنی جب کافی عرصہ ریسرچ کرنے اور دوا کی آزمائش کے بعد اسے مارکیٹ میں لاتی ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اس کی قیمت اپنے حساب سے مقرر کرے۔ جو کہ زیادہ اس لیے ہوتی ہے کہ ریسرچ پر اٹھنے والے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پانچ سال تک کوئی دوسری کمپنی وہی Salt استعمال کر کے دوا نہیں بنا سکتی۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد دوسری کمپنیاں بھی اپنے نام سے وہی دوا بناتی ہیں تو اس کی قیمت نسبتاً بہت کم ہوتی ہے۔ اسے me too بھی کہتے ہیں۔"

پھر کہنے لگے۔

”آج اس کمپنی کا ’میڈیکل رپ‘ آیا اور دوا کا تعارف بتانے کے بعد کہنے لگا کہ آپ اسے مریضوں کے لیے لکھیں گے؟ تو میں نے کہا کہ ضرور لکھوں گا، کیونکہ مجھے مہنگی کمپنی کی دوا لکھ کر دنیا کی سیر کا شوق نہیں۔ (سب جانتے ہیں کہ آج کل میڈیسن کمپنیاں، ڈاکٹرز کو اپنی مہنگی ادویات تجویز کرنے کی ترغیب دلانے کے لیے، مختلف ممالک کی سیر کے لیے ٹکٹ اور رہائش کے اخراجات کے علاوہ بہت سی قیمتی اشیا دیتی ہیں) میرے نزدیک، مریض کا صحت یاب ہونا ضروری ہے جو نہ جانے کن مشکلوں سے علاج کروا رہا ہے۔ میرا سیر پر جانا ضروری نہیں ہے۔“

ooo

اچھا بھارا اُچکنا سو کھائیں

بھائی جان کو میں اکثر بتاتی کہ میرے گھٹنوں میں بہت تکلیف ہے۔ وہ مجھے کیلشیم کھانے کا مشورہ دیتے اور چہل قدمی کرنے کو کہتے۔

ایک روز کہنے لگے:

”بیٹا، آج میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں (میں سمجھی شاید اسے کینسر کے ذیلی اثرات سے منسلک کریں گے) گھٹنے اللہ تعالیٰ نے چلنے کے لیے بنائے ہیں ’بار برداری‘ کے لیے نہیں۔ انہیں ’چنگ چی لوڈر‘ مت بناؤ۔ اپنا وزن کم کرو۔“

ooo

ع تیری یاد پوے تے روواں
تیرا ذکر کراں تاں ہساں (فیض)

بھائی جان جب بھی آتے مجھے چہل قدمی کرنے کو کہتے کہ اس سے ڈپریشن بھی کم ہوگا اور وزن بھی، لیکن یہ واحد کام ہے جس میں مَیں نے بھائی کی ایک نہیں سنی۔

یہ میرا فخر نہیں، شرمندگی ہے۔

میں کبھی خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکی۔ الٹا، ان کی بات کے جواب میں عجیب وغریب باتیں کہتی۔

''بھائی، وزن زیادہ ہے نا اس لیے کششِ ثقل ہلنے نہیں دیتی۔''

وہ جل کر کہتے:

''یہ نظریہ کب آیا؟''

کبھی کہتی:

''بھائی، جب میں واک کرتی ہوں تو میرے اندر سے غائبانہ آواز آتی ہے جو حکماً کہتی ہے:

'آرام سے بیٹھ جاؤ'

خیال کیجیے، کہیں مجھے Hallucination تو نہیں ہونے لگیں؟''

اور ایسی ہی فضولیات۔۔۔

ایک روز وہ کہنے لگے:

''تم سیدھا سیدھا انکار کر دیتی ہو، ارادہ تو کرو، شاید کر پاؤ۔''

میں نے جواب میں کہا:

''بھائی جان، ایک شخص تبلیغِ دین کے لیے گیا اور دس روز کے بعد لوٹا۔ تھوڑی دیر کے بعد، اس کے گھر سے، اس کے زور زور سے چلّانے اور اس کی بیوی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ اس کے ہمسائے بھاگتے ہوئے آئے تو دیکھا کہ وہ شخص اپنی بیوی کی بری طرح پٹائی کر رہا ہے۔

لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ اتنا ظلم کیوں کر رہے ہو؟

اُس شخص نے جواب دیا کہ میں اسے داڑھی رکھنے کا کہہ رہا ہوں اور یہ۔۔۔

لوگوں نے کہا:

''وہ داڑھی کیسے رکھ سکتی ہے؟''

اس پر وہ بولا:

''یہ کمبخت بھی یہی کہتی ہے۔ میں کہتا ہوں، نہ رکھے۔۔۔ کم از کم ارادہ تو کرے۔''

ooo

چپ کر کے کریں گزارے نوں
سچ سن کے لوک نہ سہندے نیں
سچ آکھیے تاں گل پیندے نیں (بلھے شاہ)

سوشل سکیورٹی کے جریدہ 'مرھم' کے ایک شمارے میں ڈاکٹر شکیل شمسی نے ادارے کے ڈاکٹروں کا ایک سروے کیا۔ عنوان تھا:

''کیا سوچتے ہو تنہائی میں؟''

جس کا جواب ڈاکٹر بھائی نے یہ دیا۔

''وہ جس پر جہلاء اور علماء کی قدغن نہ ہو''

اس پر ڈاکٹر شکیل شمسی نے تبصرہ کیا۔

''وہ جو آپ کے مریض سوچتے ہیں؟''

ان کا تبصرہ بالکل صحیح تھا۔ یہ دیوانوں ہی کا کام ہے۔ فرزانوں کا نہیں۔ 'بقائمی ہوش وحواس' اپنے آرام کو تج دینا۔ نہ بینک بھرنا، نہ محل ماڑیاں تعمیر کرنا، نہ ادویات کی کمپنیوں کے فراہم کردہ اخراجات پر دنیا کی سیر کرنا، نہ 2-D کی چابیاں لینا۔۔۔ وغیرہ۔ آج کل

ایسے لوگوں کو ذہنی مریض ہی گردانا جاتا ہے۔

لیکن جہلا اور علما کی قدغن کو نظر انداز کر کے وہ لکھتے، تو میں ڈر جاتی۔

''بھائی جان۔ میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ ایسی باتیں سوچ ضرور لیا کریں لیکن خدارا لکھا نہ کریں۔ 'یہ' بہت ظالم لوگ ہیں۔''

''تو کیا ڈر کر اندر بیٹھ جاؤں؟ کچھوے کی طرح گردن چھپا لوں؟ جو سمجھتا نہیں یا سمجھنا نہیں چاہتا۔ اس کا مسئلہ تو الگ ہے۔ ظلم کو دیکھتے ہوئے چپ رہنا بزدلی نہیں، بے ایمانی ہے۔''

وہ بے ایمان نہیں تھے۔

توں خلقِ خدا نال پیار تے کر
ربّ صرف مسیتاں چ نہیں ملدا

ooo

جو رنگ رنگیا، گوڑھا رنگیا (بلھے شاہ)

بھائی جان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ادب، شاعری، فلسفہ، سیاست۔۔۔ اور کیا نہیں۔ سارا وقت کوئی نہ کوئی کتاب ان کے پاس ہوتی۔ بڑی بیٹی کو سکول سے لینے جاتے تو ویسپا سکوٹر میں لگے ریک میں کوئی کتاب ہوتی اور سکول میں چھٹی ہونے کے انتظار میں کتاب پڑھتے رہتے۔

اسی طرح، دوسروں کو بھی بہت دھیمے انداز میں مطالعہ کی ترغیب دیتے رہتے۔ کبھی سختی سے نہیں کہا۔ اب ان کے جاننے والوں میں، بہت سے لوگ جو مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس میں دل چسپی انہی کی پیدا کردہ ہے۔

میں آتے جاتے، بھائی جان کے کلینک پر ضرور رُکتی، چاہے دو منٹ کے لیے ہی سہی۔ ایک روز ایسے ہی گئی تو حسبِ معمول مجھے باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ میں لائبریری سے آئی تھی اور چند کتابیں اور میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ کاغذات پچھلی سیٹ پر پڑے تھے۔ دیکھ کر کہنے لگے۔

''لگ رہا ہے نا کسی پڑھے لکھے کی گاڑی ہے۔ اکثر لوگوں کے گھروں میں تو ایک پرزہ بھی پڑھنے کو نہیں ملتا۔''

اسی طرح دھیرے دھیرے پڑھنے لکھنے کا پرچار کرتے رہتے اب وہی رنگ مجھ پر بھی غالب ہے۔

اگرچہ

'چہ نسبت خاک، را بہ عالم پاک والا معاملہ ہے۔'

یہاں، بھائی کی نذر عمر خیام کی ایک رُباعی کر رہی ہوں۔

(انگریزی ترجمہ)

"With them the Seed of Wisdom did I sow,
And with my own hand
labour'd it to grow;
And this was all the Har'vest
that I reaped......
I came like Water, and like Wind I go.

ooo

صلاحِ مفت

ایک روز بھائی جان میرے ہاں آئے ہوئے تھے۔ ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گھنٹی بجی اور ہمارے ایک عزیز تشریف لائے۔ سلام دعا اور خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد انہوں نے بھائی سے کہا کہ اچھا ہی ہوا آپ سے یہاں ملاقات ہو گئی ورنہ اتنی دور آپ کے کلینک پر جانا پڑتا۔ پھر انہوں نے اپنے اہلِ خانہ کے 'چند' افراد کے لیے نسخے لکھوائے اور بعد میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"یہ باہر گاڑی کس کی کھڑی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

"بھائی جان کی۔"

انہوں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب دی۔۔۔؟"

پھر وہ بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔تھوڑی خدا خوفی"

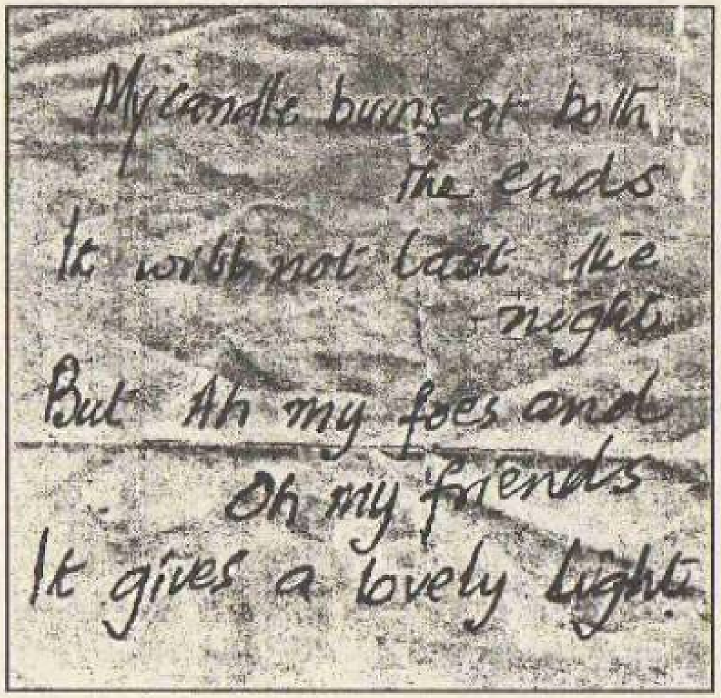
بھائی جان کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھری، وہی مہان مسکراہٹ، جو ان کا ٹریڈ مارک تھی۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو بھائی جان زور سے ہنسے اور کہنے لگے:

"کلینک پر آنے والے سبھی ایسے اصحاب جو فیس دینے میں یقین نہیں رکھتے، مفت مشورہ ضرور دیتے ہیں،

ڈاکٹر صاحب، گڈی تے پچ سواد دی رکھ لو۔"

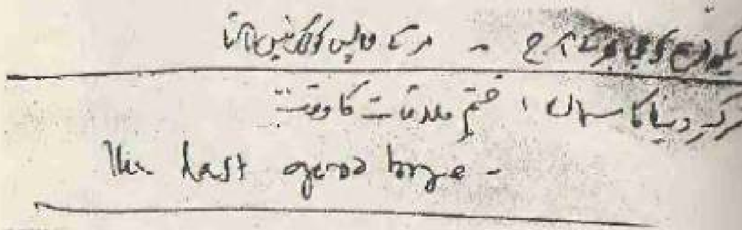
000

ڈاکٹر مقبول اختر کی ڈائری کے دو صفحات


My candle burns at both
the ends
It will not last the
night
But Ah my foes and
Oh my friends
It gives a lovely light

ع کدھرے نہ پیندیاں دساں، وے پردیسیا تیریاں (فیض)

بھائی کی ڈائری میں لکھے ہوئے چند الفاظ

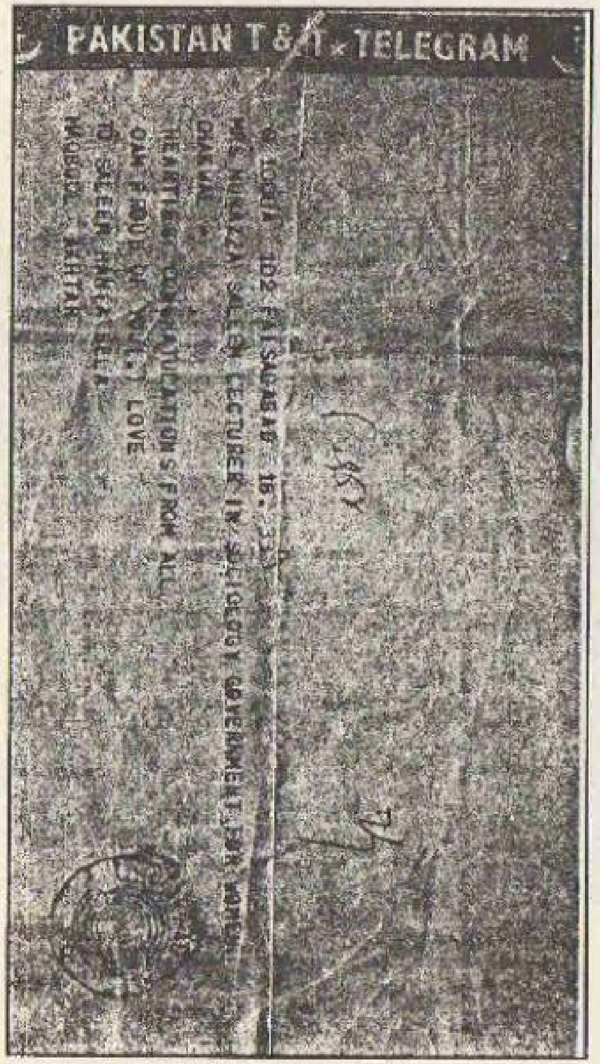

[illegible] ۔ مرکے واپس کوئی نہیں آتا
ترکِ دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
The last good bye -

ooo

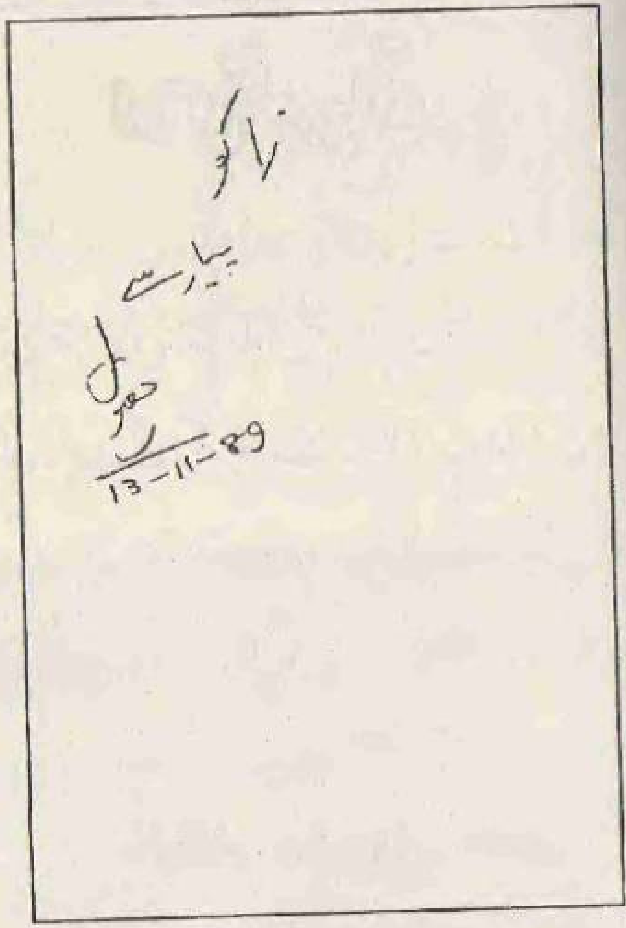
میری سالگرہ پر بھیجے گئے کارڈ کا عکس



۱۷ جنوری ۱۹۸۴ء کو میں نے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا تو بھائی نے ٹیلی گرام کے ذریعے مبارکباد کا پیغام بھیجا۔



بھائی جان ہمیشہ کتاب کا تحفہ دیتے۔ ۱۹۸۹ء میں انہوں نے اپنی سالگرہ پر
مجھے کتاب کا تحفہ دیا۔



ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر آنے والے مریضوں کو بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا ڈپریشن کی علامات پر مشتمل ورق۔ اس میں بھی ادبی رنگ جھلک رہا ہے۔

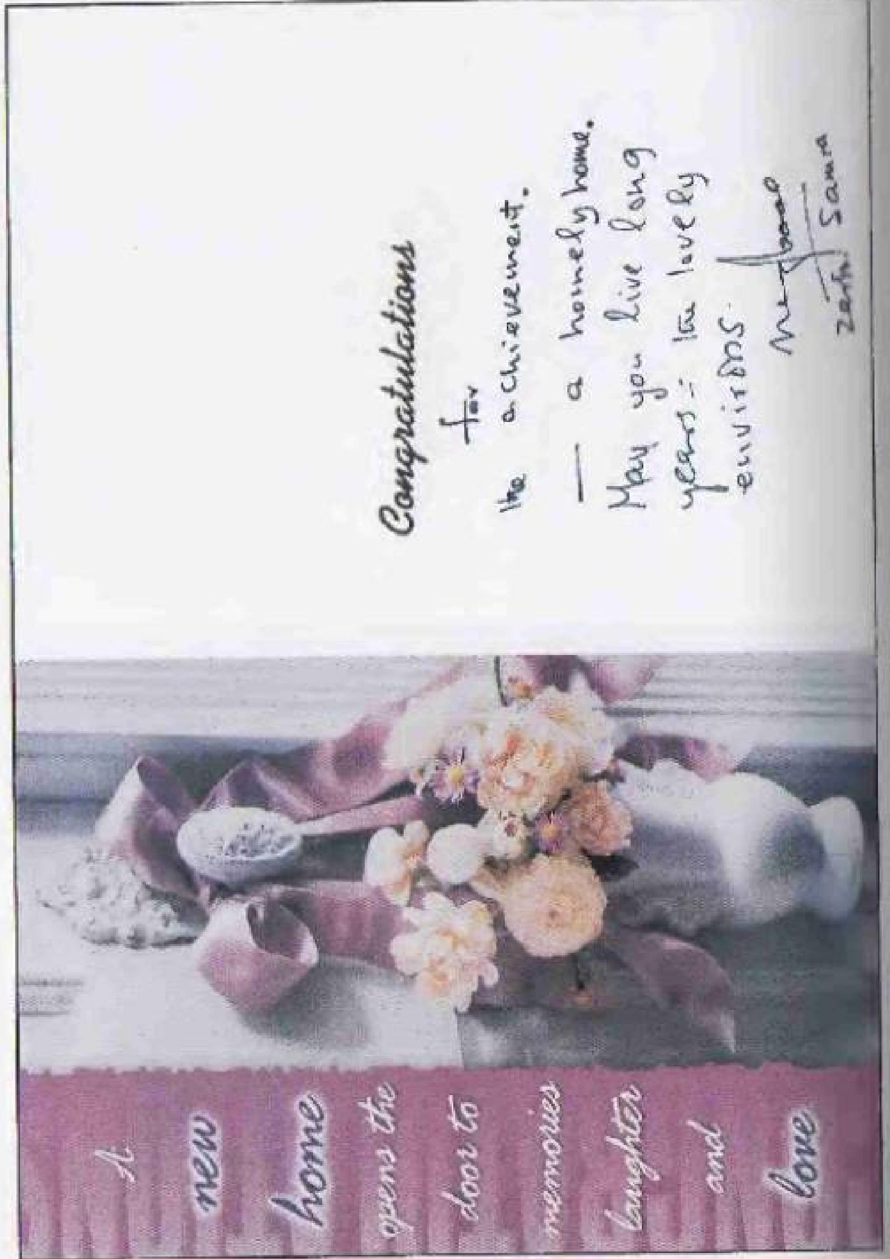
اداسی ٹھہر جاتی ہے

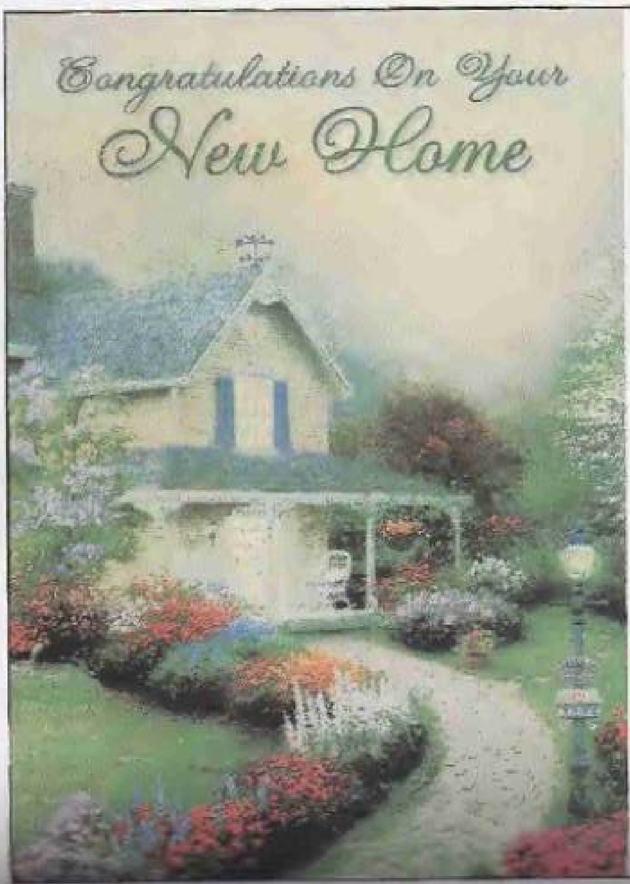
مسلسل اداسی' مایوسی' عدم دلچسپی' بات بے بات رونا'
نیند ختم' خوشی ختم' سکون ختم' بھوک ختم' خواہش ختم'
نہ گھر اچھا لگے نہ گھر والے نہ اپنا آپ' نہ لباس کا شوق
نہ میک اپ کا نہ شیو کا' موت کی خواہش' یہ ڈپریشن کی
بیماری کی علامات ہیں۔ یہ بیماری قابل علاج ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر

ایم۔بی۔ایس ایم۔سی۔پی۔ایس (سائیکاٹری)
(سائیکاٹرسٹ)

میرے میاں نے ۲۰۰۴ء میں اپنا گھر بنایا تو House warming کی تقریب پر تحفے کے ساتھ دیے جانے والے کارڈز کے عکس۔





How hope you'll add some
special touches
you've been dreaming of
To make the new place
you call home
a place you'll really love!

May it give you all
the love & pleasures you
got from your
Parental home.

ے جی کردا اے روئی جاواں، روئی جاواں
نین غماں دے چھوئی جاواں، روئی جاواں

چھوٹے بھائی اور اباجی کی وفات کے بعد بڑے بھائی جان بھی رخصت ہوئے۔ ان کی وفات کے بارے میں مَیں نے اپنی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' میں 'تنگ دستی' کے عنوان سے لکھا۔

۱۶ستمبر۱۹۸۴ بڑے بھائی جان کی وفات کا دن۔۔۔ مجھے ادھورا کر گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے Jig Saw Puzzle میں، میری تصویر کا ایک ایسا ٹکڑا گم ہوگیا ہے، جس سے مَیں، مَیں نہیں رہی۔ ہمہ وقت نامکمل ہونے کا احساس میری شخصیت میں در آیا ہے۔ ہر دن کا آغاز اور ہر رات کی انتہا۔۔۔ ہر کام میں۔۔۔ ہر بات میں۔۔۔ ہر سوچ میں۔۔۔ ہر راہ میں۔۔۔ احساسِ محرومی کا خلا۔ وہ گنجِ گراں مایا کھو گیا تو تنگ دستی نے ڈیرے ڈال دیے۔

ے دکھن میرے
نیناں دے کوئے
وچ ہڑ ہنجواں دا آیا (شوکمار بٹالوی)

بڑے بھائی جان کی وفات کے بعد، ڈاکٹر بھائی کا میرے نام خط بھی انہی جذبات کا حامل ہے۔

ooo

Dr. Maqbool Akhtar
M.B.B.S.

34-R GULBERG
FAISALABAD
Dated 30-9-84

زارا بیٹا۔

کل سلیم سے فون پر بات ہوئی ہے
لوگوں کے بخیریت پہنچ جانے کا پتا چلا۔ آپ یا بہت پریشان تھے (کوئی
کوئی خواب وغیرہ!)

یہاں پر بھی خیریت ہے اگرچہ لفظ خیریت کا
یہ استعمال اچھا نہیں مگر متبادل لفظ اگر کوئی ہے تو ذہن میں نہیں۔
طوفان گزر جانے کے بعد والا سکون ہے، جذبات تھک چکے اب
تو ہر کسی کا اپنا اپنا ویرانۂ دل ہے کہ زندگی بھر کا روگ ہے، وقت
کا مرہم اس میں سے جو بھی کم کر دے، کسی کے بس کی بات نہیں۔

مجھے احساس ہے کہ میں کچھ "حوصلہ دینے والا" خط
نہیں لکھ رہا ہوں۔ مگر آج اس وقت اصل بات اندر کے طوفان کو
باہر نکالنا ہی ہے۔ اگرچہ دل کی دنیا پہلی بار نہیں اجڑی مگر بھائی رشتہ کے
چلے جانے سے جس طرح زندگی میں ویرانی آئی ہے، اس کا بیان ممکن نہیں۔
زندگی کے تقاضے اپنی اہمیت جتاتے رہتے ہیں اور ان کو سنبھالنا ہی ہوگا اگر
ممکن ہوا تو (بقول حسن!) — بہرحال اس کا اتنا فائدہ ہے کہ تم غمگسار

اندر کے غم کو کچھ Balance کر دیتا ہے اور ہم غمگسار تو غم کو بانٹتے ہیں —

اس وقت تو یہی معلوم ہو رہا ہے کہ میرا تمہارا رشتہ اشتراک غم ہی کا
بہر حال صبح سب سے کام شروع کرتے ہیں۔ [illegible] کرنے کی کوشش
کرتا رہا ہوں۔ باقی وقت کے متعلق فیصلے بعد ہی ہو سکتے ہیں۔ اس وقت
تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں شہر چھوڑ رہا ہوں نا ممکن، نامناسب اور نامعقول نظر آتا ہے۔

امید ہے مل جل کر کوئی اچھی صورت نکل آئے گی۔ ذرا وقت گزر جائے تو کچھ
ضرورت ہے کچھ کرنا بہتر ہے۔ اللہ فضل کرے گا

بچے بانا ممکن ہے سکول جا رہے ہیں، دعا کی بات بھی
دکھ ہے آنکھوں سے جھوٹی کلاس میں [illegible] بالآخر اپنی جگہ دس
میں [illegible] اور [illegible] میں لوٹ بھی ہیں
سبھی کو پیار

ابو

شوکت کو بہت دعا کہ جیسا بھی اور جب بھی
ہماری ایڈمنسٹریشن [illegible] منتقل [illegible] ہے، جس
نسبت سے [illegible] تحریر [illegible]
کر لی ہے۔

والسلام
مقبول اختر

لپ لپ جاگ لہو دی لائیے
مڑ کے اُجڑیا شہر وسائیے

والد صاحب، چھوٹے بھائی اور پھر بڑے بھائی کی وفات کے بعد مجھے لکھے گئے خط کا عکس۔

Dr. Maqbool Akhtar
M.B.B.S.

246-B GULBERG
FAISALABAD

Dated [illegible]

[illegible] بیٹا

امید ہے تم [illegible] بخیریت وقت پر پہنچ گئے [illegible]

[illegible] سلیم اور [illegible]

[illegible]

آج [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] excited [illegible] TASK [illegible]

[illegible] excitement [illegible]

[illegible] بلکہ امید واثق —

[illegible]

[illegible]

[illegible]

والسلام

[illegible]

[illegible]

ع ماواں دِھیاں ملن لگیاں

آج سے 35 سال پہلے جب میری شادی ہوئی تو میرے میاں کی پوسٹنگ دُوردراز علاقوں میں ہوتی رہی۔۔۔ کراچی کوئٹہ۔

تب مواصلات کا نظام ایسا ہی تھا۔ موبائل تو کیا فون کی سہولت بھی عام نہیں تھی۔ نہ میرے میکے میں فون تھا، نہ میرے گھر میں۔ میں بہت باقاعدگی سے لمبے لمبے خط، سب کو نام بنام لکھتی اور اسی طرح جواب میں اباجی اور بہن بھائیوں کے خط مجھے ملتے اور جب بھی میکے میں چندروز گزار کر واپس جاتی تو بہت آزردہ ہوتی لیکن امی کے سامنے کبھی دِل برا نہ کرتی۔ امی بھی بہت حوصلے سے رُخصت کرتیں (اب چھوٹی بھابھی بتاتی ہیں کہ میرے جانے کے بعد بہت روتیں۔)

لیکن جب اباجی اور بھائیوں کی وفات کے بعد ایسا ہوتا کہ میں میکے آ کر واپس جاتی تو ضبط نہ کر سکتی۔ امی بھی بہت روتیں۔ ایک بار ایسے ہی میں امّی کے گلے سے لگی رو رہی تھی تو ڈاکٹر بھائی جو پاس ہی کھڑے تھے کہنے لگے۔

"کیوں ساڈے چبارے دیاں کندھاں ہلان لگی ایں۔"

لوک گیت کچھ یوں ہے:

ماواں دھیاں ملن لگیاں
چارے کندھاں نے چبارے دیاں ہلیاں

ع دکھاں دی روٹی، سولاں دا سالن، آہاں دا بالن بال نی (شاہ حسین)

چھ مارچ ۱۹۸۵ء کو میری امی بھی، دو بیٹوں، شوہر اور بھائی (میجر اسحٰق محمد) کی وفات کے صدمات کو نہ جانے کیسے برداشت کر کے چل بسیں۔

میں ان دنوں چکوال میں تھی۔ ڈاکٹر بھائی نے نو اپریل ۱۹۸۵ء کو یعنی امی کی وفات کے ایک ماہ بعد مجھے جو خط لکھا اس کا عکس آپ بھی پڑھیے۔

ooo

Dr. Maqbool Akhtar
M.B.B.S.

244-B GULBERG
FAISALABAD
Dated 9-4-1985

زاہدہ بہنا۔ السلام علیکم

رات یہاں بہت بارش ہوئی۔ کل رات
بھی ہوئی تھی۔ اور آج صبح سے تو چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ کوئی
دس بجے کے قریب رکا ہے تو خیال آیا ہوں آپ کا منظوم
تحریر پڑھ کر خوشی ہوئی۔

اکیلے تو آپ سبھی ہیں اور یہ اکیلا پن ہے
دوسرے لوگوں کی تسلی بانٹ نہیں سکتا۔ یہ غم تو [illegible] کی طرح
اکیلے اکیلے اس عمل سے گزرنا پڑے گا اور دوسرا کوئی بات [illegible] یا ہمدردی کی
بات ہے لیکن اس عمل کو آسان نہیں کر سکتا سوائے اس بات کے کہ
یہ احساس کہ کوئی ہمارے اس دکھ کو سمجھتا ہے، اس دکھ میں شریک ہے
بانٹنے والا ہے۔ اس عمل کو برداشت کے قابل بنا دیتا ہے۔
A death in the family ناول کی کتاب میں [illegible] Psychiatry
کا حوالہ دیا ہوا ہے۔ [illegible] ایک [illegible] ہے
[illegible] سمجھتا ہے کہ بہت سے دن تو نہیں [illegible]
(loss) کا اندازہ [illegible] اور پھر اس کا [illegible] ....
[illegible]

"It will be so much worse you will think it is more than you can bear. Or any other human being. And worse than that, you will have to go through it alone, because there isn't a thing on earth any of us can do to help, beyond blind animal sympathy."

What a grief-stricken person needs is "common-sense" love of life, and what we are accustomed to call ego strength, that is, endurance, courage, and the ability to face up to things.

یعنی تعزیت ———

Transform grief; grief ran and overtook me.

صرف وقت مرہم ہے۔ جو [illegible] کا تجربہ [illegible] دو چار ماہ
چھ ماہ بعد [illegible] زندگی [illegible] اس وقت تو [illegible]
جیسے [illegible] پر [illegible]

والسلام

[illegible signature]

محبتاں سچیاں نیں

امّی، ابا جی اور بھائیوں کی وفات کے بعد دکھ، پریشانیوں، مسائل اور غمِ روزگار نے ڈاکٹر بھائی کو گھن چکر بنا دیا۔ ابا جی کی پنشن بند، بھائیوں کی آمدنی بند لیکن زندہ لوگوں کی ضروریات وہیں کی وہیں۔ وہ سگریٹ تو پیتے ہی تھے لیکن اب اس میں شدت آ گئی کہ اس میں عارضی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ میں نے ان سے اسے کم کرنے کو کہا تو کہنے لگے۔

"یہ Lesser evil ہے"

ان کے عزیز ترین دوست، ڈاکٹر احسان الحق نے انہیں اپنا مکمل چیک اپ کروانے کے لیے کہا، کیونکہ گھرانے کی چاروں وفات عارضۂ قلب کی وجہ سے ہوئی تھیں۔ ان کا ETT (Exercise tolerence test) ہوا تو دل کے حالات دگرگوں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا:

"اب آپ اپنی آخری سگریٹ پی لیں اور بس!"

واپس آ کر ڈاکٹر بھائی نے بتایا۔

"میں نے سگریٹ سلگائی اور جرعہ جرعہ کر کے پی۔ پھر بھری ہوئی ڈبیا، کوڑا دان

میں پھینک دی اور ہاتھ جھاڑ لیے۔"

اس کے بعد، انہوں نے واقعتاً ہاتھ جھاڑ لیے اور تا عمر رواں سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

ایک دن باتوں باتوں میں، میں نے کہا:

"آپ نے بہت ہمت سے سگریٹ نوشی ترک کی ہے ورنہ اچھے اچھوں سے یہ کام نہیں ہوتا۔ وہ چھوڑ کر دوبارہ شروع کر لیتے ہیں۔ آپ کا کبھی دل تو نہیں چاہتا؟"

انہوں نے ہنس کر جواب دیا:

"میں نے ایک مریض کو سگریٹ پینے سے منع کیا اور کوئی دو ماہ کے بعد اس سے پوچھا کہ کبھی سگریٹ تو نہیں پی؟ وہ کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب، پیتی تے نہیں، پر دل وچوں ایدی حُب، نہیں جاندی۔"

میں نے بھی ہنس کر بھائی جان سے کہا:

"اچھا تو ساحر لدھیانوی آپ کے لیے ہی کہہ گئے ہیں

؎ محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے"

OOO

ع مِتراں دی مجمانی کارن دِل دا لُہو چھانی دا (شاہ حسین)

اگست ۱۹۸۱ کو مجھ سے بڑے بھائی مسعود صفدر، جن کی عمر اس وقت ۳۵ سال تھی، وفات پا گئے۔ اس کے سات ماہ کے بعد میرے بڑے ماموں میجر اسحاق محمد جو میرے سسر بھی تھے، چل بسے۔ ان کی وفات کے ٹھیک اڑھائی ماہ بعد اباجی بھی رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے دو سال بعد بڑے بھائی جان بھی رات کو سوتے میں داغِ مفارقت دے گئے۔ امی یہ تمام جانکاہ صدمات برداشت کرنے کے بعد، پانچ ماہ بیس دن کے وقفے سے ساتھ چھوڑ گئیں۔

امی کی وفات کے گیارہ ماہ کے بعد ڈاکٹر بھائی کا بائی پاس آپریشن ہوا۔ تب یہ آپریشن بہت عام نہیں تھا۔ صرف آرمڈ فورسز انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی راولپنڈی یا کراچی میں ہوتا تھا۔ ہمارے خاندان میں ہونے والی پے در پے اموات کو دیکھتے ہوئے، سب لوگ بھائی سے کہتے کہ آپ اس کے لیے بیرونِ ملک چلے جائیں، لیکن 'گھریلو معیشت' اس کی متحمل نہیں تھی۔ ہم دونوں بہنوں نے اپنی جائیداد جو اباجی کی طرف سے ہمیں منتقل ہوئی تھی، بیچ دینے کو کہا، لیکن بھائی جان کسی طور بھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے راولپنڈی CMH میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے پوری تسلی کروائی اور بھائی جان کا

آپریشن، ۸ فروری ۱۹۸۶ء کو ہو گیا۔

اب تو یہ بات بتاتے ہوئے دو منٹ لگتے ہیں لیکن تب ہم جس کیفیت میں سے گزر رہے تھے، اس کا سامنا کرنا بہت دل گردے کا کام تھا۔ ڈاکٹر بھائی کی اپنی بچیاں بھی چھوٹی تھیں، پھر چھوٹے بھائی کے بچے، جذباتی طور پر سارا خاندان ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ ان دنوں تو ہم لوگ، دیوار کا بھی سہارا ملتا تو انکار نہ کرتے۔ میرے میاں، ان دنوں راولپنڈی میں تعینات تھے۔ انہوں نے وہاں تمام انتظامات کیے۔ ہمارے عزیزوں، دوستوں اور خیر خواہوں کی ہمدردی نے ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کے قابل بنایا۔ بھائی کے آپریشن سے پہلے ہی سارا فیصل آباد، راولپنڈی اُمڈ آیا۔ دوست کیسے دکھ بانٹ سکتے ہیں یہ ہم ہی ہمیں جانتے ہیں۔

بھائی جان کے لیے چودہ بوتل خون کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اتنے لوگ دستیاب تھے کہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کسے چھوڑا جائے۔

میں اور آپاجی بھی خون دینا چاہتی تھیں لیکن سب نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ مہمانداری کی مصروفیت اتنی ہے کہ ہم لوگ وہی نپٹا لیں تو بہت ہے۔ تب میں نے 'منت' مانی کہ جیسے دوسروں نے ہماری ضرورت پوری کی ہے، اسی طرح میں بھی ہر سال ایک بوتل خون، کسی ضرورت مند کو دیا کروں گی۔ چھ سال تک یہ بخیر و خوبی ہوتا رہا لیکن اس کے بعد میں خود شدید بیمار ہوئی تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن میں اب بھی ان سب لوگوں کے لیے دعا گو ہوں جنہوں نے اس مشکل میں ہمارا ساتھ دیا۔

جب ڈاکٹر بھائی، آپریشن کے لیے فیصل آباد سے راولپنڈی روانہ ہونے لگے تو چھوٹے بھائی کا نو سالہ بیٹا، اس گرم جوشی سے ان کے گلے ملا کہ انہیں ہوا میں اٹھا دیا۔ (تب اس کے والد کی وفات کو چار سال گزر چکے تھے) سب لوگ اس کے دلی جذبات سمجھ سکتے تھے۔ بھابھی، بچیاں، ہم بہنیں اور دیگر عزیز تو پریشان تھے ہی، ایک زمانہ دست بدعا تھا

اور میں سوچتی تھی کہ اگر آج امی، ابا جی زندہ ہوتے تو کیا ہوتا؟

بھائی، بھابھی اور بچوں کی فیصل آباد سے روانگی سے ایک روز پہلے میں راولپنڈی چلی گئی کہ ان لوگوں کی آمد سے پہلے میں، وقتی طور پر لیے جانے والے گھر کا انتظام سنبھال لوں۔ آپا جی کا ارادہ بھائی جان کے پہنچنے کے دو روز بعد آنے کا تھا۔

پہلی ہی رات کو صبح چار بجے، بھائی جان نے اچانک نیند سے بیدار ہو کر کہا:

''آپا جی آئے نیں؟''

اور اس کے دس منٹ بعد گھنٹی بجی تو سچ مچ آپا جی ہی آئی تھیں۔ آنا تو انہیں دو روز بعد تھا لیکن وہ رہ نہ سکیں اور اسی روز شام کو بس پر بیٹھیں اور صبح راولپنڈی پہنچ گئیں۔ تب فیصل آباد سے راولپنڈی کا سفر سات، آٹھ گھنٹے کا تھا۔

گھر میں فون بھی نہیں تھا، پھر بھائی جان نے کیسے کہہ دیا کہ آپا جی آئی ہیں۔

'یہ بات ٹیلی فون کی نہیں، ٹیلی پیتھی کی تھی۔'

برین ہیمرج کے بعد بھائی کی حِسّ ِساعت بالکل ختم ہو گئی تھی، پھر بھی ڈاکٹرز نے سوچا کہ شاید آلۂ ساعت سے کوئی بہتری ہو جائے، لیکن ہیرنگ ایڈ کے لگنے پر بھی وہ کچھ سن نہ پائے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس بات کو سمجھ بھی نہ پائے۔ آلہ ساعت لگانے کے بعد کہا:

''اب میری آواز آتی ہے؟''

جب جواب اثبات میں ملا تو کہنے لگے۔

''اب میں زور سے آواز دوں گا۔

آپا جی۔۔۔ آپا جی۔۔۔''

(آپا جی اسلام آباد میں ہوتی ہیں)

بائی پاس آپریشن ہونے کے چند روز بعد، لیٹے ہوئے 'ریڈرز ڈائجسٹ' پڑھ رہے تھے مجھ سے کہنے لگے:

''یونہی آپریشن کے چکروں میں پڑے، ڈائجسٹ میں ایک اور طریقہ بھی لکھا ہوا ہے۔''

''اچھا۔۔۔ وہ کیا؟''

انہوں نے ڈائجسٹ میرے سامنے کر دیا۔ ایک کارٹون تھا۔ ڈاکٹر مریض سے کہہ رہا ہے۔

''اس کا ایک ہی علاج ہے، بائی پاس''

مریض دکھایا ہے کہ ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر کہہ رہا ہے۔

''بائی پاس فرج۔۔۔ بائی پاس بیکری۔۔۔ بائی پاس فاسٹ فوڈ۔۔۔''

OOO

ے ادھی ادھی راتیں اُٹھ روواں موئے متراں نوں

مائے میںنوں نیندر نہ پوے--- (شوکمار بٹالوی)

سردیوں کی راتیں لمبی اور 'دُکھاں دیاں کہانیاں دکھاں توں وی لمیاں' شدید ڈیپریشن میں ہوتی تو جانے والوں کا دکھ، ان دنوں دو چند ہو کر، مجھے آنسو رلاتا۔ عام دنوں میں میکے گھر کی چمکیلی اور خوش رنگ یادیں، ہنساتیں لیکن وہی یادیں اداسی کے دنوں میں میرا تکیہ بھگوتی رہتیں۔ ایسی ہی ایک رات کے بعد صبح میں نے بھائی کو فون کیا۔

''بھائی جان، رات بھر نیند نہیں آتی۔ غالب بن گئی ہوں۔ یادِ ماضی عذاب ہو گئی ہے۔''

جواب میں انہوں نے محسن نقوی کی ایک خوبصورت نظم مجھے 'ای میل' کی۔

''سفر تنہا نہیں کرتے
سنو ایسا نہیں کرتے
جنہیں شفاف رکھنا ہو
انہیں میلا نہیں کرتے
سفر جن کا مقدر ہو
انہیں روکا نہیں کرتے
بہت اُجڑے ہوئے گھر میں
بہت رویا نہیں کرتے''

ع چارے پلّے چونڑی، نین روندی دے بھِنّے (شاہ حسین)

زندگی بہت بے رحم ہے، میں نے تب تک یہ نہیں جانا تھا جب تک میرے سر پہ ماں باپ کا گھنیرا سایہ تھا لیکن جب تین سال کے قلیل عرصہ میں، والدین کے ساتھ ساتھ، میرے تین میں سے دو جوان بھائی بھی رُخصت ہو گئے تو زندگی کی کڑی دھوپ کی تمازت نے مجھے راکھ کر دیا۔

میرے پاس اگرچہ اور بہت پیارے رشتے تھے۔ آپا، ڈاکٹر بھائی، میرے شوہر اور میری اکلوتی اولاد--- میری بیٹی، لیکن انسانی رِشتوں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک رشتے کی جگہ، دوسرا رشتہ نہیں لے سکتا، ورنہ کوئی روئے کیوں؟

ماں، باپ جو بچے پیدا کرتے ہیں، وہ آپس میں بہن بھائی ہی ہوتے ہیں لیکن میں بڑے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ہم بہت مختلف بہن، بھائی تھے۔ شاید اسے 'زیبِ داستاں' سمجھا جائے۔ لیکن یقین مانیئے ہم پانچ بہن بھائیوں کی، ہمارے والدین نے نہ جانے کیسے تربیت کی تھی کہ موت کے علاوہ، ہم میں چند لمحات کی بھی جذباتی دُوری نہیں ہوئی۔ لوگ بات کرتے ہیں تو ڈیڑھ منٹ کے بعد ہی کسی نہ کسی وضاحت کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔

''نہیں--- نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا آپ غلط سمجھے ہیں۔''

یا یہ کہ

''میں تمہاری بات کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم جو بھی کہو میں اندر کی بات جانتا ہوں۔''

وغیرہ

ہم پانچوں میں کبھی اس بات کی نوبت نہیں آئی۔ وہ بلاغت، وہ صراحت، وہ یقین، وہ ایمان، وہ ساتھ اور سانجھ کہ کبھی غلط فہمی نے ہمارے درمیان آنے کی جرأت نہیں کی۔ اِتنا پیار، محبت، بے تکلفی اور صاف دِلی کہ جو جس نے کہا اس کا وہی مطلب ہوتا۔ میں حیران ہوتی ہوں دوسروں میں اس بات کو کم دیکھ کر۔

امی، ابا جی اور دو بھائیوں کی وفات نے مجھے ادھ مواہ کر دیا۔ دو لفظوں میں یہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ فلاں اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا لیکن اس کے بعد جن حالات میں سے ہم گزرتے ہیں۔ وہ ایک طویل اور انتہائی تکلیف دہ عمل ہے۔ میں جانے والوں کو یاد کرتی اور روتی۔ مصروفیت اگرچہ بے پناہ تھی۔ ملازمت، گھرداری، مہینوں بلکہ سالوں پر محیط بے تکی، تھکا دینے والی اور اعصاب شکن مہمانداری، خود گاڑی چلانا، گھر اور گھر سے باہر کے کام نپٹانا، پڑھنا، پڑھانا۔ لیکن میرا شعور، لاشعور اور 'عبدالشکور' (بقول شفیق الرحمن) ہمہ وقت میکے گھر کی یادوں سے بسا رہتا۔ اُداسی کی شکار میری شخصیت سے وہ رنگ کہیں اُڑ گیا جو کہ بے تحاشہ ہنسنے، ہنسانے پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر بھائی مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جتنا تم ہنستی ہو، اتنا سب ہنسیں تو اس دُنیا سے دُکھ دُور ہو جائیں۔ انھوں نے مجھ سے آخری بات بھی یہی کہی ''ہنستی رہنا'' (یہ کیونکر ممکن ہے؟ کاش اس بارے میں بھی کچھ کہتے!)

اور پھر:

ے دیوار کیا گری میرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے (سبط علی صبا)

گرنے والوں کو زمانہ ٹھوکروں پر رکھ لیتا ہے اور یہی ہوا۔ محض 'چند' رشتہ دار اور

بہت سے دوست سہارا نہ دیتے تو یہ بکھرا ہوا گھرانہ، جسے آپا، ڈاکٹر بھائی اور میں نے بڑی مشکلوں سے سمیٹا، نہ جانے کہاں تک بکھرتا چلا جاتا۔ میں اپنے میکے گھر میں سب سے کم حوصلہ ہوں لیکن عام لوگ میرے حوصلے کی مثال دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ آپا اور ڈاکٹر بھائی تو حوصلے کے پہاڑ بلکہ کوہ ہمالیہ ہیں۔ میں، سٹاف رُوم میں اپنی کولیگز کی باتیں سنتی تو اکثر حیران ہوتی کہ کیا یہ بھی 'مسائل' ہیں جن پر 'پریشان' ہوا جا سکتا ہے؟

لیکن یہ سب مل کر میرے جسم سے کینسر بن کر اُبھرا اور مرے کی لاش پر سو دُرّے والی بات ہو گئی۔ وہ زمانہ میرے لیے ایک بھیانک خواب کی مانند ہے۔ اس بیماری کے عفریت نے مجھے یوں تو ڈھیر کر دیا لیکن میں ٹوٹی نہیں۔ حوصلہ نہیں ہارا۔ ملازمت بھی جاری رکھی کہ اس کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی۔ جیسی تیسی گھرداری بھی کی۔ اس دوران ڈاکٹر بھائی مجھے مزید ذہنی مصروفیت کی طرف مائل کرتے رہتے کہ میں لکھا کروں۔۔۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے شوق کو از سرِ نو جاری کروں۔ یہ سب وہ بہت دھیرج، سکون اور آہستگی سے ہر ملاقات میں، ایک آدھ جملے کی صورت میں کہتے (ملاقات، جو بیماری کے دوران تو دِن میں چار چار بار بھی ہوتی۔ کلینک آتے اور جاتے ہر پھیرے میں) یوں جیسے ہلکی بوندا باندی، خشک زمین میں جذب ہوتی جاتی ہے۔

علاج☆ کے دوران مجھے بہت زیادہ Steroids استعمال کرنا پڑے۔ Steroids اور Depression کا معکوس تعلق ہے، سو

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس کیفیت میں جانے والوں کا دُکھ، مزید شدت اختیار کر لیتا۔ آپا بھی بہت بیمار تھیں۔ میں ان کے اور بھائی کے سامنے خود کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتی ورنہ اندر سے میں مسمار ہوئی جاتی تھی۔

علاج ختم ہوا تو میں آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی، بلکہ موت کو اِتنے

☆ کیموتھراپی اور ریڈیشن

قریب دیکھنے کے بعد زندگی کی خواہش تیز تر ہوگئی۔

بھائی سے فون پر بات ہوئی تو انھوں نے مجھے اس انتہائی تکلیف دہ علاج کے ختم ہونے پر مبارکباد دی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ دوبارہ تو نہیں ہوگا؟ انھوں نے آہستگی سے کہا:

''ہو جاتا ہے۔''

مجھے شدید دھچکا لگا۔ میں نے کہا:

''توبہ ہے بھائی جان، آپ میری تسلی کے لیے ہی کہہ دیتے کہ دوبارہ نہیں ہوگا۔''

انھوں نے جواب دیا۔

''ایک اچھا ڈاکٹر، کبھی غلط بات نہیں کرتا اور ایک 'اچھے' اور پڑھے لکھے مریض کا اس سے باخبر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔''

(میرا علاج ختم ہوا تو راولپنڈی CMH میں میرے ڈاکٹر صاحب نے ایک جملے میں مجھے بہت بڑا انعام دیا تھا۔

"You are a very good patient."

وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے ان کی ہدایات پر پورا پورا عمل کیا تھا۔ وہ میرے رویے اور قوتِ ارادی سے بہت خوش تھے اور مجھے Specimen کے طور پر ہر مریض کے سامنے پیش کرتے تھے کہ میں ایک Difficult Patient نہیں ہوں)

ایک دن فون پر بات کے دوران، بھائی جان نے مجھ سے پوچھا:

''پھر کچھ لکھا؟''

میں جواب میں خاموش رہی۔ کلینک سے واپسی پر وہ میرے ہاں آئے تو میں نے ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا۔ جسے انھوں نے پڑھا تو فرطِ جذبات سے ان کا گلعذار چہرہ سرخ ہوگیا۔ میرے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور نم آنکھوں کے ساتھ، خاموشی

سے اٹھ کر چلے گئے۔

میں نے اس کاغذ پر محمود شنا کی نظم لکھی تھی:

'مجھے اُڑتے پرندے اچھے لگتے ہیں
مجھے ان کی اُڑانیں
زندگی کے راستوں پر حوصلوں کا درس دیتی ہیں
مرے ہاتھوں نے، حرفوں کے گلابوں کو
انھی سے لکھنا سیکھا ہے
مگر ہجرت زدہ موسم میں
جب کوئی اکیلی کونج کُرلاتی ہوئی
نیلے فلک کی وسعتوں میں اپنے کھوئے ساتھیوں کو ڈھونڈتی،
آواز دیتی ہے
مجھے بچھڑے ہوئے سب یاد آتے ہیں
مرے ہاتھوں کی پوریں لفظ لکھنا بھول جاتی ہیں'

اور پھر یوں ہوا کہ ان کی اس motivation نے مجھ سے دو کتابیں لکھوالیں۔۔۔

لیکن کاش یہ والی کتاب میں نہ لکھتی!

ooo

کلّیاں بہہ کے رونا

حسن نثار لکھتے ہیں:

'شاید ہی کبھی انسان 'یکمشت' مرتا ہو۔ انسان عموماً آہستہ آہستہ قسطوں میں مرتا ہے۔ جب کوئی اپنا قریبی شخص دفن ہوتا ہے تو انسان کی ذات کا ایک مخصوص حصہ بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو دور پار کا محض شناسا سا بھی ملک عدم سدھار جائے تو آپ کی ذات کا کوئی نہ کوئی حصہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔'

اسی کیفیت کو میں نے اپنی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' میں یوں لکھا ہے:

؎ 'غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری'

اگر ایک دیوانے کے مرنے سے ویرانے پر کچھ گزرتی ہے تو یہاں تو۔۔۔ یہ کہنا ہی فضول ہے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

۔۔۔ وہ جن کے بغیر جینے کے تصور سے بھی دم الٹتا ہو، ان کے بغیر جی کر دیکھ لیا۔
شاید وہ تہی دامن لوگ، جن کا گھیراؤ محبتوں نے نہیں کر رکھا، اسے نہ سمجھ سکیں۔

اپنے گھرانے کی پے درپے اموات سے میں ذہنی طور پر اتنی متاثر ہوئی کہ

Depression کی مریضہ بن گئی۔ میں رو رو کر ان سب کا ذکر بھائی جان سے کرتی تو وہ کہتے:

''اسے لکھو''

کیا لکھوں؟''

''یہی سب؟''

ان کی دل پذیر Motivation نے آخر اپنا اثر دکھایا اور میں نے لکھنا شروع کیا۔ ایک واقعہ لکھتی اور فوراً فون کر کے، انہیں سناتی۔ ایک روز میں نے پانچ چھ صفحے لکھے اور انہیں سنانے کے لیے فون کیا۔

''بھائی جان، آپ فارغ ہیں؟ سناؤں؟''

''بالکل فارغ ہوں۔۔۔ سناؤ''

میں نے سنانا شروع کیا۔ سناتی رہی اور روتی رہی۔ بھائی جان نے جواب میں بالکل ہوں، ہاں نہ کی تو میں نے پوچھا۔

''بھائی جان، آپ سن رہے ہیں نا؟''

''سن رہا ہوں اور میں نے بھی ٹشو پیپر کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔''

انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

؎ وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے (ریاض مجید)

ooo

ع دکھدی رہی تے مچ وی پوسی

بھائی جان کے دھیمے، مسلسل اور پیار بھرے اصرار پر میں نے اپنی پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا مسودہ تیار کر لیا اور پھر ہچکچاتے ہوئے ان سے کہا۔

''اب میں اسے سنبھال کر رکھ لیتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ۔۔۔بس''

''نہیں نہیں اسے چھپوانا ہے۔''

''بھائی جان۔۔۔بہت شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''

''کس بات کی؟۔۔۔او بھائی من لو، اسیں ایڈے بھیڑے قاری وی نئیں۔ اینوں چھپواؤ۔ فیر ویکھو ہر پاسے چیکاں پیندیاں۔''

اور وہی ہوا، جس نے بھی کتاب پڑھی، بے پناہ تعریف کے ساتھ یہ بھی کہا کہ آپ نے بہت رلایا ہے۔ میری بیٹی ان تبصروں کو سن کر مجھ سے کہتی۔

''والدہ، آپ بہت خوش ہوتی ہیں جب لوگ کہتے ہیں ہم بہت روئے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کتاب کے ساتھ ایک رومال بھی تحفتاً دینا چاہیے تھا۔''

پھر اخبارات و رسائل میں اس پر تبصرے آئے۔ بڑے بڑے لکھنے والوں، جناب مشتاق احمد یوسفی، حمید اختر، حسن نثار، جمیل صدیقی سمیت بہت سوں کے تعریفی کلمات میرے لیے سرمایہ بنے۔ ریڈیو پر بہت جاندار تبصرے ہوئے، تعلیمی بورڈ سے انعام کی حق دار ٹھہری تو ایک روز میں نے بھائی سے کہا۔

''بھائی جان، کتنا مزا آئے، میری کتاب 'قدرت اللہ شہاب کی ماں جی' کی طرح مشہور ہو جائے۔''

انہوں نے جواب دیا۔

''کہاں تو تم اسے چھپوانے پر تیار نہیں تھیں اور کہاں۔۔۔ کچھ کم پر بات نہیں ہو سکتی؟''

پھر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہنے لگے۔

''کتاب آہستہ آہستہ اپنی جگہ بناتی ہے۔۔۔

ے چڑھیا ماگھ، وساکھ وی اوسی
دکھدی رہی تے مچ وی پوسی''

خوب

OOO

میری پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا فلیپ جو ڈاکٹر بھائی نے لکھا۔ یہ طے تھا کہ دوسری کتاب کا فلیپ بھی وہی لکھیں گے لیکن اس سے پہلے ہی وہ ملکِ عدم سدھار گئے۔

معنون کی عرض داشت

اگر کوئی کتاب کسی کے نام کر دی جائے تو وہ فلیپ لکھنے نہیں بیٹھ جاتا، منزہ نے آپا سے کہا کتاب آپ کے اور ڈاکٹر بھائی کے نام کی ہے کہنے لگیں "رہن دے۔ اصغر دے ناں کر دے۔"

اصغر۔۔۔ یعنی بڑے بھائی۔ جنھیں گئے ہوئے بیس برس بیت گئے ہیں۔ زندہ ہوتے تو معنون پر بحث چھڑ جاتی، دو تین دن یہ بحث چلتی کہ لفظ مُعن۔ وَن ہے یا مُعَ۔ نُون فیصلہ ہوتا کہ مُعن۔ وَن ہی صحیح ہے مگر مع نُون چلتا ہے اور اچھا لگتا ہے۔ چلنے دو۔

ٹیپ ریکارڈر اور سی ڈی کی ایجاد سے پہلے منزہ گھر بھر کا ٹیپ ریکارڈر تھی۔ کوئی واقعہ، کتنے سال پرانا ہو، اُسے درمیان میں بٹھا کر سن لو۔۔۔ یہ بھی اس گھر کا ایک معمول تھا۔

دیکھنے والے جانتے ہیں، سننے والے پوچھتے ہیں، کہ یہ گھر جو عام گھروں جیسا گھر تھا، اس میں خوشیاں بہت تھیں۔ پھر قدرت نے اس کا اُلٹ دکھایا۔۔۔ پیار کم نہ ہوا۔ بہت پیار کرنے والے لوگ تھے اور توقع ہے کہ All the World Loves a Lover کے مصداق آپ کو یہ لوگ، یہ دُنیا پسند آئے گی، عام لوگوں کے عام سے، سچے جذبے۔۔۔

منزہ نے یہ تصویر کیسے بنائی، وہی جانتی ہے، ہم آپ نہیں۔

انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے
انھیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انھیں کیا خبر کون سے حسن سے
کون سی ذات سے، کس خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اُتارے
یہی وہ ندا جس کے پیچھے حُسن نام کا یہ جواں کوزہ گر بھی
پیاپے رواں ہے زماں سے زماں تک۔۔۔
میں ہوں اس کہانی کا ڈاکٹر بھائی

مقبول اختر

OOO

Dr. Maqbool Akhtar
M.B.B.S. (Panjab)
M.C.P.S (Psych.)
Consultant Psychiatrist

ڈاکٹر مقبول اختر
ایم بی بی ایس (پنجاب)
ایم سی پی ایس (سائیکاٹری)
کنسلٹنٹ سائیکاٹرسٹ
ماہر امراض نفسیات

[illegible]

جنوں کی پرورش داشت

اگر کوئی کتاب کسی کے نام کر دی جائے تو وہ ملیب لکھنے میں
بیٹھ جاتا۔ سنبرہ نے آپا سے کہا کتاب آپ کے اور ڈاکٹر صاحب
کے نام کی ہے کہنے لگیں زہن دے۔ احمد سے نام کر دے"
احمد — اپنے بڑے بھائی — جنہیں گئے ہوئے بیس برس بیت
گئے ہیں — زندہ ہوتے تو جنوں پر [illegible]
دن یہ بحث چلتی کہ لفظ جنون — درست ہے یا جنوں — لیکن
فیصلہ ہوتا کہ جنوں — درست ہی صحیح ہے مگر جنون
چلتا ہے اور اچھا لگتا ہے — چلنے دو۔
ٹیپ ریکارڈر اور سی ڈی کی ایجاد سے پہلے سنبرہ گھر گھر
ٹیپ ریکارڈر تھا کہ کو واقعہ کتنے سال پرانا ہو اسے درمیان میں بیٹھا کر
سن لو — یہ بھی آسمان اور کا ایک جنوں تھا۔

دیکھنے والے جانتے ہیں، سننے والے پوچھتے ہیں،
کہ یہ گھر جو عام گھروں جیسا گھر تھا اس میں خوشیاں بہت
تھیں — پھر قدرت نے اس کا اُلٹ دکھایا — پیار کم ہوا۔

بہت پیار کرنے والے لوگ سلسلہ اور توقع ہے کہ
ALL THE WORLD LOVES A LOVER
کے مصداق آپ کو یہ لوگ یہ دنیا [illegible] گی، عام لوگوں
کے عام سے اچھے جذبے — سنبرہ نے یہ تصویر کیسے بنائی،
وہی جانتی ہے، ہم آپ نہیں

انہیں کیا خبر کس دھنک سے ہر رنگ آئے
انہیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انہیں کیا خبر کون سے حسن سے
کون سی ذات سے کس خدوخال سے
سینے کو زہروں کے جیسے اتارے

یہی وہ صدا جس کے پیچھے حسن نا [illegible]
پیار ہے رواں ہے زماں سے زماں تک
سب یوں اس کہانی کا [illegible] کر جاتی

مقبول اختر

میری پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' سے
اقتباسات، جن میں ڈاکٹر بھائی کا ذکر ہے۔

'مواقع'

بڑے بھائی جان اور ڈاکٹر بھائی نہر پر سوئمنگ کے لیے جاتے تو مجھے اور چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے جاتے۔ میں بہت چھوٹی سی تھی اور نہر کے کنارے بیٹھی گھاس توڑ توڑ کر اس میں ڈالتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد، خود بھی ساتھ ہی جا گری۔ ''غڑاپ'' کی آواز سن کر بھائی جان نے میری تلاش شروع کی۔ اتفاق سے میرا پاؤں ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ دوسری بار میں تین چار سال کی رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر بھائی مجھے کندھوں پر بیٹھا کر سوئمنگ کر رہے تھے کہ مَیں پانی میں جا گری۔ بہر حال جلد ہی 'دستیاب' ہو گئی۔ امّی کبھی اس کا ذکر کرتیں اور شکر کرتیں تو چھوٹے بھائی، مسمسی شکل بنا کر کہتے۔

''بس۔۔۔ قدرت کے سامنے کس کا زور چلا ہے؟۔۔۔ ورنہ 'مواقع' تو اچھے خاصے تھے۔''

OOO

اِک خواہش ایسی۔۔۔

ایف۔ ایس۔ سی کے رزلٹ نے ڈاکٹر بننے کے میرے خواب کو چکنا چور کر دیا۔ جس میں میری نااہلی کو تو دخل تھا ہی، کچھ تقدیر نے بھی ساتھ نہ دیا۔ تب سرگودھا بورڈ نیا نیا بنا تھا۔ میرا ایک پرچہ گم ہو گیا۔ بھاگ دوڑ کرنے کے بعد، میڈیکل کالج میں داخلہ کے لیے اپلائی کرنے سے ایک روز پہلے، رزلٹ ملا۔ اوسط نمبر لگنے کی وجہ سے کل نمبر کم ہو گئے اور داخلے کے لیے ایک نمبر کم پڑ گیا۔ یہ عید کے دن تھے۔ عید سے پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر بھائی نے بتایا نہیں، کہنے لگے:

''تم اپنی اور ہماری عید غارت کر دیتیں۔''

میں بھی ایسے روئی، جیسے زندگی میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ کبھی نے ڈھارس بندھائی۔ ڈاکٹر بھائی کہنے لگے۔

''میں نے تو تمہارے داخلے کے لیے رقم بھی الگ کر رکھی تھی۔''

میں اور دھائیں دھائیں رونے لگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور جاب مل جانے کے بعد ڈاکٹر نہ بننے کا صدمہ کم ہو گیا اور اب تو میں سوچتی ہوں، کہ بہتر ہی ہوا کیونکہ اب میری غائب الدماغی کا یہ عالم ہے

کہ مریض بیت جاتا اور مجھے دوا کا نام یاد نہ آتا، لیکن زندگی کی اندھیری راتوں میں ڈاکٹر بھائی کی محبت بھری بات اب بھی لَو دیتی ہے۔ شاید وہ لوگ اس بات کو نہ سمجھ سکیں جو محبتوں کے قدردان نہیں۔

ع جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

ان حالات میں مَیں شدید احساسِ کمتری کا شکار ہوگئی۔ باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ہر وقت یہ خیال لگا رہتا کہ کوئی پوچھے گا کہ آج کل کیا کر رہی ہو تو کیا جواب دوں گی؟ ایسے میں بڑے بھائی جان نے سنبھالا۔ کہنے لگے۔

"بی۔اے کے امتحان میں کچھ عرصہ باقی ہے، بس کھڑکا دو۔"

اور میں نے واقعتاً تین ماہ اور بیس دن کی تیاری سے اچھا بھلا 'کھڑکا دیا'۔

بی۔اے کا رزلٹ آیا تو ابا جی کی آنکھیں، آنسو لیے ہوئے تھیں۔

"لیجیے۔۔۔ آپ تو رو رہے ہیں ابا جی۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے" (بچپنا) ابا جی نے کہا۔

"یہ خوشی ہی کے تو آنسو ہیں۔ میں نے ایک ہی خواہش کی تھی زندگی میں کہ میری ساری اولاد گریجوایٹ ہو جائے۔" پھر خوب ہنسے اور کہنے لگے۔

"جب میں نے یہ خواہش کی تھی، تب گریجوایشن بہت بڑی بات تھی۔ آپ میرے بچوں میں سب سے چھوٹی ہیں آج میری خواہش پوری ہو گئی ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں، بہت کم لوگ ہوتے ہیں کہ جو وہ مانگیں، انہیں زندگی میں مل جائے۔"

ooo

"باندری"

خوشیاں تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ غم خود سے در آتے ہیں۔ دکھ جگہ جگہ راستہ روکے، کھڑے رہتے ہیں۔ ہم سب یہ بات بخوبی سمجھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو Enjoy کرنا، کچھ ہمیں جانتے تھے۔ میں گھر کی داستان گو تھی۔ جب قصہ خوب عروج پر ہوتا تو ڈاکٹر بھائی پاس پڑی ہوئی کوئی چیز، میری طرف زور سے پھینکتے اور کہتے:

"باندری۔"

محبت کے شیرے میں لتھڑا ہوا یہ لفظ مجھے اور شوخ کر دیتا۔ قہقہے گونجتے اور بات آگے بڑھتی رہتی۔ بڑے بھائی جان کہتے جو فلم ہم سینما میں ایک دن دیکھتے ہیں، وہ گھر میں پندرہ دن چلتی ہے۔ تب میرا حافظہ بھی اکبر کے نورتنوں والا تھا۔ مزاحیہ ڈائیلاگ، میں اسی لب و لہجے میں دُہراتی۔ یہ بات مجھے امی سے ورثے میں ملی ہے۔ امی بھی جس کی بات کرتیں، اسی کا لہجہ اختیار کر لیتیں۔

ooo

منحوس ہندسہ

آپا کا ایم۔اے کا رزلٹ تیرہ تاریخ کو آیا۔ آپا خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنہوں نے ایم۔اے کیا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ ابا جی کہنے لگے:

''انگریز کہتے ہیں تیرہ کا ہندسہ منحوس ہے۔ لیکن میرے لیے تو بہت مبارک ہے۔ میری شادی تیرہ تاریخ کو ہوئی۔ ایک بیٹے (ڈاکٹر بھائی) اور ایک بیٹی (میں) کی تاریخ پیدائش تیرہ ہے اور اب بیٹی نے تیرہ تاریخ کو ایم۔اے کیا ہے۔''

OOO

عظمت کے مینار

ٹھیک سے یاد نہیں، سیارہ یا اردو ڈائجسٹ میں ایک سلسلہ 'عظمت کے مینار' آیا کرتا تھا۔ اس میں، ایک بار ابا جی کے بارے میں کسی شخص نے لکھا،

''ایک ڈی۔ایس۔پی، اس نام کے، ملتان میں تعینات تھے۔ وہ میرے ڈیری فارم سے دودھ لیتے تھے۔ ان کا تبادلہ خانیوال ہو گیا۔ میرا بل، جو ان کی طرف واجب الادا تھا، انہوں نے خانیوال سے بذریعہ چیک بھیجا۔ ایسے ایماندار پولیس آفیسر میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔''

یہ واقعہ اس شخص نے ابا جی کے ریٹائر ہونے کے بارہ پندرہ سال بعد لکھا تھا۔ میں نے پڑھا تو ابا جی کے پاس لے گئی۔ وہ پڑھ کر جذباتی ہو گئے۔ کہنے لگے،

''بیٹا۔۔۔ باہر تو لوگ میری تعریفیں کرتے ہیں کہ بہت ایماندار آفیسر ہے، لیکن یہ سب، آپ کی والدہ کی وجہ سے ہے۔ نہ انہوں نے مجھ سے بے جا فرمائشیں کیں نہ میں غلط کاموں پر مجبور ہوا۔ جیسے بھی ہوا تنخواہ میں گزارہ کیا۔ کبھی کوئی خواتین گھر میں آتیں اور 'بیگم صاحبہ' کو پوچھتیں تو آپ کی والدہ کو دیکھ کر حیران رہ جاتیں۔ جو سادہ ترین لباس میں گھر کے کاموں میں مصروف ہوتیں۔''

کسی بیوی کی، اس کا شوہر اس سے زیادہ کیا تعریف کر سکتا ہے؟

گھر کے کاموں میں، یوں تو امّی کے مددگار کافی ہوتے تھے۔ سستا زمانہ تھا۔ سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے ابا جی کو اردلی بھی ملا ہوا تھا لیکن وہ کبھی گھر کے اندر نہیں آتا تھا۔ امّی پردہ کرتی تھیں۔ بہشتی کے آنے پر بھی وہ کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ صفائی کے لیے عام طور پر کوئی عورت آتی تھی لیکن کچن کے کام میں مَیں نے نہیں دیکھا کہ جب تک وہ صحت مند رہیں انہوں نے کسی کی مدد لی ہو۔ گھر میں مہمانداری بھی بہت تھی۔ وہ خوشدلی سے سارے کام کرتیں۔ دودھ بلونے سے لے کر چپاتی بنانے تک۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت دیا تھا۔ کس کس چیز کا نام لوں۔ پلاؤ۔۔۔ کوفتے۔۔۔ ساگ۔۔۔ اور مکئی کی روٹی۔۔۔ پیار میں گندھے ہوئے مکھن میں کچوڑ☆ پراٹھے۔۔۔ ابھی تک میرے ہاتھوں سے ان کی مہک آتی ہے۔ ان کے آخری ایام میں ڈاکٹر بھائی نے ان کو بہلانے کے خیال سے کہا،

"امّی۔۔۔ کسی دن انڈوں کی بھجیا تو بنا کر کھلائیں۔"

اس پر وہ رو پڑیں۔ کہنے لگیں:

"بیٹا۔۔۔ اب تو میرے ہاتھوں میں طاقت نہیں۔۔۔ کیا کروں؟"

لیکن پھر حسبِ عادت انکار نہ کر سکیں۔ کہنے لگیں:

"اچھا میں پاس بیٹھ جاؤں گی۔۔۔ چمچہ تمہاری بہن ہلاتی جائے گی۔"

لیکن اس کا موقع نہ آیا۔

امّی نے جتنے پیار سے کھانے بنائے۔۔۔ اتنے ہی ابا جی ان کے معترف تھے۔ اس مقولے کے مطابق کہ

"کھانا بنانے پر صرف کیا جانے والا پیار، کبھی ضائع نہیں جاتا۔"

شاید امّی کی محبت ان کھانوں کو لذیذ بنا دیتی تھی۔ میں نے اکثر عورتوں کو جلتے

☆ یہ لفظ میری ذاتی لغت سے ہے بمعنی گندھے ہوئے۔

کڑھتے، بیزاری سے کھانا بناتے دیکھا ہے۔ شاید تبھی ان کے کھانوں کی خوشبو اُڑ جاتی ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد، کبھی کبھار ابا جی بھی امّی کے کاموں میں ان کی مدد کروا دیتے تھے۔ ایک بار امی کپڑے دھو رہی تھیں۔ انہوں نے کپڑے نچوڑ کر بالٹی بھری اور خود کسی کام سے اندر چلی گئیں۔ واپس آئیں تو الگنی کپڑوں سے بھری دیکھ کر حیران ہوئیں۔ اتنے میں ابا جی ہنستے ہوئے آ گئے۔

"وہ کپڑے میں نے پھیلا دیے ہیں۔"

امّی کہنے لگیں:

"نا بابا۔۔۔ لوگ کہیں گے ریٹائر ہو کر یہ کام کرنے لگے ہیں۔"

بھابھی نے یہ دیکھ کر کہا:

"ابا جی آپ تو امّی کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے سے بھی کہیں، کبھی میری مدد کر دیا کریں۔"

ابا جی نے کہا:

"بیٹا۔۔۔ پہلے آپ اپنی ساس جتنا کام کر کے دکھائیں۔ اگر پھر میرے بیٹے نے آپ کی مدد نہیں کی تو میں اس سے کہہ دوں گا۔"

الیکٹرک ٹرالی اور مائیکرو ویو اوون تو آج کی بات ہیں لیکن میری ماں کے پاس تو اس زمانے میں بھی شاید یہ سب کچھ تھا۔ یاد نہیں کبھی ٹھنڈا کھانا، ملا ہو۔ جیسے ہی کوئی بچہ گھر آتا، توا رکھ کے ساتھ ساتھ گرم روٹی اُتارتیں۔

آج کل تو میڈیا کی بدولت کھانے کی ترکیبیں ہوا میں تیرتی پھرتی ہیں۔ امّی کے کھانوں میں تو تب بھی بہت تنوع تھا۔ کبھی ابا جی سے پوچھتیں کہ آج کیا پکائیں تو وہ ایک عجیب سا جوڑ میل بتا دیتے۔ امّی کہتیں:

"لیں بھلا۔۔۔ یہ بھی کبھی پکتا ہے؟"

ابا جی ہنستے ہوئے کہتے:

''دیکھئے۔۔۔یہ سب انسان کا ہی تو بنایا ہوا ہے، کوئی آسمانی صحیفہ تو ہے نہیں۔''

کھانا بنانے میں جو محنت درکار ہوتی ہے امّی نے اس میں کبھی خسّت سے کام نہیں لیا تھا، وہ رات کو دودھ گرم کرتیں اور اسے پھینٹ پھینٹ کر اتنا ٹھنڈا کرتیں کہ وہ جمانے کے قابل ہو جائے۔ پھر اسے گجراتی مٹی کے بڑے سے پیالے میں دہی بنانے کے لئے ڈال دیتیں۔ بے حد مزے کا دہی تیار ہوتا۔ بڑے بھائی جان کے ایک دوست کہتے،

''اس پیالے میں تو چھ ماہ کے بچے کو با آسانی نہلایا جا سکتا ہے۔''

ooo

سری لنکا کے نقشے اور بغیر ہلدی کا سالن

ایف۔ ایس۔ سی کے بعد تک امّی اور آپا نے مجھے گھر کے کام کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا۔ ابا جی کبھی دبی زبان میں کہتے بھی کہ کام کرنا آنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ کیا بھی جائے۔ تو امّی کہتیں:

''عمر پڑی ہے کام کرنے کو۔''

جن دنوں میں بی۔ اے کی تیاری کر رہی تھی امّی کا بازو ٹوٹ گیا۔ آپا کی شادی ہو چکی تھی۔ میں نے گھر کا کام کرنا شروع کیا۔ عجیب تماشے کرتی۔ لیکن مجال ہے جو کسی نے مذاق اڑایا ہو۔ ٹیڑھی میڑھی لیکن بہت پتلی روٹیاں بناتی تو ابا جی کہتے:

''اگر میں نے دو روٹیاں کھانا ہوں تو اڑھائی کھاتا ہوں۔''

چھوٹے بھائی کہتے:

''ویسے آپس کی بات ہے۔۔۔یہ سری لنکا کے نقشے ہیں مزے کے۔''

بغیر ہلدی کا سالن کھا کر، ڈاکٹر بھائی اتنا سراہتے کہ میں نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ آپا میکے آتیں اور مجھے بھاگ بھاگ کر کام کرتے دیکھتیں تو ان کا دل برا ہو جاتا۔ میں ان کے گلے میں جھول جاتی۔

''آپا۔۔۔بڑا مزہ آتا ہے کام کرنے میں۔۔۔سب اتنی تعریفیں جو کرتے ہیں۔''

Teeny Tiny اور Biggy Biggy

چھوٹے بھائی سے دوستی برابری والی تھی۔ بڑے بھائی جان اور ڈاکٹر بھائی سے بے تکلفی بہت تھی لیکن ذرا مختلف انداز لیے ہوئے تھی۔ بڑے بھائی جان پڑھاتے تو ڈکشنری مجھے نہ دیکھنا پڑتی۔ وہ مجھے بانسری کی لے پر 'سا رے گا ما پا' سکھاتے، ہم لفظوں کو اُلٹ پلٹ بولتے، چٹکیوں اور دھپّوں کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے سزائیں مقرر کرتے۔ وہ بازوؤں سے پکڑ کر مجھے 'میری گو راؤنڈ' بنا دیتے۔

ڈاکٹر بھائی، ہمیشہ نظر رکھتے کہ کہیں میں سلیپر تو نہیں گھسیٹتی پھر رہی۔ بوٹ جرابیں پہنے ہوئے ہوں۔ بالوں میں خوش رنگ ربن بندھا ہے۔ کلرنگ بک میں جس صفحے میں رنگ بھرے ہیں اس کے برابر والی Poem یاد کی ہے یا نہیں؟ اس لیے میں انہیں بچوں کے لیے ایک کہانی کے کرداروں کے ناموں سے پکارتی بڑے بھائی جان Teeny Tiny اور ڈاکٹر بھائی جان Biggy Biggy۔ اور جب میں انہیں ہوسٹل میں خط لکھتی تو یہی القاب لکھتی۔

اپنے کالج کے زمانے میں بھائی جان انڈیا سے ہندی رسالہ 'پراگ' منگواتے تھے، اس سے انہوں نے ہندی لکھنا سیکھی۔ مجھے بھی اپنا نام، ہندی رسم الخط میں لکھنا آ گیا۔ ایک

دن ہمارے ایک ددھیالی عزیز آئے تو میں نے بڑے فخر سے انہیں لکھ کر دکھایا، وہ کہنے لگے:

''چھی چھی۔۔۔ ہندوؤں کی زبان۔۔۔''

ابا جی نے سنا تو کہنے لگے:

''اس میں کیا حرج ہے۔ دوسری زبانیں سیکھنی چاہئیں۔''

بڑے بھائی جان مجھے خط لکھتے:

''تمہارے پتر کا اُتر دے رہا ہوں آشا ہے تم کشل ہوگی۔''

ooo

خلیج

اباجی ریٹائر ہوئے تو میری اور چھوٹے بھائی کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ آپا اور بڑے بھائیوں کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور ہمارا اپنا کوئی گھر بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے اباجی کی تنخواہ میں سب تعلیم حاصل کر رہے تھے، یہی بڑی بات تھی۔ ڈاکٹر بھائی نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے خلیج کے ایک ملک میں سروس کر لی۔ جس سے گھر میں فراوانی تو بہت ہو گئی لیکن ہم سب ان کی کمی کو بہت محسوس کرتے۔ انہوں نے بھی اپنا Contract پورا نہ کیا اور جلد واپس آ گئے۔ وہ گھر کے لیے اور چیزوں کے علاوہ فریج لے آئے جو اس زمانے میں بہت عام نہیں تھا۔

میں نے اور چھوٹے بھائی نے فریج Un pack کیا، صاف کیا اور امی کو بٹن دبا کر افتتاح کرنے کو کہا، سب نے تالیاں بجائیں۔ امی ایک ایک چیز اس میں رکھتیں اور شکر شکر کرتیں۔

فوٹوگرافی، میرے سوا سب بہن بھائیوں کا شوق تھا۔ ہمارے پاس بہت اچھا کیمرہ نہیں تھا، لیکن بڑے بھائی جان نے اس سے بہت عمدہ تصویریں بنائیں۔ انہیں Develop بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ آپا نے پنجاب یونیورسٹی کے فوٹوگرافی کے مقابلے میں اوّل

انعام بھی حاصل کیا تھا۔

جب ڈاکٹر بھائی باہر گئے تو بڑا اچھا کیمرہ انلارجر، اور فوٹوگرافی کا دیگر سامان لے کر آئے۔ گھر میں ایک ڈارک روم بنایا گیا تھا۔ بھائی جان پورٹریٹ بناتے، اسے انلارج کرتے اور یوں ان کے شوق کو بڑھاوا ملا۔

ooo

Independent

ابا جی ہمیشہ پارکر کا پین استعمال کرتے۔ میرا خیال ہے اپنی ذات پر کیا جانے والا، یہ ان کا واحد بڑا خرچ تھا۔ اس کے لیے بھی وہ ہمیشہ معذرت خواہ نظر آتے۔ کہتے،

''میں بہت دبا کر لکھتا ہوں اور کوئی دوسرا پین اس کا متحمل نہیں ہوتا۔''

پین کو وہ ہمیشہ Independent کہتے۔ ڈاکٹر بھائی باہر گئے تو ان کے لیے زیادہ قیمتی پارکر پین لے کر آئے۔ اسے وہ بہت سنبھال کر رکھتے۔ پھر کسی ایک دن وہ اچانک 'انکشاف' کرتے کہ ان کا پین کھو چکا ہے۔ سارا گھر اس کو تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد وہ مسکراتے ہوئے چلے آتے۔

''لو بھئی۔۔۔ وہ تو میری جیب میں لگا ہے۔ میں نے سویٹر پہن رکھا تھا پتا ہی نہیں چلا۔''

سب سکھ کا سانس لیتے۔ امی کہتیں،

''پین اور وہ بھی بیٹے کا لایا ہوا۔۔۔ خدا کے لیے اسے سنبھال کر رکھا کریں۔ آپ تو مجھے پریشان کر دیتے ہیں۔''

ooo

حُسن پری

بڑے بھائی جان کیمرے سے بڑے اچھے پورٹریٹ بناتے تھے۔ کبھی وہ مجھے کہتے کہ آؤ تمہاری تصویر بناؤں اور میرا موڈ نہ ہوتا تو میں کہتی،

''نا۔۔۔ بابا۔۔۔ مجھے تصویر نہیں بنوانی۔۔۔ میری تصویر اچھی نہیں آتی۔۔۔''

تو چھوٹے بھائی، جھٹ سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر گلوگیر آواز میں کہتے۔

''صبر کرو میری عزیز بہن۔۔۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ تصویر ویسی ہی بنتی ہے، جیسی شکل ہو۔''

اور میں اپنا موڈ بھول کر کیمرے کے سامنے جا بیٹھی۔

''میں تصویر بنوانے لگی ہوں۔۔۔ اور آپ دیکھ لیجیے گا۔ کتنی اچھی آتی ہے۔۔۔ ہاں۔''

ایک بار میں نے چھوٹے بھائی کی تصویر بنائی اور انہوں نے میری۔ اتفاق سے دونوں بہت اچھی بنیں۔ میں ہر ایک کو دکھاتی اور بھائی کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہتی:

''یہ تصویر کھینچنے والے کا کمال ہے۔''

اور پھر اپنی تصویر کی طرف دیکھ کر کہتی:

''یہ تصویر کھنچوانے والے کا۔''

بھائی جواب میں ایک لمبی سی 'ہوں' کرتے۔

ابا جی کے ریٹائر ہونے پر ہمارا اپنا گھر نہیں تھا۔ ڈاکٹر بھائی نے خلیج کے ایک ملک میں سروس جوائن کر لی تو گھر بنانے کا سوچا گیا۔ ہماری زرعی زمین بھی شہر کے نزدیک تھی، وہیں پر، چھ کنال کے قطعہ پر گھر بنایا۔ اس کے اندر نہری پانی کا ایک نالہ تھا، جس سے گھر سے ملحقہ باغ میں پانی دیا جاتا۔

ایک دن میں نے کہا:

''افسوس کہ پانی 'شفاف' نہیں ہے ورنہ میں اپنے 'مرمریں پاؤں' اس میں لٹکا کر بیٹھا کرتی۔''

چھوٹے بھائی جھٹ سے بولے:

''جیسے تمہارے پاؤں 'مرمریں' ہیں ویسا 'شفاف' تو یہ ہے۔''

ooo

ہارٹ اٹیک

۵ جنوری ۱۹۷۴ء کی سرد رات۔۔۔ سہمی ہوئی فضا۔۔۔ مکمل خاموشی۔۔۔ سب دبے پاؤں چل پھر رہے تھے، جیسے سائے ہوں۔۔۔ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے تکتے ہوئے۔۔۔ بڑے بھائی جان کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ ان کے کمرے میں ڈاکٹر بھائی اور ان کے ایک ڈاکٹر دوست موجود تھے۔

بھائی جان کو آکسیجن دی جا رہی تھی۔ ان کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں، ٹپک رہی تھیں۔ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑے تھے اور ساتھ کے کمرے میں امی ابا جی بیٹھے تھے۔ وہ سراپا دعا تھے۔ ذرا سی آہٹ سے، وہ یوں دہل جاتے کہ اب نہ جانے کیا سننے کو ملے گا؟ آپا ان کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھیں۔ میں اور چھوٹے بھائی ٹھنڈے فرش پر، ننگے پاؤں چھوٹے موٹے کام کرتے پھر رہے تھے۔ صورتِ حال کی سنگینی، میرے منہ سے سسکی کی صورت میں نکلتی تو، چھوٹے بھائی میری طرف دیکھ کر، منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش ہونے کو کہتے۔ ایسے میں ان کی بڑی بڑی آنکھیں، سرخ ہو جاتیں۔ رات اسی بیم و رجا میں کٹی۔ صبح بھائی جان کی طبیعت قدرے سنبھلی لیکن ۷۲ گھنٹے تلوار سر پر لٹکتی رہی۔

وہ آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگے امی۔ ابا جی کی دعائیں اور ڈاکٹر بھائی کی شبانہ روز

محنت رنگ لائی۔ڈاکٹر بھائی نے دو ماہ اپنے کلینک کا رُخ نہیں کیا۔ان کے ڈاکٹر دوست بھی پہلے ۳۶ گھنٹے ہمارے گھر پر رہے اور پھر باقاعدگی سے روزانہ آتے رہے (آج کسی ڈاکٹر کو بتایا جائے تو شاید وہ یقین نہ کرے لیکن ہمارے معاملات کچھ ایسے ہی ہیں۔زندگی میں روپے پیسے کو اتنی ہی اہمیت دی، جتنی کہ دی جانی چاہیے۔محبتوں کو کبھی اس کے برابر نہیں تولا۔)

اس کے ٹھیک دس ماہ بعد امی کو بھی ہارٹ اٹیک ہوا۔جس کے لیے وہ کہتیں،

"یہ بیماری میں نے مانگ کرلی ہے۔"

اس کے جواب میں، ابا جی اکبر بادشاہ کے اپنے بیٹے کے لیے سات پھیروں کی کہانی سناتے۔

اور پھر اس کے دس سال بعد بڑے بھائی جان اور امی، اسی طرح پانچ ماہ بیس دن کے وقفے سے، اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

سے پیڑے نی پیڑے
ایہہ پیار ایسی تتلی ہے
جیہڑی سدا سُول تے بہوے

(شِو کمار بٹالوی)

ooo

عالمِ ہستی کی ویرانی

۱۸/اگست ۱۹۸۱ء۔۔۔پورنماشی کی رات۔۔۔ایک بجے کا عمل۔۔۔ہر چیز نے چاندنی کی سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔میں امی کے پاس گہری نیند سو رہی تھی کہ ایک کار آ کر رکی۔ڈرائیونگ سیٹ سے نکلنے والے نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔کار کی بتیاں، اسی طرح جل رہی تھیں۔ابا جی باہر والے برآمدے میں سو رہے تھے۔آنے والے ڈاکٹر بھائی تھے۔وہ ابا جی کے پاس دو زانو ہو گئے اور سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔ابا جی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے عجیب نظروں سے دیکھا، پھر ایک دم گھبرا کر اُٹھ گئے۔

"بیٹا کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

ڈاکٹر بھائی نے جواب دیا!

"نہیں ابا جی، خیریت ہی تو نہیں ہے۔"

"اللہ رحم کرے۔"

"ابا جی۔۔۔صفدر (چھوٹے بھائی)۔۔۔چلا گیا۔"

"انا للہ۔۔۔"

آپا اور بھابھی جاگ رہی تھیں۔انہیں بھی پتا چل گیا، کیونکہ تھوڑی ہی دیر پہلے، تو

چھوٹے بھائی کی طبیعت خراب ہو جانے پر، بڑے بھائی جان انہیں ڈاکٹر بھائی کے پاس لے گئے تھے۔ مجھے جگا کر ڈاکٹر بھائی باہر لے آئے اور کہا:

''صفدر چلا گیا۔''

میں گہری نیند میں تھی اور یوں بھی یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔

''ڈاکٹر بھائی۔۔۔کہاں؟''

ڈاکٹر بھائی کے پاس، اس کا جو جواب تھا، وہ ہمارے خاندان کی تباہی کا آغاز تھا۔

اب امی کو بتانا باقی تھا، جو دوا کے زیرِاثر سو رہی تھیں۔ڈاکٹر بھائی کے ڈاکٹر دوست ساتھ آئے تھے۔امی کو جگا کر، ڈاکٹر صاحب انہیں انجکشن دینے لگے تو امی نے پوچھا۔

''مجھے انجکشن کیوں دے رہے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب کے پاس آپا کھڑی تھیں، انہوں نے کہا،

''امی۔۔۔صفدر بیمار ہے۔''

امی کہنے لگیں!

''ڈاکٹر صاحب۔۔۔ بیٹا۔۔۔ اسے دوا دیں۔۔۔ مجھے انجکشن کیوں دے رہے ہیں؟''

تھوڑی دیر کے بعد ایمبولینس آ گئی۔بڑے بھائی جان آگے بیٹھے تھے اور پیچھے۔۔۔

چھوٹے بھائی کو دو ماہ میں تیسرا ہارٹ اٹیک ہوا، جو جان لیوا ثابت ہوا۔دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی، ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ منجمد تھی، جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔گھر میں کون زیادہ دکھی تھا؟۔۔۔اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اس سانحے سے، ہمارے گھر کا نقشہ بدل گیا۔خوشیوں کی جگہ، دکھ بھر گئے۔قہقہوں نے سسکیوں کا روپ، دھارن کرلیا۔وہ دن اور آج کا دن، عالمِ ہستی کی ویرانی نہیں جاتی۔

☆ بہار را چہ می کنم چُو شُد زبر بہارِ من

☆ میں بہار کو کیا کروں جب میری بہار مجھ سے جدا ہو گئی۔

شہرِ خموشاں آباد ہو گیا

گھر سے ملحقہ زمین میں، چھوٹے بھائی کی قبر بنانے کو ابا جی نے ہی کہا تھا۔ عزیزوں نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ قبر اتنی نزدیک نہ بنائی جائے، لیکن ابا جی دکھ کی جس کیفیت میں سے گزر رہے تھے، انہیں منانا، ناممکن تھا۔انہیں قائل کرنے کو کہا کہ اکیلی قبر نہیں بنانا چاہیے۔انہوں نے جواب دیا،

''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے یہ اکیلی رہ جائے گی؟''

اور پھر سب سے پہلے چھوٹے بھائی کے پہلو میں، جا آباد ہوئے۔اڑھائی سال کے اندر اندر بڑے بھائی جان اور امی بھی وہیں جا سوئے، اور وہاں ایک الگ شہرِ خموشاں آباد ہو گیا۔

چھوٹے بھائی اور ابا جی کے جانے سے، گھر کے دو کمانے والے جاتے رہے تو ڈاکٹر بھائی کو فکرِ معاش نے، زیادہ مصروف کر دیا۔ساتھ میں امی کی بیماری۔۔۔ بڑے بھائی جان بھی دِل کے مریض تھے۔

بڑے بھائی جان نے گھر کے دیگر معاملات سنبھال لیے۔امی کی طبیعت دن میں کئی کئی بار خراب ہوتی، بڑے بھائی جان ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے۔۔۔دکھ، پریشانیاں

۔۔۔مسائل۔

ابا جی کی وفات کے دو سال بعد جب گھریلو زندگی قدرے معمول پر آنے لگی تو امی بھی تمام تر پریشانیوں کے باوجود کہتیں۔

''خدا سب کے ساتھ مجھے بھی زندگی دے۔۔۔اتنی کہ بن باپ کے بچے، ذرا بڑے ہو جائیں۔''

کہ بڑے بھائی جان بھی رات کو سوتے سوتے میں، گزر گئے۔ان کی ڈائری میں یہ شعر لکھا ہوا ملا۔

تھک کر یونہی دم بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اُٹھیں، یہ ارادہ تو نہیں تھا

دکھ کی اگر کوئی شکل ہوتی ہے تو وہ میری ماں سے مشابہت رکھتی تھی۔ وہ رضائی میں منہ چھپا کر روتیں اور پھر منہ صاف کر کے کہتیں:

''آج سردی بہت ہے رضائی گرم ہی نہیں ہو رہی۔''

ایک دن امی نے ایسے ہی رضائی منہ سے اُتار کر مجھ سے کہا:

''بیٹا۔۔۔مجھے اصغر (بڑے بھائی جان) کا تمہارے باپ جیسا آسرا تھا۔''

ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے شوہر اور بڑا بیٹا کیا حیثیت رکھتے ہیں، اس ایک جملے سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

OOO

ترا کیا اصول ہے زندگی

امی کی زندگی کے آخری چند دن پہلے میں میکے پہنچی تو امی نے کہا۔

''چھیئے۔۔۔چنگا ہویا تو آ گئی۔''

میں حسب عادت، ان کے ساتھ لیٹ گئی۔ان کا دل مفلوج ہو رہا تھا۔دو بیٹوں، خاوند اور بھائی (چھوٹے بھائی کی وفات کے سات ماہ بعد میرے بڑے ماموں بھی وفات پا گئے تھے) کی پے در پے اموات کو انہوں نے کیسے برداشت کیا۔۔۔مجھے آج بھی سکون کی نیند سونے نہیں دیتا۔انہیں انجائنا کی درد ہوتی تو ہم۔۔۔ان کی بچی کچھی اولاد، ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے تو وہ کہتیں۔

''مجھے کچھ نہیں ہو گا۔۔۔میں بہت ڈھیٹ ماں ہوں۔''

نہ جینا اپنے بس میں ہے نہ مرنا۔

چین اک پل نہیں۔۔۔اور کوئی حل نہیں۔۔۔

اور پھر ایسے ہی ایک دن، انہوں نے باری باری، سب کو اپنے پاس بلایا، گلے سے لگایا، پیار کیا اور کہا۔

''میں بھی اللہ کی سپرد اور آپ بھی اللہ کی سپرد۔''

آخر میں ڈاکٹر بھائی سے کہا:

''بیٹا، تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔''

انہوں نے بیٹے کے لیے زندگی میں جنت کی سفارش کی۔ اس سے بڑھ کر اور کون گواہی دے سکتا ہے؟

چپکے سے آنکھیں بند کیں اور پھر کبھی نہ کھولیں۔ وہ پانچ دن 'کوما' میں رہیں۔ مجھے یہ سوچ کر پسینہ آ جاتا کہ اگر امی کو کچھ ہو گیا تو؟۔۔۔ اور وہ لمحہ، جب وہ مشتِ غبار، رزقِ خاک ہوئی، میری حیات کے سارے سفر پر بھاری ہے اور میں آج بھی ان سے بچھڑ کر زندہ ہوں۔ ہنستی ہوں۔۔۔ کھاتی پیتی ہوں۔۔۔ پہنتی اوڑھتی ہوں۔۔۔ مالک۔۔۔ یہ کیا ہے؟

ترا کیا اصول ہے زندگی؟
مجھے کون اس کا جواب دے

(امجد اسلام امجد)

ooo

چشمِ سُرمہ سا

امی کے بال بہت لمبے اور خوبصورت تھے۔ مجھے ان سے کھیلنا بہت اچھا لگتا۔ میں انہیں کھولتی، باندھتی، پھیلا دیتی۔ انہیں جھنجلاہٹ ہوتی، لیکن کبھی منع نہ کرتیں۔

بچپن کی یادوں میں، امی کی روشن آنکھیں دمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ امی کبھی کبھار سرمہ لگاتیں تو ان کی بڑی بڑی آنکھیں اور خوبصورت لگنے لگتیں۔ ابا جی دیکھتے تو کہتے۔

''او۔۔۔ ربّ جی''

یہ تعریف کرنے کا، ان کا اپنا انداز تھا۔

امی کو غسل دیا گیا تو ان کے چہرے پر سرمہ لگی آنکھیں، سب سے نمایاں تھیں۔

ان کو دفن کرنے کی اگلی صبح، میری طبیعت بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ آپا قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ میں ڈاکٹر بھائی کو تلاش کرتے باہر نکلی تو وہ امی کی قبر کے پاس بنچ پر اکیلے بیٹھے تھے۔ مجھے گلے سے لگا لیا اور آہستگی سے کہا۔

''امی کی آنکھوں میں سرمہ کس نے لگایا تھا؟''

ooo

رفتگاں کی یاد

میری پہلی کتاب "پھول لاکھوں برس نہیں رہتے" کی تقریب رُونمائی 24 دسمبر 2008ء کو نصرت فتح علی خان آڈیٹوریم، پاکستان آرٹس کونسل فیصل آباد میں منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر بھائی جان نے میری کتاب کے بارے میں درج ذیل مضمون پڑھا۔ پڑھتے ہوئے، بار بار ان کی آواز بھرا جاتی اور ضبط کی کوشش میں چہرہ گلگوں ہو جاتا۔

لیکن جب میری دوسری کتاب کی تقریب رونمائی 24 فروری 2011 کو اسی ہال میں ہوئی تو انہیں گزرے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا جہاں ان کا ذکر کرتے ہوئے میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔

رفتگاں کی یاد

ایک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک۔۔۔ ایک بزرگ، اپنے برخوردار کو سمجھا رہے تھے۔

"بچہ! لوگوں کے جنازے میں جایا کرو ورنہ جن لوگوں کے جنازے میں تم نہ گئے، وہ بھی تمہارے جنازے میں شریک نہیں ہوں گے۔"

آج کی محفل، حضرات۔۔۔ شرکت فرما کر ثوابِ دارین حاصل کریں، کی دعوت

نہیں ہے۔ یہ تو دعوت عام ہے، ان دلوں کے لیے جو دھڑکنا جانتے ہیں۔ ان ذہنوں کے لیے، جو ان یادوں کے ممنون ہیں جو انسانی وجود کا سب سے اہم حصہ ہیں، جنہیں گم کر کے لوگ باگ خود بھٹک جاتے ہیں کیونکہ وہ جو رگِ جاں سے قریب تر تھے، جاتے تو ہیں پر آپ کو چھوڑ کر نہیں جاتے۔ اگر آپ جاگتے میں ان کی یاد سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں تو وہ خوابوں میں آ جھانکتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا تھا:

میری تمام سرگذشت
کھوئے ہوؤں کی جستجو

جستجو کس لیے؟۔۔۔ یہ تلاش ہے اپنی اصلیت کی، اپنی جڑوں کی۔۔۔ جنہیں بھول کر لوگ دنیاداری میں، پیسہ کمانے میں جُٹ جاتے ہیں اور خوب کماتے ہیں اور پھر حیران بھی ہوتے ہیں کہ خوشیاں کیوں نہیں ملیں؟ اس کے لیے الگ سے ہر جمعرات کو داتا صاحب حاضری دینا پڑتی ہے۔

یادیں تو زبردستی آتی ہیں، آپ کو اسیر کر لیتی ہیں لیکن اگر آپ خود سے ان یادوں کے متلاشی ہوں، ان کی چاہت کریں تو اسے کیا کہیں گے؟ اس کے لیے اردو زبان کا لفظ موجود ہے اگرچہ استعمال کم ہوتا ہے۔۔۔ للک بمعنی Yearning یا علامہ کے الفاظ میں دردو سوزِ آرزومندی۔۔۔ جو اک متاعِ بے بہا ہے۔

للک ایک بنیادی، لازمی اور طاقتور جذبہ ہے، للک کسی دوسرے میں ضم ہونے سے پسپائی کی تاریخ ہے، للک گئے ہوؤں کا مرثیہ ہے، اک ہوک ہے۔۔۔ جدائی کے لمحے اپنی ذات سے جدا ہو جانے والے ایک حصے کا ماتم، وہ حصہ جو جانے والوں کے ساتھ چلا گیا۔

للک ہے ماضی سے چمٹنے کا نام، ماضی کو اچھی طرح نچوڑنے کا تاکہ اپنی ذات کے تمام ذرے اس میں سے بازیافت کر لیے جائیں۔

؎ بچھڑے ہوؤں کے ساتھ گیا جو
ماتم ذات کے اس حصے کا

للک ہے ماضی، للک حال بھی، للک ہمارا مستقبل ہے۔

ساری بھوکیں، ساری پیاسیں
یہ بھی للک ہے
تیز اور تیکھی
بنیادی بھی
خواہش، جذبے، چاہت، سپنے
للک پتا ہے، للک ہے ماتا
للک گئی کل سے لوٹانا
اپنی ذات کے کھوئے ذرے
تو صاحبو!

ہوا یوں۔۔۔خدا کسی کے ساتھ ایسا دوبارہ نہ کرے۔۔۔کہ ہمارے والدین اور دو جوان بھائی، یکے بعد دیگرے، تین سال کے عرصہ میں، ہم سے الگ ہوئے۔ اتنا وقت بھی نہ ملتا تھا کہ ایک کی یاد سے انصاف کرلیں دوسرا چل دیتا، مگر اللہ کا اپنا ٹائم ٹیبل ہے کہ پنجابی میں 'ڈاہڈا' ہے۔ ہمارے ساتھ وہی ہوا جو صوفی تبسم کے پانچ چوہوں کے ساتھ ہوا۔ ایک عید پر ہم پانچ لوگ، تینوں بھائی، والد صاحب اور ایک بھتیجا نماز پڑھنے گئے۔ اگلی عید پر چار، اس سے اگلی پر تین اور جب باقی رہ گئے دو تو میں نے بھتیجے سے کہا،

''اب ہو چکی نماز مصلہ اٹھائیے''

بات موت کی نہیں
موت تو برحق ہے

؎ موت سے کس کو رستگاری ہے
آج میری ہے کل تمہاری باری ہے

غالب نے کہا تھا:

''مرنے والوں کا غم وہ کرے جسے خود نہ مرنا ہو''

میرا مقصد شامِ غریباں منعقد کرنا نہیں۔ ہم لوگوں پر جو تین سال کے عرصہ میں بیتی میں، تو اس کے بعد پس ماندگان کے تجربے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو Survior's guilt ہوتا ہے۔۔۔ حادثے سے بچ جانے والوں کا احساسِ گناہ، جیسے یہ سب ہمارا کیا دھرا ہو۔

دوسری بات ہے للک کی، جس کا بالتفصیل ذکر کر چکا ہوں۔ آپ کی ذات میں ایک مسلسل تبدیلی آتی ہے۔ آپ کے ذہن کے اندرونی تھیٹر کو وہ لوگ آباد کر دیتے ہیں جن کے ساتھ بھلے دن گزارے، عمر بتائی۔ ہوتا یوں ہے کہ جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں وہ تو اکثر مر جاتے ہیں، صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ ہر کسی کے پاس یادیں ہیں اور اکثر و بیشتر شب تنہائی میں، کچھ دیر پہلے نیند سے، رلاتی ہیں۔

منزہ نے میکے گھر کی یادوں کو ربع صدی تک بینت بینت کر رکھا ہے۔ اک یاد ہے، اک سپنا ہے۔۔۔

ایہہ گلیاں تینوں سفنا تھیسن
گلیاں بابل والیاں۔۔۔
وہ بہت روئی ہے، سب کو رلایا ہے
We could cry oceans
میں بھی اُس دنیا کا حصہ ہوں جو منزہ کی اس کتاب کا موضوع ہے۔

اس بھاری غم نے منزہ کو بیمار کر دیا۔ بہت علاج کیا، شفا نہ ہوئی۔ منزہ اس غیر مکمل ماتم Unfinished bereavement سے کبھی خالی نہ ہوئی، یہ عزیز از جان دکھ اس کی بیماری بن گیا۔

میں نے کہا'' منزہ یہ لکھ ڈالو''

''کیا لکھوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہی سب کچھ۔۔۔''

اُس کی آنکھوں نے اس کا دکھ، خون کی صورت ٹپکانا شروع کیا صفحۂ قرطاس پر۔ خون بے رنگ نہیں ہوتا اس لیے اس تصویر میں بھی رنگ آ گئے، زندگی کے رنگ، شوخ رنگ، غم کے رنگ، سرمئی رنگ۔

نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک عام سے گھرانے کی عام سی باتیں، مگر جس فن پارے کی نمو، خونِ جگر سے ہو اس میں کچھ نہ کچھ عالمی سچائیاں یا Universal Truth بھی جھلکتے ہیں۔ ہر قاری کو اپنا عکس اور اپنے پیاروں کا عکس اس میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

ع میر نے درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اس کتاب کی مثال گلدستے کی سی ہے، اگر آپ کو یاد ہو کہ گلدستہ کیا ہوتا تھا۔ آج کل تو پھولوں کو پلاسٹک میں لپیٹ کر بو کے کہہ لیتے ہیں، میں جس گلدستے کی بات کر رہا ہوں وہ تو تجربہ کار، چابک دست مالی ہی تیار کرتا تھا۔ کچھ رنگ برنگے پھول اور ان کے گرد ڈھیروں پتے، دھلے دھلائے، آلائشوں سے پاک۔ یہ پتے ہمارے عام سے دن ہیں۔ جن دنوں کوئی ڈرامہ نہیں ہوتا۔ کوئی ولیمہ یا چالیسواں نہیں ہوتا، بس عام سے دن۔۔۔ کہ زندگی انہیں سے عبارت ہے۔ یہی گلدستہ تقریباً ہر گھر میں موجود ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ منزہ نے زندگی کے حسن کو دیکھا ہے اور سب کو دکھایا ہے۔

اس نے اس چھوٹی سی کتاب میں، ایک کنبے کی کہانی میں سبھی کنبوں کی جھلک دکھلا دی ہے۔ اس طرح شاید وہ فیض صاحب کی مقرر کردہ میزان پر پوری اتری ہے کہ:

''ادیب اور شاعر کا کام، قطرے میں دجلہ دیکھنا اور دکھانا ہے۔''

○○○

پوہ دی دُھپ

میری پہلی کتاب آئی تو کچھ دن کے بعد بھائی نے کہا:

''بہتیری تعریفیں کروالی ہیں، اب اگلی کتاب شروع کرو۔''

''کیا لکھوں؟'' میں کہ ان کی اُنگلی تھامے، ادب کے میدان میں داخل ہوئی تھی، ...لے پوچھا۔

''ناول'' انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ناول؟؟؟۔۔۔ میں لکھوں؟''

''جی'' انہوں نے 'جی' پر زور دیتے ہوئے ذرا لمبا کر کے کہا۔

''میں کیسے لکھ پاؤں گی؟''

''جیسے پہلی کتاب لکھی ہے۔''

''وہ اور بات تھی۔۔۔ ناول!!!''

''تم لکھ سکتی ہو اور لکھو گی۔۔۔ ناول ادب کی ایسی صنف ہے جس میں سب کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اردو میں اس کی بہت کمی ہے۔''

گویا اب ایں و آں کی گنجائش نہیں رہی تھی سو شروع کر دیا اور حسبِ سابق جو لکھتی انہیں دکھاتی یا فون پر سناتی۔

ایک روز گھر پر آئے تو میں نے انہیں کتاب کا وہ حصہ سنایا جس میں ہیروئن کی شوہر سے علیحدگی ہو جاتی ہے اور وہ اپنی بہن کے خط کے جواب میں یہ نظم لکھ کر بھیجتی ہے۔

شیما نے جواب میں لکھا:

'اپنے شب و روز کیا لکھوں؟
بس ایسا ہے جیون۔۔۔
جیسے گھر بھر میں پھیلی چپ
جیسے دھول جمی شیشوں پر
جیسے راکھ کے اُڑتے ذرّے
جیسے گیت کے بکھرے پنّے
جیسے گلے میں چبھتے آنسو
جیسے اپنے دل کی دھڑکن
جیسے پوس کی دھوپ اکیلی
جیسے سونا سونا آنگن
جیسے تن میں چھپا سناٹا
جیسے جاتے دن کی اداسی
جیسے آتی رین کا دھڑکا
بس ایسا ہے جیون،

اسے پڑھ کر انہوں نے نم آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ بھیگے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ کس کی نظم ہے؟''

''فہمیدہ ریاض کی'' میں نے جواب دیا۔

بھابھی صاحبہ کی رحلت کے بعد وہ اس دکھ کا اظہار تو کم کم ہی کرتے، لیکن بہت ڈانواڈول ہو گئے تھے۔

کی کیتا تقدیرے۔۔۔

ڈاکٹر بھائی کو برین ہیمرج ہوا تو اس سے ان کے ذہن کا وہ حصہ متاثر ہوا جو Intelect سے متعلق تھا۔ اس سے ان کا میڈیکل کا علم، مختلف زبانوں پر مہارت، فلسفہ، ادب سب کچھ اس کے ساتھ بہہ گیا۔ سماعت تو مکمل طور پر جاتی رہی وہ خود کہتے

90% of my English, 30% of urdu and 20% of Punjabi is gone.

ذخیرۂ الفاظ بہت محدود ہو گیا تھا۔ جس خزانے کو پانے میں انھوں نے تمام عمر صرف کر دی تھی۔ وہی لٹ گیا تو وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر پائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی جسمانی Handicap ہوتا تو وہ اس سے نبرد آزما ہونے کی پوری کوشش کرتے اور کامیاب بھی ہوتے۔ بستر پر بیٹھ کر مریض دیکھتے، کمپیوٹر پر کام کرتے، کتابیں پڑھتے، دوستوں اور گھر والوں سے پہلے کی طرح گپ شپ لگاتے لیکن یہ سب کچھ چھن گیا تو اپنی اس محرومی سے سمجھوتہ ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا۔ جتنی دیر یہ اُمید باقی رہی کہ بہتری کی کوئی صورت نکل آئے گی، انھوں نے حوصلہ برقرار رکھا لیکن پھر مایوسی نے انہیں بے بس کر دیا۔

اگے وی کجھ نظر نہیں آوندا
یاد وی کجھ نہیں رہندا

سبھی ان کے لیے دست بدعا تھے اور ہر بار ڈاکٹروں کی رپورٹ کا انتظار کرتے ہوئے کسی اچھی خبر کے منتظر رہتے، لیکن رپورٹ کی روشنی میں ہماری دعائیں ایسی ہی ہو گئیں جیسے ہم کہہ رہے ہوں

'شالا، ڈوتے ڈوچ تھی ونجن'

ooo

ع ہن میں موئی نی میریئے ماں (شاہ حسین)

بھائی جان کی بیماری کے دوران میں ہر روز کالج سے واپسی پر ان کے ہاں چلی جاتی اور کبھی وہ میرے ہاں آ جاتے۔ اس دوران آپا جی، جو اسلام آباد میں ہوتی ہیں اور عرصے سے بستر پر ہیں، بہت زیادہ بیمار ہو گئیں اور ہسپتال داخل تھیں۔ میں انہیں دیکھنے اسلام آباد چلی گئی اور زرقا (بھتیجی) سے کہا کہ بھائی جان کو نہ بتائے، کیونکہ وہ نہ تو جا سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ کر سکتے ہیں، سوائے پریشان ہونے کے۔

مجھے اسلام آباد میں چار، پانچ روز لگ گئے۔ ایک دو روز تو بھائی جان نے میری موجودگی کو نظرانداز کیا پھر زرقا سے کہنے لگے:

''زائی کو 'ابا' کی یاد نہیں آتی؟''

(زرقا ہماری دوسری نسل میں سب سے بڑی ہے۔ اس نے مجھے منزہ سے 'زا' بنا دیا۔ وہ مجھے 'زا پھپھو' کہتی۔ مجھ سے چھوٹے کزنز نے مجھے 'زا باجی' کہنا شروع کر دیا۔ میری امی نے 'سوچا' کہ اس کی ماں کا نام دراصل 'زابا' ہے۔ 'جی' احتراماً لگایا جاتا ہے۔ اس نے مجھے 'زابا' کہنا شروع کیا تو سب گھر والوں نے مجھے 'زابا' کہنا شروع کر دیا۔ زرقا کا بیٹا احمد عزیز، ہماری تیسری نسل کا پہلا فرد ہے۔ وہ مجھے 'زائی نانی' کہنے لگا۔ غرضیکہ:

~ میں کی کی بجیس وٹائے

یہ تو ہوئی 'زائی' کی وضاحت، اب رہی 'ابا' کی بات۔۔۔ تو نہ جانے کیسے، شدید بیماری کے دوران بھائی جان نے خود کو 'ابا' کہنا شروع کر دیا۔ (حالانکہ ان کی بچیاں انہیں 'ابو جی' کہتی تھیں) اپنی بات کرتے تو خود کو ابا کہتے۔

''ابا کو یہ چاہیے''

''ابا کو بھوک لگی ہے''۔۔۔ وغیرہ

آج 'زائی' کو 'ابا' کی بہت یاد آتی ہے، لیکن مجھے کوئی یہ بھی تو بتائے کہ 'زائی' کیا کرے؟

OOO

صدقے میں ونجاں اونہاں راہاں توں (شاہ حسین)

بھائی جان اپنی شدید بیماری کے دوران اکثر میرے ہاں آ جاتے اور سارا دن وہاں گزارتے۔ میں ان کے ساتھ لکھ لکھ کر باتیں کرتی۔ حنیا (میری بیٹی) ان کے لیے پرہیزی کھانا بناتی۔ دونوں نواسیاں سارا وقت ان کے ارد گرد رہتیں۔ وہ ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی تعلیمی کارکردگی اور دیگر مشاغل کو دیکھ کر خوش ہوتے اور انہیں بڑھاوا دینے کے لیے، تعریف کرتے اور ترغیب دلاتے۔ بڑی نواسی اصبح اپنی تحریریں اور پینٹنگز دکھاتی اور چھوٹی اعلیٰ بھاگ کر وائیٹ بورڈ لے آتی اور کہتی:

''ڈاکٹر نانا! ٹِک۔ ٹیک۔ ٹو کھیلیں؟''

میرے میاں اور عاصم (داماد) آفس سے آتے تو سب اکٹھے مل کر بیٹھتے۔ محفل میں تو وہ اپنی حسِ سماعت کی غیر موجودگی کو جس حد تک ممکن ہوتا، اس پر اثر انداز نہ ہونے دیتے۔

رات کو، ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر زرقا اور داماد، عامر عزیز انہیں لینے کے لیے آجاتے۔ ان کی بیماری کے پیشِ نظر میں رکنے کے لیے اصرار نہ کرتی۔ زرقا کی شکل میں انہیں ہر وقت ڈاکٹر میسر رہتا۔

جب زرقا مجھے فون کرتی کہ ابّو کہہ رہے ہیں مجھے زائی کے ہاں لے جاؤ، تو میرے اندر سے خوشی کی لہر اٹھتی۔

ے کوٹھے تے چڑھ کے ویکھدی نی مائے
کِتے ویکھدی ویرے دا راہ
دوروں تے ویکھاں میرا ویر پیا آوے
میرا آیا اے ساہ وِچ ساہ

اور اب وہی راہیں سرگوشیاں کرتی ہیں۔

ع اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

ooo

مینوں ترے جیہا ہور کوئی لبھدا ناں (بلّھے شاہ)

ڈاکٹر بھائی کی آٹھ ماہ کی شدید بیماری کے دوران، ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر زرقا، اس کے شوہر عامر عزیز اور اس کے والدین، میرے شوہر میجر سلیم اور ڈاکٹر احسان الحق صاحب نے جس جانفشانی سے ان کا علاج معالجہ اور دیکھ بھال کی، اس کے لیے میں ان سب اصحاب کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے رشتے کو بطریقِ احسن نبھایا لیکن نہ جانے کیوں میں ان سب کی ممنونِ احسان ہوں۔ شاید۔۔۔ میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر بھائی صرف میرے تھے۔۔۔ (میں ہی نہیں ان کے سب چاہنے والے یہی سمجھتے ہیں)

اور ان کا جان سے پیارا نواسا۔۔۔ احمد عزیز۔ ڈاکٹر بھائی آخری وقت میں اس کا سامنا کرنے سے تھوڑا کتراتے تھے شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسے چھوڑ کر جاؤں یا وہ سمجھتے تھے کہ احمد کو انہیں اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہیے۔

رخصت ہو جانے کے بعد انہیں ہسپتال سے گھر لایا گیا تو گھر بھر میں وحشت ناک سناٹے کا راج تھا۔ اچانک زوردار چھناکے کے ساتھ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پتا چلا کہ شدتِ رنج میں احمد عزیز نے کلاک میں گھونسا مارا اور وہ ٹوٹ گیا۔ وہ بھی اپنے نانا کی

طرح عام طور پر اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کرتا لیکن اس وقت پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا تھا، لیکن:

ع شکستِ شیشۂ دل سے صدا نہیں آتی

ان کی نواسی آمنہ عزیز ان سے لاڈ پیار کرتی، Get Well کارڈز بنا کر دیتی۔ میری نواسیاں اصبح عاصم اور اعلیٰ عاصم بھی اپنے ڈاکٹر نانا سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ ان کے لیے کارڈز بناتیں، ان کے ساتھ گیمز کھیلتیں۔۔۔۔ میں نے کہا نا ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ صرف اسی کے ہیں۔

OOO

ع اتھے رہنا ناہیں، کوئی بات چلّن دی کرو و!

(شاہ حسین)

کلمۂ شہادت کی گونج میں، وہ میرے بھائی کو میرے سامنے اٹھا کر لے گئے۔ میں نے انہیں روکا بھی نہیں اور نہ ہی مڑ کر دیکھا پھر بھی پتھر کی ہو گئی۔ نہ تو میری آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نہ ہی میں نے سینہ کوبی کی۔ میں خالی ہاتھ اس خالی رستے کو تکتی رہی لیکن اپنا دامن چاک نہ کیا۔ اس متاعِ بے بہا کے لُٹ جانے پر بھی میں خاموش رہی۔ بھائی! میں حیران ہوں کہ کس انداز سے میں نے آپ کا سوگ منایا۔

آخری وقت میں بھی آپ کے چہرے پر بجلی مسکراہٹ تھی، لیکن میری مسکراہٹ، آپ چپکے سے ساتھ لے گئے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔

ے کتنے ہونٹوں کی ہنسی ساتھ گئی ہے اس کے
موت بھی سوچ رہی ہو گی کہ کون آیا ہے؟

OOO

ع اُٹھ دردمنداں دِیا دَردیا (امرتا پریتم)

جنازہ لے جایا جا چکا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی دل میں تنہائی کی گھٹن تھی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ایک مفلوک الحال شخص دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں ان کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔''

اسے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے سر اٹھایا اور بلکنے لگا۔

''باجی میرے ڈاکٹر صاحب''

میں خشک آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ میں نے کہا:

''ڈاکٹر صاحب میرے بھائی تھے۔ آپ کون ہیں؟''

وہ کہنے لگا۔

''باجی، میں ان کا مریض ہوں۔ وہ مجھے چھوڑ گئے، کس کے آسرے؟''

''خدا کے آسرے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان جیسا پیارا بندہ مجھے کہاں ملے گا؟''

اس بات کا میں اسے کیا جواب دیتی؟

وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

''باجی، میں تانگہ چلاتا ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ کچھ دن، ایسا ہوتا ہے کہ کام پر جانے کو دل نہیں چاہتا۔ چادر میں منہ چھپا کر لیٹا رہتا ہوں۔ گھبراہٹ اور بے چینی مجھے پریشان کر دیتی ہے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ میں نے اس سے کہا کہ میری کمائی میں تو میرے گھر کا خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ میرے پانچ بچے ہیں جی! میں علاج کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں۔ اس نے مجھے 'میرے' ڈاکٹر کا پتا بتایا اور کہا کہ جاؤ وہ تم سے فیس نہیں لیں گے۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔ میں نے بھی اسے منع نہیں کیا۔

وہ پھر باتیں کرنے لگا۔

''میں ایک دن شام کو گیا۔ کمپوڈر دکان بند کر رہا تھا اور ایک انگریزوں جیسا سوہنا بندہ کوٹ پینٹ پہنے، ٹائی لگائے، گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا۔ میں نے سوچا یہ مجھے دیکھے گا؟ میں گھر واپس آ گیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میری طبیعت خراب ہوئی تو میرے دوست نے پھر مجھے سمجھایا اور جانے کو کہا''

وہ مسکرایا۔

''میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ جب میری باری آئی تو میری بیوی نے تو میرے ڈاکٹر کو دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبالی اور میرے کان میں کہنے لگی۔

''ایڈا سوہنا!''

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ساری حقیقت پوچھی، پھر میری بیوی سے کہنے لگے۔

"جن دنوں یہ بیمار ہوتا ہے اور کام پر نہیں جاتا تو گھر کا خرچہ کیسے چلتا ہے؟"

میری بیوی نے بتایا کہ پہلے تو میں لوگوں کے گھروں میں کام کر لیتی تھی۔ اب جب سے مجھے ٹی۔ بی ہوئی ہے بہت مشکل ہو گئی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے دو 'رقعے' لکھے۔ دونوں پر پیسے رکھے۔ ایک رقعہ مجھے دیا کہ یہ تمہاری دوائی ہے اور یہ اس کے لیے پیسے۔ دوسرا 'رقعہ' اور پیسے میری بیوی کو دیے اور کہا کہ ٹی۔ بی ہسپتال جا کر ڈاکٹر صاحب کو دینا، تمہیں مفت دوائی دے دیں گے۔ بھلا ہو میری بیوی کا، اس نے بھی لالچ نہیں کیا۔ کہنے لگی، پھر یہ پیسے کس لیے دیے ہیں۔ وہ کہنے لگے:

"پھل اور دودھ کے لیے"

وہ شخص پھر زار زار رونے لگا۔ اب میرے پاس اسے چپ کروانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ooo

روزنامہ جنگ لاہور

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کے لیے اجتماعی دعا آج ہوگی

فیصل آباد ماہرِ نفسیات ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کے ایصال ثواب کے لیے ختم قل آج ہوگا

فیصل آباد ماہرِ نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کے ایصال ثواب کے لیے ختم قل خوانی اور اجتماعی دعا آج 11 اگست کو آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔ مرحوم کی نماز جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں ادا کی گئی۔ جس میں

ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف، ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے شرکت کی۔

روزنامہ امن فیصل آباد

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی آج ہوگی

فیصل آباد معروف ماہر نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج گیارہ اگست آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔ دریں اثناء مرحوم کی نماز جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں ادا کی گئی۔ جس میں ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ڈاکٹر ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ پیغام فیصل آباد

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج ہوگی

فیصل آباد معروف ماہر نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج گیارہ اگست آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی دریں اثناء مرحوم کی نماز جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں

ادا کی گئی جس میں ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ڈاکٹر ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ اظہار تعزیت کے لیے مرحوم کے سوگوران سے 0321-8663020 اور 0300-6633794 پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ ایکسپریس فیصل آباد

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر سپرد خاک، نماز جنازہ میں کمشنر سمیت اہم شخصیات کی شرکت

فیصل آباد معروف ماہر نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج گیارہ اگست آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔ دریں اثناء مرحوم کی نماز جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں ادا کی گئی جس میں ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ڈاکٹر ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔

ے تینڈے باجھ ویرا میں رُل ویساں
میںڈے دل دا شہر، ویران نہ کر

ڈاکٹر بھائی کی وفات کے بعد مجھ پر دکھ کو برداشت کرنے کے مختلف ادوار آئے۔

کبھی تو ایسا ہوتا کہ میں تعزیت کے لیے آنے والے شخص سے بھائی کے بارے میں باتیں کیے جاتی، دکھ کی، خوشی کی، صحت کی، بیماری کی، ان کے رخصت ہو جانے کی، اس کے بعد اپنی کیفیت کی۔ گویا عالم یہ ہوتا کہ

ے یا تیرا تذکرہ کرے کوئی
یا کوئی مجھ سے بات ہی نہ کرے

بعض اوقات مجھے یہ احساس بھی ہوتا کہ آنے والا شخص دل چسپی سے میری باتیں نہیں سن رہا۔ ظاہر ہے جو مجھ پر بیت رہی تھی اس کو کوئی اور اس شدت سے تو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دُکھ، میرا تھا۔

اور کبھی مجھے بالکل چپ لگ جاتی اور یوں لگتا کہ تعزیت کرنے والا، اس غم کو زیادہ محسوس کر رہا ہے بہ نسبت میرے۔ وہی باتیں دہرا دہرا کر میں بالکل خالی ہو جاتی اور میرے

پاس کہنے کو کچھ باقی نہ رہتا۔ خالی الذہن اور خاموش، ویران آنکھیں لیے بیٹھی رہتی اور ساتھ میں یہ احساس بھی کہ تعزیت کے لیے آنے والا شخص یہ سوچ رہا ہے کہ مجھے اس کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟

ے بارِ الم اُٹھایا، رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی، اندازِ بے حسی کے

ایک روز ایسی ہی صورتِ حال سے گزرنے کے بعد مجھے ڈاکٹر بھائی کا سنایا ہوا لطیفہ یاد آیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

بھائی نے سنایا۔

''ایک میراثی کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ لوگ تعزیت کے لیے آنے لگے۔ پہلے آنے والے نے پوچھا۔

''اماں کو کیا ہوا تھا؟''

میراثی نے بتایا۔

''ماں جی صبح اُٹھیں۔ فجر کی نماز پڑھی، ناشتہ کیا اور اللہ بیلی ہو گئیں۔''

اور لوگ آئے، انہوں نے پوچھا۔

''اماں کی وفات کیسے ہوئی؟''

میراثی نے قصہ تھوڑا بڑھا دیا۔

''ماں جی صبح اٹھیں، وضو کیا، فجر کی نماز پڑھی پھر قرآن مجید پڑھا، ناشتہ کیا اور پھر رخصت ہو گئیں۔''

ان کے بعد میں آنے والے لوگوں نے بھی یہی سوال کیا تو میراثی نے کہانی کو مزید طول دیا۔

''ماں جی نے تہجد پڑھی، پھر فجر پڑھی، قرآن مجید کی تلاوت کی۔ تھوڑی دیر ٹہلتی

رہیں، پھر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد خدا حافظ کہا اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔"

لوگ آتے رہے اور میراثی ہر بار بڑھا چڑھا کر ان سے ماں کی وفات کا ذکر کرتا رہا۔ ایسے ہی شام ہو گئی تو وہ جو غم سے نڈھال تو تھا ہی، باتیں کر کر کے بھی بے حال ہو گیا تھا۔ ایسے میں کوئی تعزیت کے لیے آیا اور اس نے کہا:

"بہت افسوس ہوا، اماں کو ہوا کیا تھا؟"

میراثی نے جل کر کہا:

"چھڈ یار، پولیس مقابلے چ مر گئی۔"

ooo

❀

اُڈ گئے بھور پھلاں دے کولوں ، سن پتراں سن ڈالیاں
جت تن لگے سو ای تن جانے ، ہور گلاں کرن سکھالیاں (شاہ حسین)

بھائی کے رُخصت ہو جانے کے پندرہ بیس دن کے بعد، میں نے یونہی بیٹھے بٹھائے بھائی کے کلینک کا ٹیلی فون نمبر ڈائل کیا۔ کلینک بند تھا اور مجھے وہاں سے کوئی جواب ملنے والا نہیں تھا لیکن۔۔۔ اچانک بھائی کی آواز آئی۔

'آپ صبح گیارہ سے تین بجے تک رابطہ کریں۔'

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھ پر کیا بیتی ہو گی؟ یہ "آنسرنگ مشین" تھی جس میں بھائی نے اپنی آواز میں پیغام ریکارڈ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا یہ کتنے مزے کی بات ہوتی اگر ہم واقعی گیارہ بجے سے تین بجے تک رابطے میں رہ سکتے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑے پر بھی تو گزارہ کیا جا سکتا ہے نا! کجا اس کے کہ ہم بالکل تہی دست ہو جائیں۔

ooo

پاکستان مزدور کسان پارٹی کا ۲۹ ر اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ڈاکٹر مقبول اختر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کیے جانے والے اجلاس کا دعوت نامہ۔


پاکستان مزدور کسان پارٹی

ریفرینس: ڈاکٹر مقبول اختر 10 اگست 2010ء بروز منگل کو وصال فرما گئے ہیں۔ تمام زندگی بائیں بازو کی سیاست کی۔ ادیب انقلابی، سیاسی، سماجی، ثقافتی مفکر تھے۔ ایک عظیم انقلابی سپوت تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر بلند پایا کے مارکسی مفکر تھے۔ تمام زندگی مارکسی فلسفے پر لیکچر دیا آخری وقت تک عوامی جمہوری انقلاب، سوشلزم، کیمونزم کیلئے جدوجہد کرتے رہے۔

ان کے انقلابی راستے پر چلتے ہوئے ہم انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

مہمان خصوصی
افضل خاموش
مرکزی صدر پاکستان مزدور کسان پارٹی

مورخہ 29-10-10
بروز جمعۃ المبارک
شام 3 بجے

زیر صدارت
ضلعی صدر
حافظ سعید خان

بمقام: قائد اعظم ہال ڈسٹرکٹ بار فیصل آباد 0321-7842749, 0303-6354235, 0306-7705395

ع ایہہ دُکھ جا کہوں کس آگے (بُلھے شاہ)

میرے ناول کا تقریباً ''۳/۴ حصہ'' بھائی کی زندگی میں لکھا جا چکا تھا لیکن جنوری ۲۰۱۰ء میں جب انھیں برین ہیمرج ہوا تو اس کے بعد لکھنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حالانکہ وہ ہر دوسرے چوتھے دن مجھے یاد دلاتے رہتے کہ اسے پورا کرو لیکن میری طبیعت میں ان کی خرابیِ صحت کی وجہ سے اتنی فکر مندی اور بے چینی تھی کہ میں کوشش کے باوجود خود کو مجتمع نہ کر پائی اور ایک لفظ نہ لکھا جا سکا۔

انھوں نے اگست ۲۰۱۰ء میں رُخصت ہونے سے پہلے، مجھ سے آخری بات یہی کہی:

''کتاب مکمل کرنا۔''

اور پھر نہ جانے یہ کیونکر ہوا کہ میں نے کتاب مکمل کی اور وہ دسمبر میں چھپ گئی۔

جس روز میں نے مسودہ پریس میں بھیجا، میں اندر سے خالی ڈھنڈار ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے ابھی ابھی بھائی کو رُخصت کیا ہے۔ شاید وہ دِن رات کی مصروفیت ختم ہو گئی تو مجھ پر ایک بار پھر، نئے سرے سے، یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ بھائی نہیں ہیں۔

چند روز بعد جب کتاب چھپ کر آئی تو اپنی تخلیق کو دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے میں بے اختیار رو دی کہ آج اگر بھائی ہوتے تو کتاب وصول کرنے کا رنگ کچھ اور ہوتا۔

وہ کتنا خوش ہوتے۔۔۔ مجھے پیار کرتے۔۔۔ شاباش دیتے اور میں پھولے نہ سماتی۔۔۔ ان کی غیر موجودگی کے احساس نے مجھے ڈانواڈول کر دیا۔

تیرے ہوتے ہوئے ہر دُکھ میں بھی سکھ شامل تھے
اب تو شامل ہے ہر اک سکھ میں تیری یاد کا دُکھ

000

دُنیا طالب مطلب دی وو، سچ سن وو، سچ سن وو فقیرا
مطلب آوے مطلب جاوے، مطلب پوجے گر پیرا (شاہ حسین)

بھائی کے لیے کتاب تو مجھے لکھنا ہی تھی، لیکن اس کا حوصلہ بہت دیر سے کر سکی۔ اس سلسلے میں، مَیں نے ان کے سبھی، دوست، احباب، ساتھیوں اور عزیزوں سے رابطہ کیا کہ ان کے بارے میں، لکھ کر مجھے دیں تاکہ میں کتاب میں شامل کر سکوں اور اس کے جواب میں کتنے ہی خوبصورت محبت نامے مجھے موصول ہوئے جو کتاب کی زینت بنے۔

لیکن بہت سے لوگ جو بھائی کی زندگی میں تو ان کے اردگرد نظر آتے تھے، نے لکھ کر دینا تو درکنار، میری درخواست جو میں نے بار بار کی، کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی تحریر سے مجھے نوازتے، لیکن مجھے ہاں یا نہ میں جواب تو دے سکتے تھے کہ رسمِ دُنیا ہے لیکن میری درخواست، صدائے گنبد کی طرح مجھ تک واپس آ جاتی رہی۔

یہاں میں ان کے ایک 'نام نہاد' انتہائی قریبی ساتھی کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گی

جنھوں نے میرے SMS کا جواب فوری طور پر بذریعہ SMS دیا۔

میں نے لکھا تھا:

؎ حفیظ موت بھی ہے آزمائشِ احباب
یہ دیکھنا ہے کوئی نوحہ خواں بھی ہوتا ہے

میں ڈاکٹر مقبول اختر کے لیے ایک مختصر سی کتاب 'میرا قبلہ تے کعبہ' کے عنوان سے لکھ رہی ہوں۔ آپ بھی ان کے لیے کچھ کہنا چاہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

؎ ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

"تم ایک بہادر خاتون ہو، لکھ پاؤ گی۔ میرا قلم مقروض ہے ضرور لکھوں گا۔"

لیکن اس کے بعد، لکھ کر دینا تو درکنار، انھوں نے آج تک مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کتاب کس مرحلے میں ہے؟

یہاں میں بھائی کی نذر ایک شعر کرنا چاہوں گی

؎ وہ اپنی ایک ذات میں کل کائنات تھا
دُنیا کے ہر فریب سے ملوا گیا مجھے

ooo

بوہتا چانن تے ڈھیر بھلیکھے

رشتوں کے تاج محل خوبصورت تو بہت ہیں لیکن ان کی تعمیر خونِ جگر مانگتی ہے۔
بھائی جان نے رشتوں کی بنیادیں خونِ جگر سے ہی سینچیں۔ تابع فرمان بیٹا، پیار کرنے والا بھائی، خیال رکھنے والا شوہر، شفیق باپ، پیارا دوست، نرم دل طبیب، باشعور شہری، حساس، ہمدرد۔۔۔ دانشور۔

میرے لیے تو وہ ایک عظیم درسگاہ تھے۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی مجھے بہت کچھ سکھا گئے۔ ان کی طرح میں بھی محبتوں میں یقین رکھنے والی ہوں اس لیے میں نے ہمیشہ محبت کو فاتح عالم سمجھا، لیکن بھائی جان کی آٹھ ماہ کی شدید بیماری میں ان کے ایسے ایسے 'دعویداران محبت' نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ ہم۔۔۔ ڈاکٹر مقبول اختر کے چاہنے والوں نے ان کی بیماری کے ساتھ ساتھ، ان لوگوں کی بے وفائی کا صدمہ بھی برداشت کیا۔ توقعات کے یوں لٹ جانے پر وہ اس شخص کا نام لکھ کر اس پر x کا نشان لگا دیتے۔ منہ سے کچھ نہ کہتے۔۔۔ نہ گلہ نہ شکوہ۔ x کا نشان ان کی جس اندرونی کیفیت کا مظہر تھا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو ان کی صحت مندی میں ہر وقت ان کے اردگرد ہوتے تھے اور اب ایسے غائب تھے جیسے۔۔۔ حدِ ادب کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتی۔

حادثے سے بڑا، سانحہ یہ ہوا
کوئی ٹھہرا نہیں حادثہ دیکھ کر

آج ان کی وفات کو ایک سال ہونے کو آیا لیکن ان کی یاد میں کچھ کہنے سننے کی تو بات ہی کیا۔ تعزیتی ریفرنس تک نہ کیا گیا۔ شاید وہ لوگ اس مقولے پر یقین رکھتے ہوں گے کہ:

"یہ ایک عالمی سچ ہے کہ محبتوں کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ ہمیشہ کم پڑ جاتے ہیں۔"

حالانکہ میں تو سوچتی تھی کہ ایسی صورتِ حال ہوگی۔

اب تیرے ہجر میں اے فہم و ذکا کے یوسف
کتنی آنکھیں ہیں جو یعقوب ہوئی جاتی ہیں

تب میں نے جانا کہ محبت ہر ایک پر ضائع کی جانے والی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف اور صرف انہی کا حصہ ہونا چاہیے جو اس کی قدر کر سکیں تاکہ آخر میں آپ خالی ہاتھ، شکستہ دل اور بے فیض نہ رہ جائیں۔

ہاں، ایسے بھی بہت ہیں جنہوں نے ان کی کمی اسی شدت سے محسوس کی ہے جس طرح سے اس پیارے شخص کی، کی جانی چاہیے تھی۔ اور۔۔۔ ان لوگوں کا نام لکھ کر بھائی جان نے لاتعداد '✓' کے نشان لگائے۔

OOO

اوالحاج سن

میں نے اپنی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ 'بارِ الم' بھی اور 'رنگِ نشاط' بھی۔ ناقابلِ برداشت ترین صورتِ حال میں بھی ڈاکٹر بھائی نے اس انداز سے میری دلجوئی کی کہ عمر کے اس بے پایاں لق و دق صحرا میں، میں راستہ نہیں بھولی اور میرے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمے رہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو وہ دھیرج سے چند الفاظ میں ایسے اس کا حل پیش کرتے کہ شرمندگی سی ہونے لگتی اور میں سوچتی کہ میں نے ناحق بھائی جان کو پریشان کیا اور پھر یوں ہلکی پھلکی ہو جاتی جیسے تتلی ہواؤں میں ڈولتی پھرتی ہے۔ (ان کی وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے بھی یہی بات کہی کہ وہ بھی میری طرح اپنے دکھوں کی جھولی ان کے کلینک پر خالی کر آتے تھے)

دل جوئی ایک فن ہے، لیکن کتنے ہیں جو اس سے واقف ہیں؟ 'بہت سے لوگ' تو پوری بات سننا گوارا ہی نہیں کرتے اور جو تھوڑی بہت کسی طرح سے کان میں چلی جاتی ہے، اسے سمجھ نہیں پاتے اور پھر اس کے جواب میں کچھ کہنا تو بعد کی بات ہے۔ یوں بغیر سلام دعا کے اٹھ کر چل دیتے ہیں کہ جیسے جانتے نہیں، پہچانتے نہیں۔۔۔ مجھے یہ احساس دے کر کہ کس پتھر سے سر پھوڑا؟! اس لیے:

سخن جنہاں دا دارو ہووے

حال اتھائیں کہیے وو (شاہ حسین)

'باقی لوگ' بات سنتے تو ہیں لیکن جواب میں نصیحتوں کے انبار لگا دیتے ہیں یوں کہ دکھ سوا ہو جاتا ہے۔ 'کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا' کی خواہش تو غالب بھی دل میں لیے چلے گئے، میں کس گنتی میں ہوئی؟

فارسی میں کہتے ہیں۔

'دل بدست آور کہ حجِ اکبر است'

(دل جوئی کرنا، حجِ اکبر کے برابر ہے)

اب میں کیا، بھائی کے سبھی جاننے والے یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب جیسا مخلص، ہمدرد اور دکھ کو سمجھنے والا کوئی نہیں تھا اور دل جوئی کرنا ان پر ختم تھا تو پھر فارسی کہاوت کے مطابق وہ ہر سال حج پر جاتے تھے اور ہر حج، حجِ اکبر ہوتا تھا۔

۷۰ء کی دہائی میں، مشہور شاعر مصطفےٰ زیدی قتل ہوئے تھے ایک حسینہ شہناز کے ہاتھوں۔ اس مقدمہ کو بہت شہرت ملی۔ عوام جوق در جوق، اس مقدمہ کی کارروائی سننے کے لیے عدالت کے باہر جمع ہوتے۔ ایک اخبار نے خبر لگائی کہ کل عدالت کے باہر، ایک بوڑھا شخص بھی موجود تھا۔ جب شہناز عدالت میں پیش ہونے کے لیے آئی تو اس کی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے اس بزرگ نے کہا:

''سچا مریا اے''

بھائی جان کے متعلق مختلف مضامین پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا اور آپ بھی کہیں گے۔

''منزہ سچی دکھی اے''

ooo

کانے کپ کے قلم بناواں، لکھ نہ سکن قلماں ھو (باہو)

ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی آپا جی، پھر تین بھائی جن میں ڈاکٹر بھائی منجھلے تھے اور بھائیوں کے بعد میں۔ آپا جی ۱۹۹۰ء سے بیمار ہیں۔ Sarcoidosis کی مریضہ۔۔۔ یہ بیماری پاکستان میں خال خال ہے۔ اس بیماری کی دوا Steroid کے ذیلی اثرات سارے جسم کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اب تو وہ چند سالوں سے مکمل طور پر بستر پر ہیں لیکن حوصلہ بہت بلند ہے۔ ڈاکٹر بھائی کی وفات کے بعد وہ منہ سے کچھ نہیں کہتیں لیکن ان کی خالی نگاہیں، رازِ دروں فاش کر دیتی ہیں۔

پچھلے دنوں وہ زیادہ بیمار تھیں۔ پہلے تو ایسے مواقع پر ڈاکٹر بھائی انہیں فیصل آباد بلا لیا کرتے تھے۔ (وہ اسلام آباد ہوتی ہیں) یہاں وہ میرے پاس ٹھہرتیں، ضرورت ہوتی تو ہسپتال داخل کروا دیا جاتا۔ لیکن اب ایک سال ہو گیا ہے وہ فیصل آباد نہیں آئیں۔ میں نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگیں۔

''حوصلہ نہیں ہے۔''

(ظاہر ہے بھائی کے بغیر شہر خالی لگتا ہے)

میں نے ڈاکٹر احسان الحق صاحب (بھائی کے عزیز ترین دوست جو ان کی زندگی

میں بھی ہم سب کے ڈاکٹر تھے اور اب تو ان کی شفقت پہلے سے بھی سوا ہے) سے ذکر کیا تو انہوں نے فوراً کہا:

''ہم چلتے ہیں۔ انہیں دیکھ آتے ہیں۔ ان کی Medical Help تو ہو گی ہی Psychologically بھی اچھا اثر پڑے گا۔''

(اللہ ڈاکٹر صاحب کو سلامت رکھے۔ اس محبت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک روز کی پریکٹس چھوڑی اور ہم صبح جا کر شام کو واپس آ گئے۔

آپا جی نے جن شکر گزار اور محبت بھری نگاہوں سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بات بالکل درست تھی کہ انہیں نفسیاتی طور پر بہت فائدہ ہوگا۔

(ڈاکٹر صاحب کی صحت کے پیش نظر انہیں ایک دن میں اتنا سفر کرنے سے یقیناً تھکاوٹ ہوئی ہو گی لیکن مجال ہے جو انہوں نے اس کا اظہار کیا ہو)

میں نے آپا جی سے کہا کہ آپ ڈاکٹر بھائی کے لیے کیا لکھنا چاہتی ہیں؟ آپ لکھوائیں میں لکھ دیتی ہوں۔ (آپا جی ڈبل ایم۔اے ہیں، انہوں نے ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج سے ایم۔اے اُردو کیا اور ۱۹۶۴ء میں IER پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس سے 'فرسٹ پیچ' میں ایم۔اے ایجوکیشن کیا)

کہنے لگیں:

''کیا لکھواؤں؟ منتشر سے خیالات ہیں۔''

پھر مختصراً انہوں نے جو کچھ کہا، اس کی ترجمانی محسن نقوی کا یہ شعر کر رہا ہے۔

؎ اسے گنوا کے میں زندہ ہوں اس طرح محسن
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے

۔۔۔اس کے بعد ایک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔

000

ربا میرے حال دا محرم توں (شاہ حسین)

۔۔۔میں نے اس کتاب کو کیسے لکھا؟۔۔۔

یہ میں جانتی ہوں یا میرا ربّ۔۔۔

000

ع نالے اساں ونڈ لئے نے ہنجواں دے ٹبک ٹبک

ڈاکٹر مقبول اختر کے احباب کے مضامین

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

-ڈاکٹر احسان الحق-

جس ہستی کا ذکر میں آج کرنے جا رہا ہوں، سوچتا ہوں نقطۂ آغاز کہاں سے کروں۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ محبت نامہ (Love letter) لکھنا بہت مشکل کام ہے کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کہ شروع کیسے کریں اور ختم کس طرح۔

میری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ مجھے یہ محبت نامہ ایک ایسے محبوب کے نام لکھنا پڑ رہا ہے جو ہم سے۔۔۔ کیسے کہوں؟۔۔۔ کہ۔۔۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے۔ گو کہ وہ میرے دل کے ایک خاص گوشے میں ہر وقت جاگزیں ہے۔ زندہ ہے۔

رفتید و لے نہ از دلِ ما ست

سوچ رہا ہوں کہ کہانی کا آغاز کہاں سے کروں؟

تا سرِ رشتہ ندانم کہ کجا بکشایم

یاد کے دھاگے الجھے ہوئے ہیں اور کوئی سرا نہیں ملتا کہ اس گنجلک کہانی کو کھول

سکوں اور بیان کرسکوں۔

لیکن ایک دوسری بات بھی ہے۔

ے امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے زندگی میں کبھی تنہا محسوس کیا ہے؟
خدانخواستہ۔۔۔ کیا آپ کا کوئی بہت عزیز دوست۔۔۔ جان سے عزیز دوست، آپ سے بچھڑا ہے۔ انگریزی زبان کی ایک مشہور نظم ہے۔ Of in the stilly night جس کا مصنف Thomas Moore ہے۔ اس کا ترجمہ نادر کاکوروی نے اردو زبان میں کیا ہے۔
میں اس کے شروع کے چند اشعار لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کو اپنے درد میں شریک کرسکوں۔

'اکثر شبِ تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
مرے دلِ صد چاک پر،

میں تو یہی دعا کرسکتا ہوں کہ

'ایس تو ڈھاڈا دکھ نہ کوئی
پیار نہ وچھڑے
کسے دا یار نہ وچھڑے

ڈاکٹر مقبول اختر سے میرا پہلا تعارف، نشتر میڈیکل کالج کے ہاسٹل، قاسم ہال

میں ہوا۔ وہ مجھ سے ایک سال آگے تھے اور مقبول اختر موٹا کے نام سے جانے جاتے تھے کہ وہ کچھ فربہ جسم واقع ہوئے تھے۔ بعض اوقات، نشتر کالج میں اصطلاحاً ایسے فربہ اشخاص کو 'پتلا' جیسے مقبول اختر پتلا کے لاحقے سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔
ناموں کی بھی عجیب کہانی ہے۔ ایک مشہور مزاحیہ انگریزی نظم اسی بات پر لکھی گئی ہے مثلاً ایک شعر یوں ہے

Mr. Box has never
twisted his fist

یہ ایسے ہی ہے کہ ماں باپ نے نام تو فہیم رکھ دیا ہے مگر صاحب، دوسروں کی بات سمجھنے سے عاری ہیں۔ عقیل صاحب کا عقل و فہم سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور ہر وقت اپنی ڈفلی بجاتے رہتے ہیں۔
یا اگر نام 'نسیم' ہے تو ان کی باتوں سے خوشبو آنا تو درکنار، لوگ ان سے دور بھاگتے ہیں۔
مگر بعض لوگ، واقعی اسم بامسمّٰی ہوتے ہیں مثلاً ہمارے دوست جان محمد ہمیں جان سے عزیز ہیں۔ اکرام صاحب ہم پر بہت مہربان ہیں اور ریاض صاحب مرحوم کی شگفتگی مثالی تھی۔
ڈاکٹر مقبول اختر کا نام، ان کے والدین نے کسی ایسی شبھ گھڑی میں چنا ہوگا کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں قبولیت کا وقت ہوگا۔
یہ ستارہ ایسا چمکا کہ جہاں گیا، جدھر گیا، اپنی روشنی سے لوگوں کے دل جگمگاتا گیا۔ ان کے دلوں میں نور بھرتا گیا۔ اس کی محفل میں یہ نور اس کے ہم مجلسوں کے چہروں کی روشنی سے عیاں تھا۔
چاہے وہ دانشوروں کی مجلس ہو یا عوامی جلسہ، لکھنے والوں کا حلقہ ہو یا ان پڑھوں کا مجمع۔ ان کی شخصیت کا پرتو اس ستارہ (اختر) کی چمک، ان کی مہربان نظر کی چاندنی۔۔۔

ان کا دلی خلوص، ان کی روشن مسکراہٹ، فاتح عالم محبت کی طرح، ہر دل کو مسخر کر لیتی تھی۔

میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہا۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ان کے مریض بھی، ان کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں کی وجہ سے ان سے بہت خوش تھے اور یہ اُن میں بہت مقبول یعنی اسم بامسمیٰ۔

اسی ضمن میں بیان کردوں کہ اپنا پروفیشنل کام بہت لگن اور محنت سے کرتے تھے۔ دوائیں کم سے کم استعمال کرتے۔ مریض کی بہت دل داری کرتے۔ اس کی مالی حالت کے مطابق نسخہ تجویز کرتے۔ ان کا بہت سا کام فی سبیل اللہ تھا اور وہ مریضوں کے شکریہ یا محض ایک احسان مند نظر پر قانع تھے۔ بعض اوقات ادویہ بھی بغیر معاوضہ عنایت فرماتے۔

اس سب سے بڑھ کر ان کی طرف سے ہمدردی کے دو بول اور مہربان نظریں، مریضوں کے پوشیدہ، دل کے زخموں پر مرہم ثابت ہوتیں۔ ان کی باتوں کے پھول اور زبان کی شیرینی، ہر سو ایک خوشبو بکھیرتے اور کانوں میں رس گھولتے۔

ان کا مدھم لہجہ، ان کی سدا بہار مسکراہٹ، ان کی ہمدرد نظر کی چاندنی، ماحول میں ایسی ٹھنڈک بھر دیتے تھے جو طراوتِ جاں کا باعث ہوتی تھی اور مریض ان کی شخصیت کے حصار اور موجودگی کے احساس ہی سے سرشار ہو کر بہتر محسوس کرتا تھا۔

امیر خسرو، اپنے والد صاحب کے متعلق رقمطراز ہیں (امیر خسرو کے والد ترکی النسل تھے۔)

''کہاوت ہے کہ ترک خواب میں ہی فرشتہ ہو سکتا ہے مگر وہ عالم بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔''

میں ڈاکٹر مقبول اختر کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ فرشتہ سیرت تھے۔ وہ انسان کے روپ میں بھگوان تھے، جیسا کہ ہمارے ہمسائے میں لوگ کہتے ہیں۔ وہ مخلوق خدا کے لیے اپنے دل میں درد رکھتے تھے اور ان کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار

رہتے تھے۔ مریضوں کی مدد، ان کی دل جوئی اور ان کے درد کو اپنا درد محسوس کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے لیے صحیح پیشے کا انتخاب کیا تھا، یعنی جب انھوں نے سائیکاٹری کو بطور اختصاص (Speciality) کے چنا۔ ایک ماہر نفسیات کے لیے سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ مریض کا درد محسوس کرلے۔ خاص طور پر جب مریض کا زخم بیرونی نہیں بلکہ اندرونی ہو۔ یعنی اس کا دِل داغ داغ ہو اور وہ نفسیاتی طور پر زخمی ہو۔

ڈاکٹر صاحب، دوا سے زیادہ، مریض سے بات چیت، گفتگو، تحلیل نفسی اور مریض کو خود اپنا تجزیہ کرنے کی ترغیب دے کر علاج کرنے کے قائل تھے۔

ان کے مریض، ان کو اپنے کام میں صحیح متخصص اور مکمل طاق مانتے تھے۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا کہ وہ واقعی فرشتہ سیرت تھے۔ ان کے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ رہتی تھی۔ کیسی بھی مشکل ہوتی کتنی بھی اداسی ہوتی ان کی Signature smile (شخصی امتیاز یعنی دائمی مسکراہٹ) کبھی غائب نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ آخری بیماری اور آخری دنوں میں بھی ان کا سدا مسکراتا ہوا چہرہ آپ کا استقبال کرتا۔ ان کے جانے سے ایک روز پہلے، میں ان کا معائنہ کرکے، ساتھ والے کمرے میں بہت اُداس اور غمگین بیٹھا تھا کہ انھوں نے مجھے بلوا بھیجا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ ان کے پاس دوبارہ جاؤں میں نے ان کی بہن منزہ سے کہا کہ ابھی آتا ہوں۔ انھوں نے دوبارہ اصرار کرکے بلایا۔ میں اندر آیا تو وہی مسکراتا ہوا چہرہ مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ میں قریب گیا تو میرا ہاتھ پکڑ کر محبت سے خوب دبایا اور مسکراتے ہوئے کہا:

''سر جی، تھینک یو ویری مچ''

(Sir G, thank you very much)

مجھے یقین ہے کہ جب اپنے خالق حقیقی سے ملے ہوں گے تو کہا ہوگا۔

''کی حال اے سر جی؟ تھینک یو ویری مچ)

ان کا Sense of humour یعنی حسِ مزاح، ان کی شخصیت کا سب سے حسین اور امتیازی پہلو تھا کیا خوب طریقے سے معمول کی باتوں میں مزاحیہ عنصر کی نشان دہی کرتے اور حاضرین کے سامنے لاتے کہ محفل کشتِ زعفران بن جاتی۔ کیونکہ ان کا ہنسنا اور مسکرانا Infectious تھا۔

وہ دنیا کو خوبیوں اور نقائص کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ اگر کہیں کوئی عیب نظر آتا تو کہتے It is a funny world اس کو ایسے ہی دیکھنا چاہئے اور enjoy کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ہمہ گیر اور ہفت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ایک ڈاکٹر اور Specialist Psychiatrist بھی تھے اور نفسیات کے اعتبار سے Psychoanalist بھی۔ علاوہ ازیں ان کو فلسفہ میں خاصی دسترس حاصل تھی۔ خاص طور پر مارکسزم، سوشلزم اور تاریخی مادیت کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا بلکہ اس سارے فلسفہ کو ایسے گھوٹ کر پی لیا تھا کہ وہ آسانی سے اس کے تعلق سے پاکستان کے موجودہ حالات پر اس کی تطبیق کرتے تھے۔ اس طرح وہ پاکستان مزدور کسان پارٹی کے نظریہ دان کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ اپنی پارٹی کے دانشور اور ایک عام کارکن کے طور پر نچلی سطح پر عامتہ الناس کے ساتھ مل کر کام کرنے والے کامریڈ تھے۔ ان کی یہ حیثیت بھی ان کی طرح دار شخصیت کا حصہ تھی۔

علاوہ ازیں، وہ ایک مشہور و معروف، ادبی حلقوں میں جانے پہچانے ادیب تھے۔ وہ پنجابی زبان میں نثر اور نظم لکھتے تھے اور اردو زبان میں بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ انگریزی زبان کے بہت اچھے لکھنے والے تھے اور ان کی اس قابلیت کا لوہا مشہور زمانہ رسالہ Out Look کے ایڈیٹر برنی صاحب نے بھی مانا اور وہ خط خود میں نے بھی پڑھا ہے جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تعریف میں لکھا تھا۔

☆ (افسوس کہ بے انتہا کوشش کے باوجود، ڈاکٹر مقبول اختر کے بہت سے مضامین Out Look اور پارٹی سرکلر میں شائع شدہ) دستیاب نہ ہوسکے اور انہیں محفوظ نہ کیا جاسکا۔ مصنف)

برنی صاحب نے لکھا تھا:

''مجھے پتا نہیں کہ آپ کتنے اچھے ڈاکٹر ہیں لیکن یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ انگریزی زبان کے بہت اچھے لکھک ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ لکھنے کا کام جاری رکھیں گے۔''

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب عربی زبان کے اشعار اکثر Quote کرتے۔ فارسی تو گویا ان کی دوسری زبان تھی اور فارسی زبان کے شعرا حافظ، مولانا روم، سعدی اور اقبال کا بآسانی اور فراوانی سے حوالہ دیتے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہفت زبان تو نہ تھے مگر پانچ زبانوں میں کافی دسترس رکھتے تھے اور ان زبانوں کے ادب سے خوب واقف تھے اور انگریزی، اردو اور پنجابی کے جانے پہچانے ادیب تھے۔

میں نے کہیں پڑھا ہے کہ مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری (جنہیں منٹو نے اپنی کتاب 'گنجے فرشتے میں رنڈیوں کا پیر' سے تشبیہ دی ہے۔۔۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے) جو اردو کے شیکسپیئر کا درجہ رکھتے ہیں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شیریں زبان کے متعلق ایک مرتبہ فرمایا کہ:

''مولانا بولتے کیا تھے، کانوں میں رس گلے نچوڑتے تھے۔''

یہ یاد رہے کہ دونوں صاحبان کسی زمانے میں کلکتہ میں رہے تھے اور یقیناً بنگالی رس گلوں سے محظوظ ہوئے ہوں گے۔

اپنے ڈاکٹر مقبول صاحب بھی بہت شیریں دہن اور زیبا کلام تھے۔ ان کی برجستگی اور بے ساختگی ان کے اندازِ گفتگو میں ایک خاص شیرینی اور چاشنی بھر دیتی تھی۔ ہمارے کانوں نے بھی ان 'رس گلوں' کا مزا چکھا ہے۔ ان کی باتوں میں محسوس کیا ہے اور ان کی سدا بہار مسکراہٹ اس سب کا مزا دوبالا کر دیتی تھی۔

ان کی صحبت، ان کی محفل ایک عجیب کیفیت رکھتی تھی جس میں علم وادب، نظم ونثر، فلسفہ اور تاریخ سب مل کر ایک ایسا رنگا رنگ گلدستۂ نیرنگِ خیال پیش کرتے تھے کہ ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ منظر تادیر موجود رہے۔

آزردہ زمن حال شب وصل چہ پرسی
نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

(آزردہ تو مجھے اس ملاقات (وصل) شب کا حال کیا پوچھتا ہے۔ نہ دل کو میری خبر تھی اور نہ مجھے دل کی)

جب کبھی ان کے ساتھ مرحوم رانا ارشاد احمد خاں موجود ہوتے تو ایک اور ہی سماں بندھ جاتا۔ پروفیسر ارشاد صاحب بہت بڑے عالم، وسیع مطالعہ رکھنے والے، اردو اور انگریزی ادب کے ماہر اُستاد، فارسی میں یکتا، فارسی کلاسیک، حافظ، سعدی اور مولانا روم نہ صرف پڑھے ہوئے بلکہ ''گُڑھے'' ہوئے فلسفہ اور دنیا کی تاریخ کے شناور اور صوفی ازم کے رازدان اور پنجابی لٹریچر کے غواص تھے اور ادھر ڈاکٹر صاحب جو خود اردو، پنجابی اور انگریزی کے ادیب تھے، شاعری بھی کرتے تھے اور مارکسسٹ فلسفہ اور تاریخی مادیت اور جدلیات کے ماہر اور پھر عملی مارکسسٹ تھے۔ علاوہ ازیں حالیہ تاریخ اور حالاتِ حاضرہ پر ایک مخصوص زاویہ سے تعقلاتی تجزیہ کار اور اپنے سائنسی پس منظر کی بنا پر زندگی کے لیے ایک Rational Approach رکھتے تھے۔

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ان دوستوں کی محفل کیسی ہوگی اور کس سطح کی گفتگو ہوتی ہوگی اور توسنِ خیال کو کیا کیا مہمیز کا کام کرتی ہوگی۔

وہ جو فیض نے لکھا ہے:

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے

وہ لکھا تو کسی اور پس منظر میں ہے مگر میں نے آپ کو جس محفل کا آئینہ دکھایا ہے

یقیناً ان دو دریا ساگر قسم کے لوگوں کی موجودگی میں یہ محسوس کیا جاسکتا تھا کہ آپ خیال کی رتھ پر بیٹھ کر علم کے سمندر یا دریا کے ساگر کی ایال تھامے ایک ماورائی اور Ethereal سفر پر رواں ہیں۔

اور یہ سفر آپ پر علم اور شعور کے نئے راستے کھولتا ہے۔ ایک نئی روحانی روشنی سے روشناس کرواتا ہے اور ایک نئی دنیا کا پتا دیتا ہے۔ جہاں محبت اور دلداری، انسانیت نوازی اکرام اور احسان کی بارش اور احساس اور ہمدردی کی شدت، دوسروں کے غم کو اپنا محسوس کرنے کی صلاحیت، آدمی کی زندگی کے جزوِ لاینفک ہیں۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان اجزا کی موجودگی میں زندگی کیسی سہل، رومان پرور اور محبت سے بھرپور ہوگی اب تو یہ محفلیں خواب لگتی ہیں لیکن ان کا نشہ اب تک باقی ہے۔

لبت در خواب می بوسیدم امشب بوالعجب کاری
کہ مے در خواب خوردم این زماں ہستم بہ بیداری

(ترے لب تو میں نے خواب میں چومے تھے لیکن کیسا عجیب معاملہ ہے کہ مے تو خواب میں پی تھی لیکن نشہ ہنوز عالم بیداری میں چھایا ہوا ہے)

ہم جیسے لوگ جو وہاں موجود ہوتے اور ان کی گفتگو سے محظوظ ہو رہے ہوتے، کبھی کبھار محسوس کرتے کہ گو کہ بات تو مختصر ہوتی مگر اس مجلس کو جاری رکھنے کی غرض سے یا لطفِ صحبت کو دوبالا کرنے کے لیے، ایک نئی گفتگو شروع ہو جاتی اور کیفیت یہ ہوتی کہ:

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہاں را
من از ذوقِ حضوری طول دارم داستانے را

کم از کم ہماری حالت یہی ہوتی اور خواہش یہ ہوتی کہ ان دو دریاؤں کا سنگم اور روانی سے بہتا رہے اور ہمارے ذوقِ حضوری کی تسکین ہوتی رہے۔

اور بعض اوقات جب کبھی الوہی عشق کی بات چلتی تو الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا۔

یعنی زبان، احوال کا ساتھ نہ دے سکتی۔

؎ زبان زنکتہ فرو ماند و راز من باقسیت
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقسیت

اور خاموشی زبان بن جاتی۔

عشق کہ مرداں کشد، سفلہ نہ جوید حریف

یا:

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

عشق اپنے طلب گاروں سے، اپنے ماننے والوں سے قربانی مانگتا ہے۔ قربانی بھی کیسی؟ دل و جان کی، تمام صلاحیتوں کی حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی عزیز تر۔۔۔ اپنے بچوں کی، ان کی خواہشات کی، ان کی امنگوں کی۔ جو شخص ایسے عشق میں مبتلا ہو اس کی زندگی کی سادگی اور رنگینی کے کیا کہنے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ایسے ہی عشق میں مبتلا تھے۔ وہ سیاسی طور پر جاں نثاری اور جان سپاری سے کام کرنے والے تھے۔ انہوں نے ساری عمر، سوشلزم اور مارکسزم کی تحریک میں گذاری اور دامے، درمے، سخنے، اس کی خدمت میں تندہی سے مصروف رہے۔

ایک دفعہ مجھے بتایا کہ ان کی بیگم صاحبہ نے ان سے کہا کہ توجہ سے اپنی پریکٹس کریں اور اس سیاسی اور سوشلسٹ تحریک اور مزدور کسان پارٹی کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ دیکھیں آپ کی تین بچیاں ہیں ان کے لیے کچھ کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں جو کام کر رہا ہوں وہ قوم کی تمام بیٹیوں کے لیے کر رہا ہوں اور میرے خیال میں یہ بہتر ہے۔ بہ نسبت اس بات کے کہ صرف اپنی ہی بیٹیوں کی قسمت سنوارنے کے لیے کام کروں۔

ان کی سوچ، ان کے خیال، ان کی محبت کا محور، قوم و ملک تھے اور ان کو سنوارنا، ان کا مقصد۔ ان کے طریقہ کار سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے اعلیٰ نصب العین

سے کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔

پاکستان میں مارکسزم، سوشلزم کی تحریک کی کہانی بہت عجیب و غریب ہے۔ یہاں ایک بنجر اور بے آب و گیاہ، ذہنی بیابان تھا۔ جب پاکستان بنا تو اس ملک میں تعلیم بہت کم تھی۔ لوگوں کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ تھی، تعلیمی ادارے بہت کم تھے اور ملک میں صرف ایک یا دو یونیورسٹیاں تھیں۔ انڈسٹری نہ ہونے کے برابر تھی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان ملا کر صرف دو ٹیکسٹائل ملیں، لائل پور اور اوکاڑہ میں قائم تھیں۔ ایک یا دو چھوٹے سائز کی شوگر ملیں اور چند جننگ فیکٹریز اور آئیل Expeller اور بس۔

دوسرے لفظوں میں صنعتی مزدوروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی اور ایسا گروہ جس کو Target کر کے مزدور تحریک کو منظم کرنا تھا، موجود ہی نہ تھا۔ نتیجتاً مارکسزم کا بنیادی کام، مزدوروں کی تعلیم و تنظیم ممکن ہی نہ تھا اور یہی طبقہ انقلاب کا ہراول دستہ ہوتا ہے۔

دوسری طرف سوسائٹی ایک بہت بڑے Upheavel (اتھل پتھل) کا شکار تھی۔ تبادلہ آبادی بہت بڑے پیمانے پر ہوا۔ خاص طور سے مشرقی پنجاب سے کیونکہ انگریز نے بے ایمانی سے دو تین مسلم اکثریتی اضلاع انڈیا کو دے دیے (دیکھیے Sir Redcliff کے اسسٹنٹ کی یادداشتیں جو حال ہی میں اخبارات میں چھپی ہیں۔ علاوہ ازیں چوہدری محمد علی کی کتاب Road to Pakistan)

محدود مواقع، محدود ذرائع آمدن اور ملک اور لوگوں کی معاشی کمزوری، سیاسی ابتری۔ یہ سب عوامل، طویل مشکل معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کی نشان دہی کر رہے تھے۔ معاشرتی طور پر ہماری سوسائٹی کا ایک بہت بڑا حصہ پانچ ہزار سالہ پرانے قبائلی طرز پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ طرز معاشرت صوبہ سرحد اور بلوچستان میں تو اکثریت کا تھا۔ سندھ کا بہت بڑا حصہ اور پنجاب اور مشرقی پاکستان میں بھی کافی بڑی Tribal belts تھیں۔ پنجاب میں خاصے بڑے اور مشرقی پاکستان میں نسبتاً چھوٹے قبائلی علاقے تھے۔

سوسائٹی کے عمودی اختلافات، سنی، اہلِ حدیث، دیوبندی، شیعہ وغیرہ کی فرقہ بندیاں اور ذات پات اور Caste System کے بندھن، اس سوسائٹی کے ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث تھے اور مستقبل میں بھی سوسائٹی کو آگے کی طرف بڑھنے سے روکنے اور اسے ایک حالتِ جمود میں رکھنے کا عمل سرانجام دینے والے تھے۔

اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے سیاسی قیادت از فرق تا قدم مفقود تھی۔ ایک نئی قائم شدہ مملکت کے تقاضوں کے برخلاف بیوروکریسی اور دوسرے ادارے بہت کمزور اور بے ایمان تھے اور اس نئی افتاد کے لیے بالکل نااہل، ناقص اور نامکمل۔

سیاسی قوتیں موجود تو تھیں مگر ان میں قومی ڈھانچہ کسی میں بھی موجود نہ تھا۔ حکومتی جماعت کی ساخت اور پرداخت ابتدائی نوعیت کی تھی۔ اختلافِ رائے کو غداری پر محمول کیا جانا روزمرہ کا نعرہ تھا۔ ان کی سوچ اتنی ناقص تھی کہ وہ اپنی حکومت کو سرکار، دولت مدار کے مترادف گردانتے تھے۔

ان حالات میں کسی بھی بائیں بازو کی سوچ کا پنپنا کتنی مشکل بات ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ پاکستان میں سوشلزم اور مارکسزم کا جھنڈا اٹھا کر چلے، ان پر روسی اور ہندوستانی ایجنٹ کا لیبل لگا دیا گیا۔ ان میں سے چند واقعی، پاکستان کی قومی سوچ (جو ابھی تک تشکیلی مرحلے میں تھی) سے متفق نہیں تھے یا وہ اس کو اختیار نہ کر سکے۔ لیکن ان میں کچھ بہت بڑے لوگ بھی تھے جو اپنا سب کچھ تج کر، آرام کی زندگی چھوڑ کر، مزدوروں میں کام کرنے، ان کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان مزدوروں کے علاقوں میں رہ کر ان کو تعلیم دینے کا کام کرنے والے تھے۔ یہ مخلص کارکن بہت کم تعداد میں تھے اور حکومت ہمہ وقت ان کو زیرِ نگراں رکھتی تھی اور ہراساں کرتی رہتی تھی۔ گو کہ یہ Dedicated لوگ ان مشکلات میں اپنا کام بہر صورت جاری رکھے ہوئے تھے۔ مگر ان کی کم تعداد اور معروضی صورتِ حال ایک بہت کٹھن، طویل اور مشکلات سے بھرپور جدوجہد

کی نشان دہی کر رہی تھی۔

مندرجہ بالا بہت سے عناصر، سوشلسٹ تحریک کی اٹھان سے پیشتر ہی اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے میں اپنا رول ادا کرنے والے تھے۔

ان حوصلہ شکن حالات اور معروضی تجزیہ کے بعد، ان گنت مشکلات کے باوجود بائیں بازو کی تحریک کو جاری رکھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے مواقع پیدا کرنے میں جاں نثار کارکنوں نے انتھک کام کیا اور حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔ انہی میں ڈاکٹر مقبول کا نام بھی شامل ہے۔ وہ اس سوشلسٹ تحریک کے کارکن اور اس قبیلہ سرفروشاں کے رکن رکین تھے۔

بہر صورت معاملات اتنے آسان نہ تھے اور کارکن بھی کمیتی اور کیفیتی لحاظ سے کافی کمزور تھے۔ یہ حالات پاکستان میں جاری تھے کہ مارشل لاؤں کی یلغار شروع ہوگئی اور انہوں نے سیاسی عمل کو روک کر برادری ازم، فرقہ پرستی اور قبائلی اختلافات کو ہوا دی جس سے اصولی سیاسی اور افقی تضادات کا عمل کمزور ہوا۔ یہ حالات تھے جب ۱۹۶۰ء کی دہائی میں میجر اسحاق محمد نے مزدور کسان پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔

ڈاکٹر مقبول اختر ۱۹۶۳ء میں نشتر میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے کچھ عرصہ کے بعد ۱۹۶۴ء میں مسقط چلے گئے اور وہاں سے ۱۹۶۶ء میں واپس آئے۔ وہاں سے کچھ پیسہ لائے تھے جسے اپنے والد صاحب کو مکان بنانے کے لیے دے دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے میجر اسحاق کے ساتھ مل کر پارٹی کا کام شروع کر دیا اور ان کے ساتھ ایک Committed ورکر کے طور پر شامل ہوگئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد، ان کو پارٹی کارکنوں کی تربیت، تعلیم اور پارٹی سرکلر کی تدوین، تالیف اور اشاعت کا کام سونپ دیا گیا۔ جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ ان کی ادارت کے دوران پارٹی سرکلر باقاعدہ شائع ہوتا تھا اور اس میں بلند پایہ مضامین تجزیے اور اداریے چھپتے تھے۔ قارئین کی رائے، بحث مباحثہ اور باقاعدہ نکتہ چینی اور خود احتسابی سرکلر کو ایک جیتی جاگتی اور زندہ دل

دستاویز بناتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی خوش طبعی ان کی عادت کا خاصہ تھی۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہ کرتے بلکہ الفاظ کے علاوہ ان کی حرکات وسکنات سے بھی کسی کی دل شکنی کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی ظاہر ہوتی۔ اگر محفل میں کسی نے کوئی شعر غلط پڑھ دیا یا لفظ غلط استعمال ہو گیا تو فوری غلطی نہ پکڑتے۔ اوزان و بحور پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ خاص طور پر شعر کو وزن کے مطابق مصرعوں میں الفاظ کی نشست صحیح رکھتے۔ بہت مرتبہ تجربہ ہوا۔ جب ان سے شعر کے متعلق درخواست کی تو بہت سلیقے سے اساتذہ کے اشعار برمحل پڑھ دیتے۔ میری فارسی کی شدھ بدھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ میں نے سکول کے زمانے میں فارسی کی بجائے عربی پڑی تھی۔ (جی ہاں ایک وقت تھا جب سکولوں میں فارسی کی تعلیم باقاعدہ نصاب میں شامل تھی) میں کبھی کبھی کسی فارسی شعر کا متن، ان سے اُردو میں بیان کرتا تو فوراً فارسی شعر عنایت فرماتے بلکہ بعض اوقات ہم معنی عربی، اردو یا پنجابی کا شعر بھی سنا دیتے۔

ان کی اردو اور پنجابی میں استعداد تو کافی مشہور ہے کیونکہ وہ ان دونوں زبانوں میں نثر بھی لکھتے تھے اور باقاعدہ شاعری بھی کرتے تھے اور ادبی حلقوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی عربی زبان میں استعداد اور فارسی پر دسترس ہمارے حلقہ دوستاں میں بہت معروف تھی۔ خاص طور پر فارسی میں حافظ، مولانا روم، سعدی، اقبال اور دوسرے اساتذہ کے اشعار از بر تھے اور موقع بہ موقع، ان اشعار کا برمحل استعمال ان کی تحریر اور تقریر دونوں کو نہایت دلپذیر بنا دیتا تھا۔ جیسے کہتے ہیں نا کہ وہ ان اشعار کو اپنی گفتگو میں نگینے کی طرح جڑ دیتے تھے۔

ان کو گفتگو کا فن خوب آتا تھا۔ دوسرا شخص سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب صرف اس کی باتیں سننے کے لیے آئے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور نہایت سادگی، دلبستگی اور انہماک سے سن رہے ہیں لیکن جب محفل برخاست ہوتی تو وہ شخص سراپا سپاس ہوتا کہ وہ

ڈاکٹر صاحب سے بہت کچھ سیکھ کر اٹھا ہے اور دوسری ملاقات کا جویا ہوتا، بلکہ کچے دھاگے سے کھنچا چلا آتا اور جو کیفیت ہوتی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ 'کہا کیے اور ہم سنا کیے۔' والی ہوتی۔ بہ الفاظِ فراز:

ے سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

باتیں تو بہت کرنے کی ہیں، یادوں کی کڑیاں ملتی جا رہی ہیں، مگر دل کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ اب تک دل کے آئینہ میں نقش ہے اور یوں لگتا ہے کہ ابھی آ موجود ہوں گے اور کہیں گے۔

"کی حال اے؟ سر جی!"

ے داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی "تھی" سو وہ بھی خموش ہے

اور

ے ہر ایک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

ان کی زندگی کا عکس اس شعر میں موجود ہے۔

ے ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار خاطر نہیں ہے

○○○

-محمد ادریس-

دبا کے قبر میں سب چل دیئے دُعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو (قمر جلالوی)

یہ 1967ء کی بات ہے کہ میرا تعارف جناب ڈاکٹر مقبول اختر سے ہوا۔ دُکھ یا تکلیف کسی درجہ کی ہو، ڈاکٹر کو میں نے ہمیشہ مسکراتا پایا۔ انھوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ غموں میں گزارا مگر دُکھ عیاں نہ کیا۔ ان دنوں لائل پور کچہری بازار میں ایسٹرن میڈیکوز کے نام سے ادویات کی ایک دوکان تھی جواب بھی ہے۔ ایسٹرن میڈیکوز کے مالک محمد اسلم قریشی صاحب ڈاکٹر کہلاتے تھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسلم صاحب میں وہ کیا مقناطیسیت تھی جو پڑھے لکھے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ اسلم صاحب بڑے تھے اور اکثر دوستوں کے بڑے چھوٹے کام میں ان کا مشورہ مفت ہوتا تھا مشاورتی حوالہ سے شادی بیاہ کے معاملہ میں اسلم صاحب کی خاص پہچان تھی۔ اسلم صاحب کا حوالہ بہت ضروری تھا کیونکہ یہ میرے اور ڈاکٹر مقبول اختر کے تعلق کا اصل سبب تھے۔

ڈاکٹر مقبول اختر کی ملاقات کے ساتھ اس بات کا بھی علم ہوا کہ وہ گلبرگ میں شام کو کلینک کرتے ہیں جب کہ صبح محمدی فاؤنڈیشن میں فری ڈسپنسری میں وقت دیتے ہیں پھر ان

سے ہمارے تعلقات بڑھتے چلے گئے اکثر اوقات محمدی فاؤنڈیشن میں جا کر ان سے ملنا، شام کو کلینک پر ملنا اور اس سے بڑھ کر مقبول فیملی سے ایسا تعلق ہو گیا کہ شیر سنگھ والا ہماری فیملی کا جانا ایک معمول بن گیا تھا اور اسی طرح ڈاکٹر کی فیملی کا شاید سب سے زیادہ ہم سے تعلق تھا۔

ڈاکٹر مقبول اختر سے تعلق ان کی ''دانشوری'' نہ تھی وہ پیار کرنے والے اور دُکھ درد بانٹنے والے ایک اہم ساتھی تھے۔ ڈاکٹر مقبول نے کئی سال لگاتار ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلی اور ہمارے کلب کے صدر بھی رہے۔ ان کے احسانات جو ہم پر رہے وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ ذاتی طور پر ڈاکٹر مقبول اختر نے میری اس خواہش کو قابل بنا کر چھوڑا کہ میں ایک ''معیاری'' کرکٹ کمنٹیٹر بن گیا۔ ڈاکٹر مقبول اختر اور ڈاکٹر احسان الحق نے میرے کرکٹ کمنٹیٹر بننے میں مفید مشورے دیئے اور کمنٹری سن کر اس کی اصلاح بھی کی۔ ہم جیسے بے قد لوگوں کو دراصل ڈاکٹر مقبول اختر کے اصل قد کا علم نہ تھا۔ ان کے عالم ہونے کا احساس اُن محفلوں میں روشن ہوا جن میں ڈاکٹر احسان الحق، پروفیسر رانا ارشاد اور پروفیسر اشفاق بخاری شامل ہوتے تھے۔ پھر پاکستان کے بڑے اخباروں میں ڈاکٹر مقبول اختر کے کالم شائع ہونے لگے جو دوستوں کو خوشی سے فراہم کرتے تھے۔ ''قومی تشخص کا بحران'' حلقہ اربابِ ذوق لاہور میں پیش کیا۔ بڑی داد ملی جس عرق ریزی سے ڈاکٹر مقبول اختر نے یہ مضمون تخلیق کیا تھا۔ اس کی پورے پاکستان میں پذیرائی ہوئی۔ Burney صاحب جو ڈان کے ایڈیٹر تھے انھوں نے ایک خط میں اُن کی صلاحیت کا اس طرح اعتراف کیا کہ میں نہیں جانتا کہ آپ اپنے اصل شعبہ خدمت میں یعنی ڈاکٹروں میں کیسے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ آپ سے اچھا میں نے کسی کو انگریزی میں مضمون لکھتے کم ہی دیکھا ہے۔ ڈاکٹری میں دُشواری ہو تو ''لکھنے والے'' کی حیثیت سے آپ کی ہمیشہ مانگ ہے۔

یہ کتنی اطمینان کی بات ہے کہ ڈاکٹر مقبول اختر کے توسط سے اچھے اچھے صاحب علم لوگوں سے تعارف ہوتا رہا۔ اُردو، انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، پنجابی میں

زبان وبیان کی ''صحت'' کا ٹھیک علم حاصل کرنا ہو تو بڑے اعتماد سے آپ ان سے رجوع کر سکتے تھے۔ یہ بات بہت اچھے تعلقات ہونے کے باوجود ''طے'' تھی کہ وہ جس نظامِ معیشت کو دیکھنا چاہتے تھے اس سے نالائق طالب علم کی حیثیت سے میرا کوئی تعلق نہ تھا میں نے ان کے بہت قریب ہو کر بھی مزدور کسان پارٹی کی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔

ڈاکٹر مقبول اختر کا جب برین ہیمرج ہوا، اور ان کے بولنے، سننے کی صلاحیت متاثر ہوئی وہ بڑا تکلیف دہ دور تھا ایک ایسا شخص جو ہر محفل کی جان اور بہت کام کرنے والا تھا وہ مجبور اور بے بس ہو کر رہ گیا۔ اسی دوران میں اپنی بیگم کے ہمراہ اپنی بیٹیوں کے پاس کینیڈا چلا گیا اور میں اُن کے آخری وقت اور آخری رسومات میں شامل نہ ہوسکا، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔

خدا ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے۔ آمین

ooo

ڈاکٹر مقبول اختر

-سیّد افسر ساجد-

ڈاکٹر مقبول اختر ایک مہذب انسان اور بالغ نظر ادیب و ناقد تھے۔ ڈاکٹری کے پیشے سے وابستگی کے باوصف وہ ادبی سرگرمیوں کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ ڈاکٹری میں بھی انہوں نے سایکاٹری جیسے چیلنجنگ شعبے کو بطور پروفیشن اپنایا۔ یہ ان کی مہم جو طبع کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کے تنقیدی رجحانات اگرچہ انقلابی نوعیت کے تھے لیکن وہ اپنے قلم کی جولانی کو 'حدِ ادب' سے متجاوز نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ ادب میں جدت تنوع اور نظریہ سازی کے پرزور پرچارک تھے۔

ڈاکٹر موصوف سے اگرچہ راقم کا Interaction اتنا زیادہ نہ تھا، لیکن ہم ایک دوسرے کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ وہ انسانی قدروں کے بے حد فعال علم بردار تھے۔ ادبی محافل میں اکثر بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے اور مباحث میں ان کا رویہ جوش اور ہوش کے خوبصورت اعتدال پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ ادبی اور سماجی تقریبات کی جان تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر

ایک باا‌ثر مگر انتہائی شریف خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ خوش خلقی، خوش گفتاری اور خوش لباسی، ان کی ذات کا اختصاص تھا۔ ان کو ادب کی خاص سوجھ بوجھ اور پرکھ تھی۔ اپنی ہمشیرہ منزہ سلیم کی دل جوئی اور ادبی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

موت برحق ہے، لیکن ڈاکٹر مقبول اختر کی موت نے فیصل آباد کی ادبی زندگی میں جو خلا پیدا کر دیا ہے شاید اسے برسوں پُر نہ کیا جا سکے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

OOO

A Tribute to Dr. Nana

–Asbah Asim–

میری دس سالہ بڑی نواسی اصبح عاصم نے اپنے ڈاکٹر نانا کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور مجھ سے بہتر انداز اور بہتر الفاظ میں انہیں Portray کیا ہے۔ (مصنفہ)

His voice was like music in my head,
His smile was like a healing medicine on the heart,
But this world never let him hold on tight,
In other words this is life,
He did'nt get a second chance to hold everyones hand;
Kiss their head and hug them once again,
Now he is the past that we can't forget,
For he is in our heart, like the first ray of light in the morining,
The first drop of rain, the first flower of spring and the last of autumn,
He was like the kiss of a mother on a child's head when he can't sleep,
The hug of a father when a daughter is scared; He was like warm love,
If anyone asks me what I would wish, if, I had one,
I would wish him to be happy,
And ask Allah to give him a place in heaven, for he deserved it.

OOO

Dr Maqbool Akhtar
A Scintillating Personality

–Brig Asif Haroon–

I met Dr Maqbool Akhtar for the first time in February 1998 on the occasion of marriage of his niece Hania, daughter of Munaza Salim, at Faisalabad. I had gone there since DrMaqbool and Munaza are close relations of my wife. My wife used to talk a lot about him. In her view he was exceptionally intelligent, literary, forgiving, well dressed, friendly and handsome person. He had specialized in psychiatry.

I remember, on our very first meeting, within no time Maqbool sahib made me at home. I found him to be open hearted, jovial and a scintillating personality, and above all very knowledgeable, kindhearted and humane. He was very popular in the whole family irrespective of age group and was well respected. He had a positive

approach towards life and loved his wife, children and his brothers and sisters. He fitted into the picture drawn by my wife. He impressed me a lot.

I met him one more time in person,otherwise we occasionally used to talk to each other on phone. I was deeply saddened to hear the news of his death. Owing to his sterling qualities of head and heart, he will be fondly remembered by all those who were very close to him as well as his acquaintances.

I pray for the departed and also pray that may Allah grant strength to his family members to bear this irreparable loss.

I commend Munazza for writing a book in memory of her late brother DrMaqbool. It manifests her emotional attachment with her brother.

ooo

"ماما جی" "دا" "بولی"

—چوہدری طفیل محمد (ماموں)—

(یہ میرے آخری حیات ماموں ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ یہ میجر اسحاق صاحب سے چھوٹے ہیں۔ مصنفہ)

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پھر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

انسان جب دنیا سے چلا جاتا ہے تو اس کی باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس کی یادیں پل پل خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ ہمارے درمیان سے ایک بہت محبت کرنے والا انسان چلا گیا ہے۔ وہ میرا بھانجا تھا، میری سب سے بڑی بہن کا بیٹا 'ڈاکٹر مقبول اختر' میرا بہت ہی لاڈلا بھانجا۔۔۔ میرا 'بولی' جس کی باتوں اور یادوں کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

مقبول یوں تو سب ہی سے محبت کرتا تھا مگر مجھ سے اس کو ایک خاص انسیت تھی۔

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے میں اور میرا چھوٹا بھائی فتح محمد (ڈاکٹر فتح محمد چوہدری

سابق پرنسپل پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد) لاہور، بی بی جی (والدہ ڈاکٹر مقبول اختر) کے پاس گئے ہوئے تھے۔ مجھے اگلی صبح واپس گاؤں جانا تھا۔ میں نے رات کو ہی بھائی صاحب (والد ڈاکٹر مقبول اختر) اور بی بی جی سے واپسی کی اجازت لے لی تھی۔ مقبول بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔ چپکے سے ہماری باتیں سنتا رہا۔ رات کو میرے ساتھ ہی سویا۔ میں نے بھائی فتح محمد سے شام کو ہی کہہ دیا کہ جب صبح میں اُٹھوں تو میرے بستر پر مقبول کے ساتھ لیٹ جائیں، تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ مجھے صبح جلدی اٹھنا تھا کیونکہ گاڑی فجر کی اذان سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے روانہ ہوتی تھی۔

صبح تہجد کے وقت میں اُٹھا اور بھائی فتح محمد کو اشارے سے بلایا لیکن جیسے ہی میں اٹھا، مقبول بھی جاگ گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا:

"ماما جی"

اس کے لہجے میں جو محبت چاشنی اور تڑپ تھی مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا اور اسے ساتھ لے کر سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ گاڑی آنے تک پلیٹ فارم پر بیٹھا میں اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں سنتا رہا گاڑی نے ہمیں سورج نکلنے سے پہلے کرتار پور پہنچا دیا۔ سٹیشن سے گاؤں تک کا پیدل راستہ تھا۔۔۔ ریتلا۔ میں نے مقبول کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور وہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔

"ماما جی، دیکھیں نا، ادھر اتنے درخت ہیں اور ادھر اتنے۔"

اور پتا ہی نہ چلا، کب ہم گھر پہنچ گئے۔

مقبول، بچپن ہی سے بہت خوددار تھا۔ آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

بڑے بھائی صاحب (چوہدری غلام رسول، والد مقبول اختر) چھٹیوں میں بچوں کو میرے پاس بھیج دیتے تھے۔ ہمارا مکان خاصا بڑا تھا۔ دیوان خانے کے سامنے ایک بہت بڑا خالی پلاٹ تھا جسے 'تھڑا' کہتے تھے۔ یہ ساری برادری کا مشترک تھا۔ میرے تایازاد بھائی،

علی محمد کا معمول تھا کہ وہ روزانہ بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے۔ ایک دن بہت اچھی قسم کے بیر لائے۔ وہ جھولی میں بیر بھر کے 'تھڑے' پر آئے اور کہنے لگے کہ جن بچوں نے بیر کھانے ہیں آ جاؤ۔ انہوں نے بیروں کا 'چھٹا' دیا تو سب بچے بیر اٹھانے کے لیے بھاگے مگر میرا پیارا 'بولی' بہت آرام سے بیٹھا رہا۔ بھائی صاحب خود اس کے پاس بیر لے کر آئے اور کہنے لگے:

"مجھے پتا تھا، مقبول بہت خوددار ہے وہ بیر چننے کے لیے نہیں آئے گا۔"

جب وہ جنوری ۲۰۱۰ء میں ہسپتال داخل ہوا تو میں اسے دیکھنے کے لیے گیا۔ میں نے اس کا منہ چوما تو اس نے بھی میرا منہ چوم لیا۔ کچھ دیر میں بیٹھا رہا، جب اٹھ کر کھڑا ہوا تو بہت حیرانی سے کہا،

"چلے؟"

اس وقت مجھے جو صدمہ ہوا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا، مگر مجبوری تھی زیادہ لوگ ٹھہر نہیں سکتے تھے۔

اس کے رخصت ہو جانے سے کچھ عرصہ پہلے، میں اسے ملنے کے لیے زرقا کے گھر گیا۔ منزہ بھی وہیں تھی۔ مجھے دیکھا تو کہا:

"اوہو، ابا جی آئے ہیں۔"

پھر اٹھ کر تیز تیز چل کر دکھایا۔ مقصد میری پریشانی کو کم کرنا تھا۔ منزہ نے بمشکل پکڑ کر انہیں صوفے پر بٹھایا۔

میرا بھانجا مقبول اختر، ایک خوش رو خوش لباس انسان تھا۔ اس کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ، ازل سے لے کر ابد تک جگمگاتی رہی۔ دعا ہے کہ وہ اگلی دنیا میں بھی ایسے ہی مسکراتا رہے۔

ooo

اخترِ مقبول

—خالد محمود خان—

وہ صرف خواب یا خیال ہی نہیں تھا، جیتی جاگتی حقیقت بھی تھا۔ مقبول اختر، دراصل اخترِ مقبول تھا۔ وہ ستارے کی طرح چمکا کچھ دیر 'افق' پر ٹھہرا 'حیات' کو حیرانی سے دیکھا اور کسی دوسری منزل کی طرف سفر کر گیا۔ جاتے جاتے وہ میری کتاب "یادِ یارِ مہرباں" کا دیباچہ لکھ گیا۔ یہ کتاب بھی اس کی طرح کے کسی مقبول ستارے سے متعلق ہے۔ شاید وہ اپنا ہی دیباچہ لکھ رہا تھا۔

اُس نے مجھے زندگی کی ایک بے حد پُرانی اور اُس سے بھی زیادہ عزیز یاد کی خواب وادی میں اُتار دیا۔ میں لگ بھگ چار پانچ برس کا ہوں گا جب سے میں اس خواب سی یاد کو ہر وقت تازہ کرتا رہتا ہوں۔ ہمارا گھر گاؤں سے تقریباً باہر کے کونے پر تھا۔ اُس سے آگے کوئی اور گھر نہیں تھے۔ گھر سے باہر دور تک زمین پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں یا اِکا دُکا درخت دکھائی دیتے تھے۔ گھر کے صحن میں شہتوت کے دو درخت تھے۔ وہ دونوں قد کاٹھ اور اپنے تن و توش میں بالکل ایک جیسے لگتے تھے۔ میں سمجھتا تھا وہ دونوں بھائی بھائی ہوں گے۔ میرے

خیال میں انسانوں اور درختوں کے رشتے ایک ہی طرح سے بنتے اور نباہے جاتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ انسان، درختوں کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کو اپنی طرح محسوس کرتے ہیں۔ میری والدہ اُن دونوں درختوں کے درمیان کھڑی ہو جاتیں اور شمال کی طرف کے کسی ستارے کو دیر تک تکتی رہتیں۔ میں اُن سے لپٹا رہتا اور خاموشی سے اپنی والدہ، درختوں اور ستاروں کو دیکھتا رہتا۔ میرا دل ماں، رات، ستارے، درختوں، خاموشی اور سُکھ سے بھر جاتا تھا۔ میں ایسے میں کبھی خوش کبھی اُداس اور کبھی حیران ہوتا رہتا۔ مجھے اس بات کا خیال کبھی نہ آیا کہ اپنی ماں سے اپنی حیرانی کی بات کے متعلق کوئی سوال پوچھ لوں۔ یا، شاید مجھے ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ماں اُس ستارے کو کبھی چاند کی موجودگی میں دیکھتی اور کبھی ستارے کو اس کی اپنی تنہائی کے ساتھ۔ مجھے وہ ستارہ کبھی نظر نہ آیا۔ وہ میرے لیے بہت سے ستاروں کے جھرمٹ میں چھپ جاتا تھا اور میں اسے کبھی تلاش نہ کرتا۔ میرے لیے اُس کے ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ماں کی موجودگی سے تھا اور بس۔

جب ماں رُخصت ہوئی تو نہ مجھے درخت بھائی بھائی لگتے تھے نہ اُن دونوں کے درمیان میری ماں کی وہ زمین اور کائنات نظر آتی تھی جہاں وہ کھڑی ہو کر شمال کے ستارے کو دیکھتی تھی یا شاید اُس سے باتیں بھی کرتی تھی۔

میرے لیے رات، درخت، ستارہ اور چاند وہی تھی۔ اس کے بعد نہ میں نے چاند کو ڈھونڈا نہ ستارے کو۔

میرا یہ رویہ ہمیشہ ایسا ہی رہا۔ مجھے اس پر کبھی حیرانی نہ ہوئی اور نہ میں نے اپنے آپ سے کبھی سوال، جواب کیا۔ مجھے ہجر اور حقیقت پر ایک ہی چیز ہونے کا یقین ہو گیا تھا اور کبھی اس پہ شک بھی نہیں گزرا۔

ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک کے اِرد گرد ستیانہ روڈ پر بہت سے کلینک تھے جہاں لائل پور کے فیصل آباد میں بہت سے ڈاکٹر مریضوں کا علاج معالجہ کرتے تھے۔ میرا بھائی

عابد خان ٹی بی ہونے کی شکایت لے کر آیا تو میں اسے ایک نوجوان ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اُس نے بھائی کو تو تندرست کر دیا البتہ مجھے ڈاکٹر مقبول اختر کی محبت کا خوبصورت روگ لگا دیا۔ پروفیسر اشفاق بخاری کی موجودگی نے مقبول اختر کے ساتھ میرے تعلق کو نہ صرف آسان کر دیا بلکہ گہرا بھی۔ اس کے بعد ہم تینوں ایک تکون تھے ہم تینوں اپنے اپنے دائروں میں بھی رہتے اور اپنی تکون سے کبھی باہر بھی نہ نکلتے۔ ہمارے درمیان کتابیں، فکری آزادی، غیر جانب دارانہ تجزیہ، عوام اور معیشت کے تعلق، باہمی اقتدار کی طرح تھا۔ پاکستان عوام اور معیشت کے متعلق مقبول اختر کے خیالات بے حد غیر روایتی تھے۔ اس کا تجزیہ تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی اقتدار کے لیے سیاسی راستہ بھی آمریت سے مختلف نہ تھا۔ اقتدار کے چہرے پر خوش حال طبقہ کے نقوش سجے تھے اور وہی پاکستان کا نمائندہ چہرہ تھے۔ عوام کہیں بہت پیچھے اور دُور رہ گئے تھے۔ ترقی، خوش حالی اور فتوحات اور ''اندرونِ ملک فتوحات'' کا غازہ ریاست کے چہرے پر اس قدر گہرا ہو گیا کہ عوام کے چہرے کی لکیروں میں لپٹی ہوئی تحریروں کو کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ کھیت کی گندم کا مالک کوئی اور ہے اور گندم اُگانے والے کسان اُس کھیت میں سے اضافی جڑی بوٹیوں پر گزر بسر کرتے ہیں یا گندم کی ٹوٹی، بکھری بالیاں (وَڈھ) چنتے رہتے ہیں۔ عوام کی حیات کا انحصار ''کسان ثقافت'' پر ہے جو آپس میں دودھ، آٹا، گُڑ اور جانور، اشیاء اور اثاثوں کی طرح مشترک رکھتے ہیں۔ آنے والا زمانہ تجارت Commerce کا ہوگا جس کے نتیجے میں عوام ''کسان ثقافت'' کے فیضان سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ ایسا اس لیے ہوگا کہ ''کسان ثقافت'' صنعت اور تجارت کی وجہ سے بے چہرہ ہو جائے گی مگر اس کی کسی متبادل ثقافت کی کوئی نئی وُرود پذیر نہیں ہونے دی جائے گی۔ اس سے اقتدار اور معیشت کا اغوا کار طبقہ ناقابلِ تلافی نقصان پہنچائے گا اور لوگوں نے پاکستان کی آرزو نقصان اُٹھانے کے لیے تو نہیں کی تھی۔ معاشرتی رشتوں سے ''معاشرتی معاہدہ Social Contract'' کا تقدس خوشبو کی طرح اُڑ جائے گا۔ معاشرے

میں تشدد اور جرائم میں اضافہ، بے رحمی، ناانصافی، مایوسی، قتل اور خودکشی کی شرح میں اضافہ ہو جائے گا۔ تجارت اور پیسے کی گنتی کی وجہ سے عوام کے درمیان سے ''کسان ثقافت'' کی محبت، اعتبار، اعتماد، انحصار، تعاون اور فیضان اغواء ہو کر بینکوں کے کھاتوں میں چلے جائیں گے۔ اس ثقافت کی کسی متبادل ثقافت کو اس زمین پر کوئی نہ اُترنے دے گا۔ اغوا کار اپنے لیے اپنی معاشی اور سیاسی ثقافت بنائیں گے۔ اس ثقافت کا عوام سے آقا اور غلام، مالک اور نوکر، امیر اور غریب، منصف اور ملزم، سپاہی اور چور یا معزز اور کم ذات کا تعلق ہو گا۔ مقبول اختر کے اندازِ فکر کے پس منظر میں بہت زوردار عوامل تھے۔ وہ میجر اسحاق کا بھانجا تھا اور اُس سے، اُس کے خیالات اور سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھا۔ یہ میجر اسحاق وہی پاکستان کا عوامی باغی ہے جس نے ''مصلی'' کو شناخت دی۔

شعر خوانی، چھیڑ خانی، لطیفہ بازی اور جملہ سازی ہماری تفریح تھی۔ اُردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی ہماری مشترکہ زبانیں تھیں اور ان کا ادب ہمارا خزانہ۔ میں زندگی میں جتنے تھوڑے وقت میں مقبول اختر کے ساتھ روحانی بے تکلفی کے درجے پر پہنچ گیا زندگی میں ایسا ''کم وقت، طویل سفر'' کبھی طے نہ کیا تھا۔ بلکہ میں محبت کے سفر میں بے حد سست رفتار ہی رہا ہوں یا شاید اس سفر میں جلدی میں نہیں ہوتا۔ مقبول اختر بنیادی طور پر انسانی وجود کے تجزیہ اور علاج کا ماہر تھا مگر وہ جلد ہی اس کی دریافت مکمل کر کے ذہن، دماغ اور نفسیات کے جزیروں کی طرف چل نکلا۔ یہ میدان اس کی روحانیت تھا اور اس کے اس سفر میں کوئی قدم کٹھن نہ تھا۔ اس نے علمِ نفسیات کی رسمی تعلیم، بطورِ خاص حاصل کی تھی مگر وہ اپنی بصیرت میں ان چیزوں کا ہرگز محتاج نہ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں خواب، خیال انسانی رویے، اُلجھن، غلط فہمی اور انسانی مزاج کی بہت ہی جامع تشریح کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔

مثال کے طور پر، پنجابیوں میں مقامی یا لوکل پنجابیوں کو ''جانگلی'' بھی کہا جاتا ہے۔ کسی نے اپنے جانگلی ہونے سے متعلق بہت خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے مقبول اختر سے اُس

کے رویے اور اعتماد کے متعلق معلوم کیا تو اُس نے بہت ہی پھیلی ہوئی بحث کو ایک ہی لفظ میں تشریح کر دیا ''فخر'' (pride) اُس آدمی کو اپنی اس پہچان پر فخر تھا اور اُس نے اپنے اعتماد کی طاقت سے اس تحقیر آمیز تصور کو باعثِ فخر بنا دیا تھا۔ اپنی ذات کے یقین اور خود احترامی نے اُسے ہر قسم کی شرمندگی سے بچا رکھا تھا۔ مگر انسانی رویے اتنے سادہ نہیں ہوتے یا اگر ہوتے بھی ہیں تو اتنی آسانی سے اُن کا نکھیڑا بکھیڑا نہیں کیا جا سکتا۔ مقبول اختر اس دنیا کے ساتوں در کھول کر اُس میں جا بسا تھا۔

مقبول اختر نے بہت کچھ لکھا اور بہت خوبصورت لکھا۔ میرا خیال ہے۔ اس نے اپنی تحریروں کو کبھی کتابی شکل میں بھی پیش نہیں کیا۔ اُس کے اسلوب پر اُس کی حُسن پرستی کی چھاپ بہت واضح نظر آتی ہے۔ اُس کے اسلوب کی جمالیات اُس کے مزاج سے جنم لیتی تھی۔ وہ دیکھنے میں جتنا حسین تھا اپنے باطن میں اس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ وہ صاحبِ جمال تھا اور ''متاعِ جمال'' اُس کے ماحول میں پوری آب و تاب، وفور، اور روز ودکے ساتھ موجود رہتی تھی۔ وجود اور خیال، دونوں صورتوں میں، ہر طرح کی جمالیات۔ میں اُس کے ''اُس نصیب'' پر رشک بھی کرتا تھا اور فخر بھی۔ اُس کے موضوعات عموماً سوانحی اور ادبی صنف ''تذکرہ'' یا ''یادداشتوں'' سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ موضوعات بھی اُس کے پیشہ یعنی علم نفسیات ہی کا حصہ ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمٹے سمٹائے معنی پیش کرتا تھا اور تھوڑے لفظوں میں زیادہ بات کہنے کا فن جانتا تھا۔ اُس کے خیالات پر فرائڈ، مارکس، ڈارون اور سارتر کے گہرے اثرات تھے۔ اِس کے علاوہ میر، غالب، منٹو، حافظ شیرازی، مولانا روم اور قرۃ العین طاہرہ کے خیالات اُسے بے حد عزیز تھے۔ نظیر اکبر آبادی کو ''بے نظیر اکبر آبادی'' کہتا تھا اور اُس کا موازنہ انگریزی کے عظیم شاعر جوفری چاسر (Jeoffrey Chaucer) سے کرتا تھا۔ اُس کی سوچیں ہر قسم کے ابہام اور توہمات سے پاک تھیں۔ وہ کہاں اور کس حدِ آخر پر ختم ہوتی تھیں، اِس کی خبر بھی اُسے معلوم تھی۔

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا رکھتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا (غالب)

اِک اور دریا کا سامنا تھا منیرؔ مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا (منیرؔ نیازی)

بخاری، مقبول اختر اور میری زیادہ تر نشستیں میرے گھر پر ہوتی تھیں۔ چناب کلب کے مخملیں سبزے پر بھی ہمارے لیے رات دیر گئے کی شبنم اُترتی تھی۔ ہماری محفل کبھی کبھی اُس کے کلینک یا گھر پر ہوتی تھی۔ البتہ بخاری کے گھر میں ہمارے لیے اس طرح کی گنجائش نہ تھی۔ ہوسکتا ہے اُس کے اپنے لیے بھی نہ ہو۔ مگر یہ باتیں ہمارے سوال و جواب کا حصّہ نہ تھیں۔ مقبول اختر اس طرح کی محفل آرائی پر چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہوتا تھا اور ہمیں خوش رکھتا تھا۔

مقبول اختر اور بخاری اگرچہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے مگر وہ میرے ساتھ ہم سری کے مزے لیتے تھے۔ میں اُن کی بڑائی، بزرگی، تجربہ جیسے سب خزانوں سے بھی فیض یاب ہوتا تھا۔ ہم آپس میں اِس قدر فکری ہم آہنگی رکھتے تھے کہ ہمارے درمیان کسی موضوع پر کبھی بحث نہ ہوئی۔ گفتگو کسی مذاکرے کی طرح ہوتی تھی جس میں کسی ایک نکتے سے آگے کی بات چلتی تھی اور پھر اس سے آگے کی۔ سیاق و سباق نہ بدلتا تھا۔ بات ایک دوسرے کے احترام میں ہاں میں ہاں ملانے کی نہ تھی بلکہ یکساں خیالات تھے، حیران کُن حد تک۔

وہ میرے بچوں، علی خالد، عائشہ، اور احمد خالد کو "ٹینڈے" کہتا تھا۔ جب بھی ملتا تو سوال کرتا "خالد تیرے ٹینڈے کیسے ہیں؟ وہ تھوڑے ہی دنوں میں آلو ہو جائیں گے اور پھر اُس کے بعد توریاں، کھیرے اور تراں (ککڑیاں) کی طرح کے نکل آئیں گے۔" مقبول اختر کی سبزیاں واقعی بڑی ہوگئی ہیں۔ اُن میں سے ایک "کھیرا" برطانیہ کی مانچسٹر یونیورسٹی چلا گیا ہے اور دوسرے دونوں نے مجھے اپنے ہجر کے خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں اپنے گھر

میں اپنے لیے امرود، لیموں، ٹماٹر، بینگن، بھنڈیاں اور خربوزے اُگا لیتا ہوں۔ میں مقبول اختر اور اپنے دامن میں اُس کی سبزیوں سے ڈر گیا ہوں۔

وہ کافی عرصہ سے اچھی صحت سے نہ تھا۔ میں مقبول اختر کو دیکھنے گیا تو وہ، وہی تھا۔ مسکراتا بھی تھا اور ہنستا بھی تھا۔ چھپاتا نہ تھا۔ اُس کی زُبان پر کم کم لفظ تھے اور چہرے پر بے شمار معنی۔ وہ بڑے ضبط سے میرے پاس کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ اُس کا ضبط، صبر کا صحرا تھا۔ اُس کی وقفہ وقفہ سے خاموشیاں صحرائیں فاصلوں کی طرح تھیں۔

بات سے خاموشی، زبان سے سماعت، بے ساختگی سے ضبط، قہقہے سے مسکان کے سفر میں بھی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ ہر چیز وسعت سے کمی، کی طرف جارہی تھی۔ وہ اپنی مخصوص وضع داری سے مجھے باہر تک خدا حافظ بھی کہنے آیا۔ میں جاتے جاتے ہوئے بھی پتہ نہیں کیوں بار بار پیچھے مڑ کر اُس کو دیکھ رہا تھا اور وہ بھی وہیں کھڑا رہا۔ میں نے دوسری گلی میں مڑ جانے سے پہلے ایک بار پھر اُسے دیکھا اور فیصلہ کرلیا کہ میں مسلسل رابطے میں رہوں گا۔ خط لکھوں گا، کتابیں بھیجوں گا اور عائشہ خالد سے اس کے لیے صحت کی دُعا اور خوشی کے کارڈ بنوا کر بھیجوں گا۔ یہ وہی عائشہ ہے جو عموماً "آشا" کہلاتی ہے۔ میں نے پھر سے طے کرلیا کہ کم از کم مقبول اختر کے لیے مجھ سے اس کی کوئی بات میری موجودگی مانگ رہی تھی۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اُس کے حق میں کوتاہ کار لگتا ہوں۔ میں آشا کے بنائے ہوئے کارڈ کسی ادبی رسالے، مجلّے میں رکھ کر مقبول اختر کو بھیج دیتا اور پھر اگلے ہی روز میرے فون پر اس کی آواز سنائی دیتی۔ وہ آواز جسے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانا تھا۔ وہ ہاتھ جسے میرے ہاتھ سے چھوٹ جانا تھا جسے میرے خط کو بھی موصول نہیں کرنا تھا اور آشا کے آخری کارڈ بھی۔

میں اس تحریر کے ساتھ مقبول اختر کے لیے آشا کے آخری کارڈ منزہ باجی کو بھیج رہا ہوں، مقبول اختر کے نام۔ میری ماں کے پسندیدہ ستارے "اختر مقبول" کی تلاش میں۔ ان میں اُس کا پتہ درج ہے۔ وہ خواب تھا۔ وہ خیال تھا اور خواب و خیال کی حقیقت بھی۔

میری نظر میں — ڈاکٹر مقبول اختر

— محمد خالد مسعود قریشی —

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم 65 سالہ بابے بھی چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ یہی کوئی سولہ سترہ برس کے۔ تب زندگی کو دیکھنے کا ایک ہی زاویہ ہوا کرتا تھا کہ جو بھی ہو ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ غلام محمد آباد میں ہمارے بہنوئی رہا کرتے تھے۔ وہ شہر کے ایک مشہور ڈرگ سٹور کے مالک تھے۔ اِس وجہ سے اِن کے حلقہ احباب میں ڈاکٹرز کی تعداد نمایاں تھی۔ گول مسجد کے سامنے ایک نامعقول سی عمارت میں ایک اچھی خاصی سرکاری ڈسپنسری ہوا کرتی تھی جس میں ایک نہایت سمارٹ ڈاکٹر اور بے حد خوبصورت لیڈی ڈاکٹر لوگوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ یقین کی حد تک پہنچا ہوا شبہ یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ہم بلاوجہ دونوں کو پسند کرتے تھے۔ اُس عمر میں فلمیں دیکھنا ہماری اوّلین تفریح تھی۔ ہر جوان لڑکی ہمیں ہیروئن محسوس ہوتی۔ ہیرو اکثر ہم خود ہی ہوا کرتے تھے لیکن اِن دو ڈاکٹرز کے لیے ہم نے خصوصی فراخ دِلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹرنی کو تو ہم نے ہیروئن ہی رکھا لیکن ہیرو کے لیے خود کو بخوشی دستبردار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو ہیرو بنا دیا۔ بلاوجہ ہماری شدید خواہش تھی کہ اِن دونوں کی شادی ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب سوٹ

بوٹ پہن کر اور ڈاکٹرنی صاحبہ اُس زمانہ میں ساڑھی پہن کر ہیل والی جوتی نکا کر جب صبح صبح ڈسپنسری آتے تو لوگ انھیں نہایت محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور صدقے واری جاتے۔ کمال کی جوڑی تھی۔ ان دونوں کا ہماری بہنوئی صاحب کے گھر اکثر آنا جانا تھا لہٰذا ہمیں بیمار ہوئے بغیر بھی انھیں قریب سے دیکھنے کی سہولت میسر رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اُن کی شخصیت کو اور بھی جاذب بنا دیتی تھی۔ انھیں یقیناً اپنی اِس خوبی کا علم تھا اسی لیے حالات جیسے بھی رہے ہوں اُن کے چہرے سے مسکراہٹ سدا چپکی رہی۔

اب زندگی کوئی فلم تو نہیں کہ جس کا سکرپٹ ہم جس طرح چاہیں لکھ لیں۔ ہماری قسمت اور زندگیوں کا سکرپٹ تو اُوپر والا لکھتا ہے اور اپنی خود کی مرضی سے لکھتا ہے۔ ہوا یوں کہ گھر والوں نے ہمیں ایک عجیب وغریب 3 سالہ کورس کرنے کے لیے مونگ رسول بھیج دیا اور ہم ایک معمولی سا ڈپلومہ حاصل کرنے کے لیے اتنی دلچسپ ''لو سٹوری'' چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور جب تین سال بعد واپس لوٹے تو ظالم سماج اپنا کام دِکھا چکا تھا اور حالات یکسر بدل چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے مقبول اختر تھے اور ڈاکٹرنی کا نام جاننے کے لیے بے تاب ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ زیادہ ٹوہ میں رہنا مناسب بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب جیسا ہمہ وقت شگفتہ آدمی میں نے تو کم از کم اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اُن کی صحبت میں کبھی میں نے کسی شخص کو مایوس، دُکھی نہیں دیکھا۔ بلکہ سنجیدہ بھی نہیں دیکھا۔ انھوں نے نفسیات کی ڈگری تو بہت بعد میں لی وہ شروع سے ہی ماہرِ نفسیات تھے اور سب ملنے والوں کی نفسیات سمجھتے تھے اور سب کو علیحدہ علیحدہ طریقہ سے خوش اور مطمئن رکھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بروقت چٹکلے اور شگفتہ باتیں اُن پہ نازل ہوتی تھیں۔ وہ لطیفہ سنانے کا بہت ہی منفرد انداز رکھتے تھے۔ دوسرے لوگ تو اُن کے لطیفوں پر ہنستے ہی ہنستے تھے وہ

خود بھی اپنے لطیفے سے اس طرح لطف اندوز ہوتے تھے کہ جیسے یہ لطیفہ انھیں کسی اور نے سنایا ہو۔ بلیک اینڈ وائٹ کے زمانے سے ہی رنگین مزاج تھے۔ سیاست اور ادب پر اُن کا اپنا ہی نقطۂ نظر تھا۔ ''ترقی پسند'' رجحانات کے قائل تھے اور لوگوں کو قائل کیا کرتے تھے۔ قائل ہو جانے کا سافٹ ویئر اللہ نے اُن میں ڈالا ہی نہیں تھا۔ اچھے شعر اچھی تحریر۔ اچھی بات کہیں سے بھی آئے تو بہت تعریف کرتے تھے۔ اُن کے مطالعہ میں عام کتب سے لے کر بے حد بوجھل اور ثقیل کتابیں رہتی تھیں۔ اگر انھیں کوئی غیر معروف یا عام مصنف بھی پسند آ جاتا تو بغیر کسی کمپلیکس کے اُس کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے۔ بہت شروع میں مجھے یاد ہے کہ انھوں نے ہی مجھے ''ابنِ صفی'' کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ یاد رہے کہ جاسوسی ناول کو شاید اب تک ادب میں شمار ہی نہیں کیا جاتا اور بہت بڑے بڑے لوگ جو چھپ کر ''ابنِ صفی'' کو پڑھتے تھے وہ کبھی برملا اظہار نہیں کرتے تھے۔ انھیں لگتا تھا ''ابنِ صفی'' کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنے حلقہ میں اُن کی عزت میں کمی کا باعث ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سب میں بیٹھ کر برملا ان کتابوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ شفیق الرحمان صاحب بھی اُن کے پسندیدہ مصنف تھے بلکہ ان کی باتوں میں شفیق الرحمٰن کی چلبلی باتیں اور معصوم لطیفے جھلکتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کھلے ڈُلے مزاج کے ایک دلیر آدمی تھے جب انھوں نے بائی پاس کا آپریشن پاکستان ہی سے کروانے کا فیصلہ کیا تو تب یہ آپریشن یہاں پہ بہت کامیاب تناسب نہیں رکھتا تھا اور بہت بڑا رسک سمجھا جاتا تھا۔ جب پنڈی میں آپریشن کے لیے گئے تو ان کے ساتھ جانے والے ہجوم میں مَیں بھی موجود تھا مجھے یاد ہے فائنل چیک دینے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب کو وہیل چیئر پر آپریشن تھیٹر لے جا رہے تھے تو وہ سب لوگوں کو دیکھ کر یوں ہاتھ ہلا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے جیسے وہ آپریشن تھیٹر نہیں بلکہ رفیع پیر تھیٹر جا رہے ہوں۔ سب کے منع کرنے کے باوجود انھوں نے پاکستان میں ہی آپریشن کرانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ

انھیں اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ اُس اللہ پر جس کے ساتھ اکثر اُن کا لڑائی جھگڑا ہی رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نہ صرف صحت عطا کی بلکہ انھیں اتنی زیادہ ہمت دی کہ اُن کا بعد از آپریشن کا زمانہ اُن کے قبل از آپریشن کے زمانے سے بدرجہا بہتر رہا اور انھوں نے ترقی کی بہت سی منازل طے کیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں ایک اوسط آدمی کی زندگی میں آنے والے رنج والم، تکالیف کی نسبت بہت زیادہ غموں اور تکلیفوں کا سامنا کیا۔ اُن کے سامنے اُن کے بہت سے عزیز ترین رشتے بچھڑتے چلے گئے اور آخر میں تنہا تھے مگر تنہا لگتے نہیں تھے۔ وہ کیسے مسلمان تھے مجھے نہیں پتہ لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور پسندیدہ بندوں کی زیادہ آزمائش کرتا ہے اُن پہ زیادہ بوجھ ڈالتا ہے تو پھر وہ ہم سب سے بہتر انسان تھے جنھوں نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی تکالیف اور دُکھ درد کو اس طرح صبر اور شکر سے برداشت کیا جس طرح برداشت کرنے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری چاہت زندگی بھر بڑھتی ہی رہی اور سینکڑوں دوسروں کی طرح ہم بھی اسی یقین میں مبتلا رہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ خصوصی شفقت اور محبت رکھتے ہیں۔

حرفِ آخر یہ ہے کہ اگر خوش اخلاقی، خوش لباسی اور خوش گفتاری کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے اور اس میں ناقابلِ یقین پُرکشش مسکراہٹ چپکا دی جائے تو حاصل ضرب صرف اور صرف ڈاکٹر مقبول اختر ہی ہوگا۔ اب یہ میرے رب کا اٹل قانون ہے کہ ہر شخص نے رخصت ہونا ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں لہٰذا صبر اور شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

موت سے کس کو رُستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ooo

A Man of Multiple Qualities

–Dr. Asif Tauseef–

My association with Dr. Maqbool Akhter esq began in 1997 when I was introduced to him by my writing teacher and boss Dr. Ehsan ul Haq. In those days I had a dacoity in my house and slowly I slipped in post traumatic distress.

From August 1997 on wards I used to meet him regularly to get rid of the post traumatic distress. During all this period, I found him to be a competent, dedicated and sincere doctor to his patients. I cant forget his ever smiling face and the confidence he had to handle difficult situations.

He was a man of Multiple Qualities. A good orator having a command on both Urdu, English and Punjabi.

He was a well read person in English, Urdu and Punjabi literature.

We started a project Psychoanalysis together. He being the therapist and I being the person who wanted to

remove all the speed breakers which were not allowing me to lead a happy life. During all this period I read Sig. Frend. All this helped me to a changed person and I learnt the act of psychoanalysis and dream analysis which is the royal road to the unconscious.

Unfortunately he left us foreve. But he will remain in my heart for ever. His guidance will help me always.

I always pray for him to be enjoying in the heavens. 'Ameen'.

OOO

ابوجی

ڈاکٹر زرقا عامر عزیز (بڑی بیٹی)

چھوٹی پھپھو کا فون آیا کہ میں ڈاکٹر بھائی کے لیے ایک مختصر سی کتاب لکھ رہی ہوں، تم بھی اپنا مضمون لکھ کر بھیجو کہ اِس میں شامل کیا جا سکے تو میں نے جواب دیا کہ نہیں لکھ پاؤں گی۔

''کیوں؟''

''مجھ سے لکھا نہیں جائے گا''

''مجھ سے کون سا لکھا جا رہا ہے؟ لیکن لکھنا تو ہے نا! مضمون لکھو اور جلدی بھیجو، بہت تھوڑا وقت باقی ہے ان کی برسی میں۔ تمہارا مضمون شامل ہونا لازم ہے۔۔۔ پیاری بیٹی کا۔۔۔''

میں نے بہت کوشش کی لیکن لکھ نہ پائی۔ پھپھو سے معذرت کے لیے فون کیا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا اور نہ لکھنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا:

''دو تین لائنیں لکھتی ہوں تو سیاہی پھیل جاتی ہے۔''

''بہت آسان حل ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا۔ اس لیے Lead پنسل سے لکھنا شروع کر دیا۔''

(پھپھو بھی آخر کو، ابو کی بہن ہیں۔ ان کے پاس بھی مسائل کے حل کے لیے کافی ''نسخے'' ہوتے ہیں۔'')

سو لکھ رہی ہوں۔۔۔ اس سے بھی آسان حل تلاش کر کے۔۔۔ کہ

ع خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے

اور یوں بھی جس سنہری قلم کا ذکر مجھے کرنا ہے میں اسی کی ایک تحریر ہوں۔

Oliver Wendell Holmes کہتا ہے:

"Memory is a net; one finds it full of fish when he takes it from the brook; but a dozen miles of water have run through it without sticking."

کیا کہوں۔ کہاں سے شروع کروں۔ اتنا تو میری یاد کا جال بھی وسیع نہیں کہ ان مہربان پانیوں کو ماپ سکے۔ میلوں تک پھیلا ہوا نظر کی حد سے بھی پرے۔

جہاں بھی جال ڈالوں مچھلیوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کئی یادیں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی آتی ہیں اور آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں۔

رات کا وقت ہے بجلی بند ہے۔ گرمی سے سب بے حال، میں ابو کے کندھوں پر بیٹھی ہوں اور وہ نہر کے کنارے چل چل کر مجھے مینڈکوں اور ٹڈوں کی آوازیں سنا رہے ہیں اور اسے قافیے میں ڈھال کر نظم کی صورت مجھے بہلا رہے ہیں:

ٹڈے ٹڈے بولدے

ڈڈو ڈڈو بولدے

یا یہ کہ کہانی سنتے سنتے کیا گیا سوال کہ ابو یہ سانپ چھتری کیا ہوتی ہے؟ اگلے

اتوار ابو بغل میں چٹائی دبائے ہاتھ میں کھانے کی ٹوکری پکڑے مجھے کندھوں پر بٹھائے پیدل چل کر رانا صاحب کے باغ سے سانپ چھتریاں اور کھمبیاں اکٹھی کرنے جا رہے ہیں۔

یا پھر یہ کہ آنکھ کھلتی ہے تو کسی مہربان ہاتھ کا لمس ماتھے پر محسوس ہوتا ہے۔

'کوکڑ موکڑ' اُٹھو Ovaltine پیو پھر کالج جانا ہے۔ ابو کیا آپ نے Ovaltine بنائی؟ ہاں جب اماں شہر میں نہیں اور میں Baby Sitting کر رہا ہوں تو ذرا Proper طریقے سے ہو۔

یا یہ کہ سکول میں Inertia کی ایک Problem سمجھ نہیں آ رہی۔ گھر آ کر ابو سے پوچھتی ہوں اور کچھ دیر بعد ہم دونوں Coronation Library کے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں اور Physics سیکشن کی تمام کتب سامنے ڈھیر ہیں۔

زندگی کے ہر موڑ اور ہر پہلو پر ابو سے وابستہ کوئی یاد پڑی ہے۔ اتنے شفیق، اتنے محبت والے۔ ان سے بہتر کوئی دوست آج تک نہ ملا۔ ان کی محبت کو ناپنے کا پیمانہ تو میرے پاس نہیں کہ صاحبِ اولاد ہو کر بھی میں ایک ماں بنی تو باپ کے جذبات کیا جانوں؟ مگر اتنا یقین ہے کہ اگر باپ ہوتی تو اتنا اچھا باپ نہ بن پاتی۔ ان کی محبت کی چادر اتنی گرم اور وسیع تھی کہ ہر درد، ہر دُکھ، ہر تکلیف اس میں چھپ جاتی۔

ابو سکول سے لینے آتے تو صبح سے لے کر اس وقت تک کی تمام کہانی راستے میں ہی سنا دیتی۔ وہ کہانی سکول سے چلتے چلتے کالج۔ پھر Practical Life، پھر بچے اور پھر بچوں کے سکول سے گھر آنے تک پھیلتی چلی گئی۔ میری اور ابو کی دوستی کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے میرے بچوں تک پہنچ گیا۔ اپنے بچے سے اس کے دل کا راز، اس کی خوشی، اس کی خواہش، اس کے خوف جاننے کا گُر میں نے ابو سے سیکھا۔

بہت پیچیدہ تر گرہیں اتنے اطمینان اور اتنی باریکی سے کھولتے کہ حیرت ہوتی کہ

کبھی اس رسی میں بل بھی آیا ہوگا۔

ابو علم کا خزینہ تھے۔ ادب، شاعری، سیاست، معاشیات، فلسفہ، موسیقی، ہر موضوع پر وسیع علم رکھتے ہوئے بھی خود کو طفلِ مکتب سمجھتے اور زیادہ سے زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرنے کی کوشش کرتے۔

مجھے ہمیشہ پیار بھری سرزنش کرتے کہ کبھی اپنی ان موٹی موٹی کتابوں کی گرد تو جھاڑ لیا کرو۔ تو میں کہتی:

when you are around I don't need to pick up a reference book.

اور یہ سچ بھی تھا۔ انگریزی پڑھتے پڑھتے کوئی ناقابلِ فہم French Phrase آ جاتی تو ڈکشنری اُٹھانے کی بجائے ابو سے سوال کیا جاتا۔ کوئی فارسی شعر اٹک جاتا تو ابو سے بہتر اس کا مفہوم کوئی کتاب بیان نہ کر سکتی۔ بچپن میں گورمکھی رسم الخط سکھایا۔ میجر اسحاق ان دنوں سینٹرل جیل میں تھے، ابو ملنے جانے لگے تو میں نے ان کے نام خط دیا۔ واپسی پر تمتماتے چہرے اور اپنی اسی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگے کہ میجر صاحب سب کو وہ خط دکھا رہے تھے کہ مقبول کی چھوٹی سی بچی نے گورمکھی میں لکھ کر بھیجا ہے۔

۱۸ رجنوری کو ہونے والا حادثہ وہ سارا خزانہ بہا لے گیا۔ وہ شخص زبان دانی میں جس کا ثانی نہ تھا چھوٹی چھوٹی چیزوں کا نام یاد رکھنے کی جستجو کرنے لگا، جو زندگی کے ہر پہلو کو انتہائی تفصیل سے سمجھاتے تھے وہ اپنی ذاتی ضروریات بھی ڈھنگ سے بیان نہ کر پاتے۔

وہ ساری عمر سب کے لیے روشنی دکھاتے اور راستے بناتے رہے اور اپنا رستہ کھو بیٹھے۔ اس احساس نے انھیں بے بس کر دیا۔ اس بے بسی کو زیادہ سہہ نہیں پائے۔

؎ طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

ابو کی بیماری کے دِنوں میں ان کا کلینک بند کرنا پڑا۔ کچھ سامان سمیٹا۔ میز کی دراز سے کچھ کاغذ نکلے۔ ایک خالی دستہ بھی تھا جس کے شروع کے دو صفحوں پر کچھ لکھا تھا۔ پہلے صفحے پر تھا:

سفرِ حجاز

زہرہ کے نام جس کا 'سفرِ حجاز' سفرِ آخرت ثابت ہوا۔

نیچے تھا:

ع متاعِ قافلہ من حجازیاں بردند

ہم نے مِل کر بہت سے بھلے دِن گزارے
بُرے دِن میرے حصے میں آئے ہیں

اگلے صفحے پر تھا:

All I need is you
Ah no!
The years, the years
The years, O!

میں نے لکھ کر پوچھا ابو آپ کس کے لیے کوئی کتاب لکھنے لگے تھے۔ کوئی جواب نہ دیا۔ گیلی آنکھوں کے ساتھ سامنے دیوار کو تکتے رہے جہاں امی ابو کی شادی کے شروع دِنوں کی تصویر لگی ہوئی ہے جس میں ایک پیار کرنے والا جوڑا کھلکھلاتے چہروں اور پوری چنچلتا کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ رہا ہے۔

کچھ دیر بعد بورڈ پر لکھا "لکھ ہی نہیں پایا۔"

میاں کی ٹرانسفر۔ امی کی وفات۔ بینک سے معاہدہ۔ کچھ ایسا سلسلہ چلا کہ ایک سال میں چار رہائش گاہیں بدلیں۔ ابو سے ذکر کیا کہ اِن دِنوں بہت Under Stress ہوں۔ کہنے لگے ہاں اپنا گھر شفٹ کرنا بھی Stress Levels میں اُونچے درجے پر آتا

ہے، پر پتا ہے اس سیڑھی کا سب سے اُونچا درجہ کونسا ہے۔ Losing a Spouse۔ اور یہ میں ہی جانتا ہوں۔

برسوں کی لمبائی گنتے گنتے بالآخر امی کے پاس چلے ہی گئے۔

ے کیوں کون ڈاچی ساگر خاطر
مارُو تھل چھڈ جائے وے

ابو زندگی کے ساتھ سے بچھڑنے کا غم بڑا۔ لیکن ماں باپ کو کھونے کا بھی کم نہیں۔

کہتے ہیں کل ملیں گے۔ لیکن کب ملیں گے:

تب تک کیا؟

یہ دُکھ کب ختم ہو گا؟ بہلاوا، وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ حقیقت، زندگی کی رگ رگ میں پھیل جائے گا۔

بہلاوا، اس دُکھ کو بھولنا سیکھو۔ حقیقت، اس دُکھ کے ساتھ جینا سیکھو۔ آج یہی کر رہی ہوں۔

ooo

زندہ باد مقبول اختر زندہ باد

-ڈاکٹر سلطان عبداللہ-

کسی بھی ایسے انسان کے بارے میں لکھنا کتنا مشکل ہے جسے آپ جانتے بھی ہوں اور بیک وقت نہ بھی جانتے ہوں۔ جو سر سے پاؤں تک سراپا خود اعتمادی ہو۔ حقیقی خوشی اور طمانیت کا مظہر ہو۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا اور دنیاوی تقاضوں سے بے نیاز زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہو۔ ہمیشہ مسکراتا ہوا نظر آئے اور ملنے والوں کو نئی صبح کے سندیسے دے۔ اپنی تکلیف کو اس طرح چھپائے کہ دوسروں کو تو کیا اپنے آپ کو بھی خبر نہ ہو۔

کئی سال پہلے ڈاکٹر احسان الحق کے ساتھ ایک بلند قامت، خوبصورت شخص کو ہر محفل میں پایا، جو گفتگو میں کم، کم شامل ہوتا مگر بات ہمیشہ مثبت کرتا۔ کبھی بھی اس کا چہرہ لٹکا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ مسکراہٹ جیسے اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ چناب کلب میں وہ ڈاکٹر احسان کے علاوہ ایک اور شخص کے ساتھ نظر آتا۔ یہ تینوں ایک کونے میں بیٹھے کھانا کھاتے اور باقی تمام لوگوں سے بے خبر، محو گفتگو ہوتے۔ جب کبھی مجھ پر نظر پڑ جاتی تو ہمیشہ اٹھ کر میرے پاس آتے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد، اس کام کی حوصلہ افزائی کرتے جو میں کر رہا تھا۔ پروفیشن کے لیے یا پھر پروفیشنل ساتھیوں کے لیے۔

کافی دیر بعد جب معلوم ہوا کہ یہ تو میرے، بہت بڑے محسن ڈاکٹر فتح محمد چوہدری کے بھانجے اور ایک سینئر نشتیرین ہیں تو احترام اور محبت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اب میں انہیں سلام کرنے میں پہل کرتا اور دعائیں لیتا۔

ہاں! یہ تھے ہمارے اور سب کے مقبول اختر، جو ایک دن اپنی بیماریوں سے خاموشی سے اکیلے ہی لڑتے لڑتے، مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ، ہم سے رخصت ہو گئے۔ مگر جاتے جاتے، ہمیں زندگی کا پیغام دے گئے کہ موت تو زندگی کا ارتقا ہے۔ اس کیفیت میں داخل ہونے پر ملال کیسا؟ خوشی خوشی اس ارتقائی منزل میں داخل ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں قیامت والے دن، اپنے دیدار سے نوازے اور تب تک انہیں اپنے نہایت ہی قریب، جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

ooo

کچھ یادیں، کچھ باتیں

—ڈاکٹر سلطان اکبر قریشی—

ڈاکٹر مقبول اختر کا کلینک، میرے کلینک کے قریب ہی واقع تھا۔ صبح میں ہم دونوں سوشل سیکورٹی ہسپتال میں بطور سپیشلسٹ ڈاکٹر کام کرتے تھے۔ اکثر میں ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک چلا جاتا اور مختلف موضوعات پر گپ شپ ہوتی۔ دھیمے مزاج کے پر خلوص انسان تھے۔ ہر موضوع ان کے دائرۂ کار میں تھا۔

ایک روز میں نے ان سے پوچھا کہ خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے کوئی فارمولا ہے؟ کہنے لگے:

''بہت آسان فارمولا ہے۔ گھر میں جتنے صحیح کام ہوں وہ بیگم کے کھاتے میں اور ہر کام جو غلط ہو جائے اس کا ذمہ دار شوہر۔۔۔ عمل کر کے دیکھو! بخدا گھر میں سکون ہی سکون ہوگا۔۔۔''

پھر گویا ہوئے۔

''میں اپنی ایک مثال دیتا ہوں۔ میں اپنے گھر پر لان میں بیٹھا تھا۔ یاد رہے کہ

کئی کنال پر مشتمل مکان کا لان بھی کافی بڑا اور کچن سے کافی دور تھا۔ اچانک کسی برتن کے ٹوٹنے کی زوردار آواز آئی۔ کوئی بڑا برتن غالباً ڈونگا وغیرہ ٹوٹا تھا، جو آواز اتنی دور تک آئی۔ میں نے لان میں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

''ہاں، ہاں یہ برتن مجھ ہی سے ٹوٹا ہے۔''

ooo

Dr. Maqbool's Nishter Medical College

–Dr. Fayaz Mehmood–

Those were the days when we were young, and everything looked rosy, fascinating. New and beautiful structure of Nishter Medical College with modern design and facilities, grand dissection hall and pharmacology museum are few examples of this college, excellent hospitals, hostels, play grounds, lawns and of course rose garden heart throb of young ones simply still the best structure of a Medical College in Pakistan.

We had a galaxy of brilliant teachers like Dr. Toosi. Dr Nazir Sb, Dr Ibrahim Sb, Dr Rauf Sb, Dr Shafi Sb, Dr Akhter Sb, Dr Sial Sb, to name a few and of course Dr Jamil Bhutta Sb, master mind of this great college.

Medical conferences, musical concerts All Pakistan debates and Sports festivals were regularly held and we had the honour of listening to Hafeez Jullandri, Josh, Saghir Siddique, Jigger Muradabadi, Adam, Jaffery and others and also enjoyed the music of Roshan Ara

Begum, Nazakat Salamat and Ghulam Ali Khan.

Nishter College produced highly qualified doctors in different fields of Medical Surgery who gained international recognition after specialization, such as Dr Khalid Javed Awan ophthalmologist and Dr Rashid Latif (Gynaecologist) to name a few.

Dr. Maqbool was my hostel fellow for five years. This group of friends were Butt brothers. Rashid Latif, Ch Rafique, Wajid and Shabbir Haider.

From those days I remember that I became best athlete of the college and Dr Maqbool and his friends congratulated me and asked for a heavy (high) tea, which was duly served although they were not in my close circle of friends. This shows their faith in themselves and the respect they enjoyed

This group of friends made a list of students from this hostel who will qualify final professional MBBS exam in first attempt and they included my name in the list, where as I had gone to Karachi to participate in All Pakistan Inter university Athletic championships and did not appear in part of sent up exam. I think it was their prayers and well wishes which bore fruit and I was never a studious person.

Literary people say that "Never quote a living author". I will mention a few examples which you may better interpret.

To portray a personality I think it is better that

events should throw light rather than words. With my limitation of knowledge I will present some instances.

It is very difficult to surrender and admit ones frustrations. It requires a very big heart which Dr Maqbool had.

Once at Dr Ehsan's residence Prof Irshad sb read Faiz's poem on Hazrat Hussain (AS) and said that you can see blood in this poetry. I said you are correct but Faiz sb has not written a word about 50 lac Afghan Muhajirs in Pakistan, who have lost their sons, fathers, daughter and sisters.

Dr Maqbool did not say a word and this is called Sagacity, bravery and courage.

During one trip to Lahore I asked Dr Maqbool as to why communism almost lacked behind in fertile in poor land of India. Dr Ehsan said that no land is suitable for this ideology and Dr Maqbool kept mum. This shows character.

At his clinic last year he recited Adam. (عدم)

ضمیر صدف میں نور کے جلوے
ہیں کیسے کیسے ٹھکانے ترے
اک داغ سجدہ میری کائنات
جبیں تری آستانے ترے

He said that people here failed to understand. عدم
Of late whenever we met I used to ask how is

everything and would always say. اللہ کا بڑا کرم ہے

Music, love, fragrance and knowledge was all around when Dr Maqbool, Dr Ehsan and Professor Irshad and Professor Bukhari, conversed in musical sittings and Persian music was their choice. Dr Maqbool favourite songs are as follow.

۱۔ زندگی اک آرزوے مبہم
یک طلوع و غروب یک دم
۲۔ زندگی یک کور راہ است
بہ امید یک نگاہ
۳۔ مثل یک چراغ روشن
سوے یک شب سیاہ
مگہ نہ مگہ نہ (کیا نہیں ہے)

ترجمہ: زندگی اک آرزو مبہم ہے اک دم کا طلوع و غروب ہے۔
زندگی اک اندھی راہ ہے اُمید کی نگاہ کی منتظر
مثل ایک چراغ روشن سوے (طرف) ایک سیاہ شب کے

قصہ نام، ننگ، قصہ عزیز و اوج قصہ ساحل و موج وصل یا جدائی
قصہ یاس و اُمید، سیاہ یا سفید، سربسر رسوائی
وقتیکہ رو لب بستہ غنچہ پائیزی آید چہ غم انگیزی آید
چہ بگوید، بہ کی بگوید، زندگی عاقبت تشنہ رہنا ہے

ترجمہ: جب غنچہ کے بند لبوں پر خزاں آتی ہے تو کیا غم انگیز ہوتی ہے۔ کیا کہے اور کس سے کہے۔

سہ زندگی کی عاقبت تشنہ رہنا ہے
اک نغمہ نا تمام ہے جو گایا جاتا ہے
بگذر از عشق افسانے مگو۔ افسانے با دیوانے مگو
منم آں مستیِ میخانہ غم۔ با من طرز پیمانے مگو

ترجمہ:

عشق کی بات چھوڑو افسانے نہ کہو
افسانے دیوانے سے نہ کہو
میں غم کے میخانے کی مستی ہوں
مجھ سے طرز پیمانے نہ کہو

Dr Sb used to give new meanings to these songs and enlightened all of us. On insistence of Dr Maqbool, Prof Bukhari Sb gave credit to me for Nusrat Fateh Ali Khan success in west in his book "Lyallpur Kahani". I told Dr Sb that my humble contribution was that I used to present Nusrat, pieces of Persian, Turkish and Western Music.

Dr Maqbool asserted that "It was enough material to lead Nusrat towards international music."

To describe Dr Maqbools personality, his manners, behaviour, knowledge, professional skill, struggle for downtrodden, philosophical knowledge and literary capability, requires a literary pen but do not forgot his Smile.

May his soul rest in peace.

ooo

ڈاکٹر مقبول اختر ـــ میرا پیارا دوست

-ڈاکٹر ممتاز احمد-

آج منزہ بہن نے ڈاکٹر مقبول اختر کے لیے میرے تاثرات لکھنے کو کہا۔ ڈاکٹر مقبول اختر کے ساتھ گذارا ہوا وقت ایک ایسا احساس ہے جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر مقبول اختر جیسی شخصیت خوش قسمت دوستوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں نے آج تک اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نہیں دیکھے۔ جب بھی اس سے ملاقات ہوتی تھی وہ ہنستا مسکراتا نظر آتا۔

میرا تعلق، ڈاکٹر مقبول سے ۱۹۵۷ء سے ہے۔ جب ہم نے نشتر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ ہم مسلسل پانچ سال، ایک ہی ہاسٹل میں اکٹھے رہے۔ ہوسٹل میں روزانہ۔۔۔ صبح، شام، رات ان کا مسکراتا چہرہ نظر آتا۔ مجھے پچھلے ۵۳ سال میں، کوئی ایسا وقت یاد نہیں جب میں نے مقبول کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ نہ دیکھی ہو۔ انتہائی مشکل حالات میں بھی، اس کی مسکراہٹ کبھی ناگواری میں تبدیل نہیں ہوئی۔ By pass آپریشن کے بعد وہ اکثر اپنے Lab test کروانے کے لیے میرے پاس آتے رہتے تھے اور Brain Surgery کے بعد بھی، خود سیڑھیاں چڑھ کر، اسی مسکراہٹ کے ساتھ، لیب میں آتے تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر کی خوش اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کی سبھی دوست بہت قدر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

دائمی مسکراہٹ

—ڈاکٹر وحید احمد—

۷۰ء کی دہائی کا لائل پور، لکھاریوں کی کہکشاں سے جگمگا رہا تھا۔ شاعروں، نثر نگاروں اور دانشوروں کی ٹولیاں مختلف ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں سارا دن اور آدھی رات تک پائی جاتیں۔ ہوٹل الجاوید، خیام، کیری ہوم، محفل اور جھنڈے کا ہوٹل، دانشوروں کے مخصوص ٹھکانے تھے۔ متمول (پیٹی بورژوا) دانشور اور عالم، کافی ہاؤس میں بیٹھک لگاتے۔

لکھنے والوں کے اس ہجوم میں ایک چہرہ سب سے جدا نظر آتا۔ ہونٹوں پر دائمی مسکراہٹ لیے جو کنجِ لب سے گوشۂ چشم تک جاتی اور عینک کے شیشوں میں جھلملاتی تھی۔ یہ ڈاکٹر مقبول اختر تھے۔ ترقی پسند اور روشن خیال دانشور، جو گفتگو سے محفلوں کو کشتِ زعفران بناتے اور اپنے مضامین سے ذہنوں کی تربیت کرتے۔ ادبی حلقے ہوں یا نئی کتابوں کی تقاریب، ڈاکٹر مقبول اختر کے بغیر ادھوری رہتیں۔

فیصل آباد کی ادب و دانش کی تاریخ ڈاکٹر صاحب کے بغیر ادھوری ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دانش کی تعلیم دینے میں گزارا ہے۔ فیصل آباد کو ہمیشہ ان پر ناز رہے گا۔ ان کے لفظوں کے پروئے ہوئے موتی سدا آبدار رہیں گے۔ ان کی مسکراہٹ، ذہنوں پر کندہ ہے اور رہے گی۔

یادوں کا در کھلتا ہے

(ایک انسان دوست، ترقی پسند، دانشور، ماہرِ امراضِ نفسیات)

—ڈاکٹر یونس ایاز—

ڈائریکٹر سوشل سیکورٹی

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

وقت کا پہیہ ہزاروں سال سے محوِ گردش ہے۔ قافلۂ آدم یونہی رواں دواں ہے۔ لوگ ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو انہیں گوناگوں خوبیوں کی بنا پر دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ انہیں جانِ محفل کہیں، میر کارواں کہیں کہ چراغ انجمن کہیں، وہ چمن میں ہمیشہ گلاب کی طرح کھلتے ہیں۔ اپنی خوشبوئیں لٹاتے لٹاتے اگر مرجھا بھی جائیں تو بھی گلاب زینتِ اوراق بنتے ہیں۔

دانشور ڈاکٹر مقبول اختر، ترقی پسند برادری اور سوشل سیکورٹی ہسپتال کی مقبول ترین شخصیت تھا۔ سیاسی ماحول اور اپنے اردگرد پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ متحرک رہتے کہ سماج کی جھوٹی روایات کے باغی تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر نے اپنے نظریات اور دوستی کے عظیم

رشتے کو ضرورتوں اور تمناؤں کے بندھن سے آزاد رکھا۔ انہوں نے دوستی کو ہمیشہ مقصدیت کے آئینے میں دیکھا اور ہر اس شخص کو دوستی کی دعوت دے ڈالی جس کی نظریں مساوی نتائج سے آگے دیکھنے کی تمنا رکھتی تھیں۔ وہ پڑھے لکھے متمول گھرانے کے فرد تھے، لیکن ان سے دوسروں کی فاقہ مستی دیکھی نہ جاتی۔ وہ اقبالؔ کے اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر تھے۔

ے ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

منزہ بہن کا حکم ہے کہ لکھنا ہے، سو۔۔۔ لکھ رہا ہوں۔۔۔ مگر بہت مضطرب اور غمگین ہوں۔ رات کے گہرے سناٹے میں یادوں کو لفظوں کا روپ دینے چلا ہوں۔ یادوں کا یہ موسم سدا بہار ہے۔ ہمیشہ جوان رہتا ہے اور یادوں کے اس آتش کدے میں اپنا ہی وجود جھلستا رہتا ہے۔ کس کس یاد کو 'یاد' کروں۔ ہر یاد پر روح کے سناٹے چیخ اٹھتے ہیں۔۔۔

آہ! ڈاکٹر مقبول اختر کو مرحوم کیسے لکھوں؟

ے جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ڈاکٹر مقبول اختر صاحب سے میرا پہلا تعارف ہمارے ایم۔ ایس ڈاکٹر سید تجمل حسین صاحب کے توسط سے ہوا۔ ہم ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک پر گئے۔ اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس ایک کلین شیوڈ شخص، معصوم چہرہ، روشن اور سوچتی ہوئی آنکھیں۔

ے پھول چہرہ ہے، شفق لب ہیں، سحر ہیں آنکھیں
ایک انسان کی صورت ہے مثالوں جیسی

ان کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ مقبول صاحب، مجھ سے غائبانہ متعارف تھے۔ ڈاکٹر تجمل حسین سے کہنے لگے:

''آپ یونس کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔''

پھر میجر اسحاق محمد، مزدور کسان پارٹی اور فیض احمد فیض کی ڈھیروں مشترکہ یادوں کا دور چلا اور ہم دونوں نزدیک ہوتے گئے۔ پھر میں ہمیشہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا ہو کر رہ گیا۔

پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کی ناکامی اور ترقی پسندانہ سوچ کے زوال پر بحث ہوتی اور ہر بحث کا اختتام وہ یہ کہہ کر کرتے کہ

''تم دیکھنا یہ مذہبی شدت پسند پاکستان کو خون میں نہلا دیں گے۔''

اکثر ہسپتال میں چائے کے وقفے کے دوران، ڈاکٹر سلیمان مرحوم کے 'پاک ٹی ہاؤس' میں محفل جمتی۔ ڈاکٹر مقبول اختر کا اندازِ گفتگو دھیما اور مدلل تھا، مگر ہمیشہ چیلنج کرتے ہوئے مقابلے کی دعوت دیتے تھے۔ جیسے وہ قدم قدم کہہ رہے ہوں

ے جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے
قتیلؔ وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر ایسوسی ایشن کا الیکشن تھا۔ میں ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ڈاکٹر مقبول اختر، ڈاکٹرز سیاست سے تقریباً کنارہ کش تھے کہ ریٹائرمنٹ قریب تھی۔ میں نے ایک رات، الیکشن کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے:

''افہام تفہیم سے ایگزیکٹیو باڈی کا انتخاب کر لیں کہ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن ہی، ڈاکٹروں کے مسائل حل کرنے کا واحد پلیٹ فارم ہے اور باڈی میں اہل اور جرأت مند افراد کا ہونا ضروری ہے۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ ڈاکٹرز کے تمام گروپس سے مذاکرات کر کے، باڈی تشکیل دینے کے لیے نام لے لیں۔ ابھی میں رابطے بحال ہی کر رہا تھا کہ ایک مخصوص مکتبہ فکر کے حامل ڈاکٹرز نے یکایک الیکشن کے لیے اپنا پینل اناؤنس کر دیا اور ہم لوگوں پر روایتی جارحانہ انداز میں فتویٰ بازی شروع کر دی۔ الیکشن ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کا۔۔۔ مگر مہم کا آغاز ہمیں بے دین اور منکر قرار دے کر کیا گیا۔ بدترین قسم کی کردار کشی شروع کر دی گئی۔

ڈاکٹرز جیسی پڑھی لکھی کمیونٹی سے ایسے اندازِ فکر و پروپیگنڈہ کی توقع نہ تھی۔ میں بہت متفکر ہوا اور شدید غصہ کے عالم میں ڈاکٹر مقبول صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے ماہرِ نفسیات ہونے کا بھرپور مظاہرہ کیا اور میرا اشتعال جب قدرے کم ہوا اور میں مسکرانے لگا تو کہنے لگے:

''چلو، ایک بار پھر سے 'جوان' ہو جاتے ہیں۔ سمجھ لو کہ ہم زمانۂ طالب علمی میں واپس چلے گئے ہیں۔ مخالفین کی بھرپور الیکشن مہم سے یوں لگا ہے کہ جیسے سرخ و سبز، بائیں اور دائیں بازو کا دور، انگڑائی لے کر پھر سے جوان ہو گیا ہے۔''

تمام دوست اکٹھے ہوئے۔ پینل کی تشکیل ہوئی مخالف سبز گروپ نے ایک انتہائی سینئر سپیشلسٹ ڈاکٹر کو صدارت کے لیے نامزد کیا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر مقبول اختر کو صدارتی امیدوار بنانے کا فیصلہ کیا۔ اب مرحلہ یہ تھا کہ ڈاکٹر مقبول صاحب کو راضی کون کرے گا۔ ڈاکٹر تجمل حسین شاہ اور مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ ہم شام کو ڈاکٹر مقبول صاحب کے کلینک گئے، تمام صورتِ حال گوش گزار کی تو پینل دیکھ کر کہنے لگے۔

''میرے ساتھ جنرل سیکرٹری آپ ہو۔ جیتنے کے بعد ساری ذمہ داری آپ پر ہو گی۔ اب میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا۔''

ایسا اعتماد کہ ہم میں جوانی لوٹ آئی۔

ڈاکٹر مقبول صاحب صدر اور میں جنرل سیکرٹری، ڈاکٹر آصف لطیف رندھاوا نائب صدر اور بارہ رکنی ایگزیکٹو باڈی سمیت پینل اناؤنس کیا۔ ہم دونوں کے عہدوں پر گھمسان کا رن پڑنے والا تھا۔ بھرپور الیکشن مہم کا آغاز ہو گیا۔

ڈاکٹر مقبول اختر صاحب مجھ سے کہنے لگے:

''تمہیں کالج، یونیورسٹی کے الیکشن لڑنے اور جیتنے کا تجربہ بھی ہے اور ابھی تم جوان بھی ہو۔ اپنی ٹیم کو لے کر میدان میں کود جاؤ اور یہ یاد رکھنا کہ میں شکست خوردہ ریٹائرمنٹ لے کر گھر جانا پسند نہیں کروں گا۔''

پھر مجھ سے اکیلے میں بات کی۔

''میں کوشش تو پوری کروں گا مگر میں زیادہ متحرک نہیں رہا، مجھ سے بہت سی اُمیدیں وابستہ نہ کر لینا۔ تم معراج محمد خان کے سچے شاگرد ہو اور کراچی میں 'اس' گروہ کو ناکوں چنے چبوا چکے ہو۔ قید و بند بھی تمہیں جھکنے پر مجبور نہیں کر سکی تو اب یہ کردار کشی کی مہم کیا حیثیت رکھتی ہے۔ آج سے سرخ پرچم تمہارے ہاتھ میں ہے۔ انٹرنیشنل کا نعرہ لگاؤ۔ یار، کوئی الیکشن تو ہم بھی جیتیں۔''

ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کی تاریخ میں ایسا عہد ساز اور اعصاب شکن، الیکشن کبھی نہیں ہوا۔ دن رات الیکشن مہم بھرپور انداز میں جاری تھی۔ روزانہ رات کو ڈاکٹر مقبول اختر صاحب کے کلینک پر لائحہ عمل طے ہوتا اور دن بھر کی کارکردگی کا جائزہ لیا جاتا۔ مخالفین نے الیکشن کو کفر و اسلام کا معرکہ قرار دے دیا تھا۔ بڑے بڑے سپیشلسٹ ڈاکٹرز کو اکٹھا کر کے قرآن پاک پر حلف لیا گیا کہ 'بے دین' لوگوں کو ووٹ نہیں دینا۔ گویا ہمیں دائرہ اسلام سے ہی خارج کر دیا گیا۔

اِکا دُکا جھڑپیں بھی ہونے لگیں۔ خواتین ڈاکٹرز کی بھاری تعداد ہماری سپورٹر تھی۔ ان کے گھروں پر مخالفین کے وفد جانے لگے۔ وہی روایتی ہتھکنڈے جو کہ زمانۂ طالب علمی سے ان کا وطیرہ رہا ہے۔ ڈراؤ، دھمکاؤ اور کردار کشی کی ناجائز مہم۔ پنجاب بھر سے ناظمین جمع ہو کر، مخالف گروپ کے لیے مہم چلا رہے تھے اور ہمیں کہہ رہے تھے کہ نوشتۂ دیوار پڑھ لو اور مقابلے سے دست بردار ہو جاؤ۔ اس اعصاب شکن صورتِ حال میں ہم نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہماری مہم اپنے منشور اور سابقہ کارکردگی پر مبنی تھی۔ جبکہ مخالف گروپ اپنے منشور کی بجائے، ہماری ذاتی مخالفت پر مہم چلا رہا تھا۔ ہمیں مختلف ذرائع سے پیغام دلوائے گئے کہ باعزت راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے مگر ڈاکٹر مقبول اختر صاحب نے کہا کہ

''مقابلہ شروع ہو چکا ہے۔''

اور قلم سے کاغذ پر لکھا

'الیکشن آن (✓)'

ہمارا جوش وجنوں دیدنی تھا۔ ہم نے مارشل لا کے بدترین مظالم سہے تھے۔ سرخ سویرے اور تبدیلی کے خواب دیکھے تھے۔ لالہ حیدر اور فیض احمد فیضؔ کے قدموں میں بیٹھ کر تحریکیں منظم کرنا سیکھا تھا۔ ہم الیکشن سے کیسے دست بردار ہو جاتے اور چند سیٹوں پر قناعت کر لیتے۔ ہمیں خصوصی طور پر یہ کہا جا رہا تھا کہ صدارت سے ڈاکٹر مقبول اختر کو دست بردار کرا لیں تو بات ہو سکتی ہے مگر تبدیلی کے خواہاں روشن اذہان کو اپنے قائد کو سرخرو کرنا تھا۔

آخر پولنگ کا دن آ گیا۔ جب میں سابقہ جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے تقریر کر کے ڈائس سے واپس آیا تو مقبول اختر نے کہا۔

"تم نے تقریر کا حق ادا کر دیا ہے۔ آج فیض احمد فیضؔ تم سے خوش ہوں گے اور جن ڈاکٹرز کے کان سنتے ہیں وہ دماغ سے کام لیں گے۔"

ووٹنگ شام چار بجے تک جاری رہی۔ جب ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی تو مخالف گروپ نے افواہ اڑا دی کہ 'انقلابی' الیکشن ہار گئے ہیں بلکہ صدارتی امیدوار سینئر سپیشلسٹ صاحب نے خطبۂ صدارت دینا بھی شروع کر دیا کہ ہم نے تو باعزت راستہ دینے کی کوشش کی مگر!!!

ڈاکٹر مقبول اختر صاحب، ڈاکٹرز کے گروپ کے ساتھ گھاس پر بیٹھے تھے۔ وہ یہ افواہ اور صدارتی امیدوار کی تقریر سن کر گھاس پر لیٹ گئے اور چند لمحے متفکر ہوئے۔ (یہ مجھے بعد میں دوستوں نے بتایا کہ میں اس دوران ووٹوں کی گنتی کروا رہا تھا)

ابھی ووٹوں کی گنتی جاری تھی۔ میں نے واضح برتری دیکھی کہ ہم فیصلہ کن فتح حاصل کر چکے ہیں اور ہمارا سارا پینل جیت گیا ہے۔ میں نے باہر آ کر 'انٹرنیشنال' کا نعرہ بلند کیا تو ڈاکٹر مقبول اختر صاحب عالم وارفتگی میں مجھ سے لپٹ گئے اور تمتماتے چہرے کے

ساتھ مبارکباد وصول کرنا شروع کی۔

معاملہ فہم اتنے تھے کہ مجھے فوراً کہا کہ جاؤ اور مخالف گروپ کے امیدواروں سے ملاقات کرو۔ تمام رنجشیں ختم اور یہ کہ آئندہ سال ہم الیکشن میں مخالف گروپ کو باڈی تشکیل دینے کی دعوت دیں گے بلا مقابلہ اور آئندہ الیکشن میں ہم نے کمال ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قائد ڈاکٹر مقبول اختر کا وعدہ پورا کیا۔ یہ اور بات کہ مخالف گروپ کو باڈی کی تشکیل کے لیے ڈاکٹرز پورے نہ مل سکے مگر ہم نے ادھوری ایگزیکٹو باڈی بھی قبول کر لی۔۔۔ دوستوں نے اعتراض کیا تو میں نے انہیں کہا کہ ہم اپنے پیرِ مغاں کی بات کیسے ٹال سکتے ہیں۔

آج فیصل آباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پورے پنجاب ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کی قیادت کر رہا ہے۔ (میں ڈاکٹرز ایسوسی ایشن پنجاب کا صدر ہوں) اور اپنے عظیم قائد ڈاکٹر مقبول اختر صاحب کی سوچ وفکر کو آگے بڑھانے میں دن رات کوشاں ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر جیسے لوگ، تاریخ اور عہد ساز ہوتے ہیں۔ انہی عظیم لوگوں کے دم سے جذبے جوان اور تحریکیں زندہ ہیں۔ یہی لوگ جذبوں کو مہمیز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مقبول اختر نے اپنے کالموں، تحریروں کے ذریعے، روشن خیالی، رواداری اور انسان دوستی کا سبق دیا۔ وہ اکثر افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ ہم لوگوں سے دیہات میں کام نہیں ہو سکا اور جب تک دیہاتی منظم نہیں ہوں گے، تبدیلی نہیں آئے گی۔ ایک دن موڈ میں تھے، کہنے لگے:

"یونس، فکر نہ کرو، ہم نے اپنا کام مکمل ایمانداری سے کیا ہے۔ آنے والے دنوں میں خواب گم شدہ کی لو جاگ اٹھے گی۔ ظلم کو ابھی مزید بڑھنا ہے مگر سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کے بزرجمہر کب تک غیر یقینی کیفیت کے درمیان سفر کرتے رہیں گے اور کن تباہیوں کی طرف اپنے جواں قافلوں کو دھکیلتے رہیں گے۔"

ڈاکٹر مقبول اختر دن کو مسیحائی اور رات کو دانشوری فرماتے۔ تحریر وتحریک کے

ذریعے غریب کی زندگی میں انقلاب لانے کے منصوبے۔۔۔ یہ وہ دور تھا جب اولیائی اور مسیحائی کے راستے الگ الگ نہیں ہوئے تھے۔ مسیحا بھی، اولیاء کا رُوپ دھارے ہوئے تھے۔ (اب تو مسیحائی بھی کاروبار (کمرشل) ہو چکی ہے۔) ڈاکٹر مقبول اختر آخری سانس تک اولیائی کے درجہ پر فائز رہے۔

وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے بذلہ سنج اور زندگی کو بھرپور انداز سے گزارنے پر یقین رکھتے تھے۔ میں کس کس یاد کو آواز دوں؟

ے در و دیوار پہ اک حسرت سی برستی ہے قتیلؔ
جانے کس دیس گئے پیار نبھانے والے

وہ خوبصورت جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ ہمیشہ ہسپتال اور کلینک میں تازہ پھول یا کسی درخت کی سرسبز ٹہنی توڑ کر گلدان میں ضرور رکھتے۔ انہیں کھلتی بہار کے سبھی پھولوں اور رنگوں سے پیار تھا۔

ے بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

آج جب کہ اقدار کی بوسیدگی نے شعور و محبت کے درمیان ایک کچے دھاگے کا ناتا بھی نہیں چھوڑا ہے۔ ڈاکٹر مقبول اختر، محبتیں بانٹتے پھرتے تھے۔

ع تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

ایک روز مجھ سے کہنے لگے:

''شاعری تم بھاگتے دوڑتے کرتے ہو۔ نثر کی روٹی کچی اتار لیتے ہو۔ صحافت نما نثر نگاری کا مقصد؟ شاعری پر سنجیدگی سے توجہ دو۔''

میں مدرسوں، ان کے طرزِ تعلیم اور معاشرے پر ان کے اثرات پر تحقیق کر رہا تھا کہ سارا مسودہ منگوا لیا اور کہنے لگے کہ کوئی اور کاپی محفوظ ہے؟ میں نے انکار کیا تو مسودے کو

دراز میں بند کیا اور فرمایا۔

''ہمیں آپ سے محبت ہے، کچھ دن اور جی لو!''

پھر وہ مسودہ کبھی واپس نہ کیا۔ وہ ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے تھے کہ پاکستان میں بہت خون بہے گا۔ مذہب کے ٹھیکیدار اس سرزمین کو لہو رنگ کیے بغیر باز نہ آئیں گے اور ہمارے عساکر ان کی حمایت میں بہت آگے چلے گئے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب دونوں باہم متصادم ہوں گے۔

ڈاکٹر مقبول اختر کی رحلت، ہماری زندگی کی کتاب میں دکھوں، آہوں اور غموں کے کئی باب رقم کر گئی ہے۔ ان کا وژن، حوصلہ، حق گوئی و بے باکی کی داد تو ان کے مخالف بھی دیتے تھے۔ ان کی موجودگی ہمارے لیے تقویت کا باعث تھی۔

میری متاعِ جان، والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تو ہسپتال سے میں نے ڈاکٹر مقبول صاحب کو فون کیا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد کہنے لگے:

''اتھے کینے رہ جانا اے!'' اوناں دی قبر دے نال ہور پیاریاں دیاں قبراں نے۔

میں والدہ محترمہ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے گیا۔ واپس آ کر ملنے گیا تو ابھی میں نے شیو نہیں کی تھی۔ کہنے لگے:

''مولانا یونس ایاز، باہر کا حال تو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اندر کا حال 'رب جانے' یا 'تو جانے'۔''

میں نے کہا:

''انشاء اللہ آپ بھی عمرہ کے لیے تشریف لے جائیں گے۔'' تو ہنس کر کہنے لگے:

''لگدا اے میری بیگم نے تینوں وکیل کر لیا اے۔''

پھر وہ عمرہ کے لیے گئے لیکن بیگم ڈاکٹر مقبول اختر وہیں پر شدید بیمار ہو گئیں اور واپس آتے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر مقبول صاحب بمعہ بیگم صاحبہ میری شادی پر تشریف لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو فرمانے لگے:

''تیرا دو جا ویاہ اے۔ میں بیگم نوں وکھان لے آیا واں۔''

ڈاکٹر مقبول اختر نے عجیب قلندرانہ طبیعت پائی تھی۔ نہ کبھی کسی سے شکوہ، نہ شکایت۔ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی کبھی حوصلہ نہ ہارا تھا بلکہ ہمیشہ دوسروں کو حوصلہ بخشا۔

ڈاکٹر مقبول اختر جیسے پر صفت، پر خیال رفیق کی عظمتوں کے تمام 'مسلمان' قائل ہوئے اور محبتوں کے اسیر بھی۔ وہ ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں روشن ستارے کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔

ع   لا کے رکھیو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

وہ میرا ہمدم، میرا مونس، میرا ہم راز بہت نفیس انسان تھا۔ ان کی یاد میں آج ہر لفظ روتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوستوں کو خوش دیکھنا چاہتے کہ ایک نامور ماہرِ نفسیات بھی تھے۔ ایک دن کہنے لگے:

''تمہیں جمیلہ ہاشمی کا 'دشت سوس' نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ تم تو حسین بن منصور بننے کے منصوبے بناتے دکھ رہے ہو۔ تمہاری آغول کدھر ہے؟ پہلے آغول کو ڈھونڈ لو۔''

محمود شنا کو 'دشت سوس' منظوم کرنے کو کہا۔

ایک دن مجھے بہت جذباتی کر دیا۔ کہنے لگے:

''اب میری آواز عالمِ بالا سے آئے گی۔ تم یہی سمجھنا۔''

پھر میری طرف فون بڑھایا اور کہا:

''بیٹے کو منا کر گھر لاؤ۔ ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدے۔''

میں متامل تھا۔۔۔ کہنے لگے:

''میرے اندر جھانک سکتے تو تمہیں پتا چلتا کہ کچھ محبتوں کے گوشے ادھورے ہیں۔ جاؤ، ابھی جاؤ، کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔''

پھر واقعی بہت دیر ہو گئی۔

اپنی چھوٹی بیٹی زرشی کے لیے وہ بہت متفکر رہتے۔ ڈاکٹر مقبول اختر کی بیماری اور علاج کے لیے، ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر زرقا۔۔۔ ان کے شوہر عامر عزیز۔۔۔ اور بچوں نے دن رات ایک کر کے حق ادا کر دیا۔ بہن منزہ اب تک یہ حق ادا کر رہی ہیں۔ بیٹیاں اور بہنیں شاید کسی اور ہی مٹی کی تخلیق ہوتی ہیں۔

منزہ بہن کی یادوں بتی 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا ڈاکٹر بھائی اور اعلیٰ اقدار کے حامل مشرقی گھرانے کا تصور اب ناپید ہوتا جا رہا ہے کہ اس دور میں ہم بھاگ دوڑ رہے ہیں اور خوشیاں ہم سے کہیں پیچھے رہ گئیں ہیں۔ ڈاکٹر مقبول اختر خوشیاں بانٹتے بانٹتے شہرِ خموشاں جا بسے۔ دوسروں کے کام آنا اور اعلیٰ انسانی اقدار اور دوستی اور نظریہ کی پاسداری تو شاید ان کی فطرت تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ باہمی محبت اور خوش اخلاقی کو عبادت کا درجہ دے اور اسے نجات کی شرط بنا دے تو!

ے   داورِ محشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو میرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

OOO

رفتید، و لے نہ از دلِ ما

—زمان خان—

پاکستان کی حکمران اشرافیہ نے پہلے ہی دن سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ملک میں ترقی پسند سیاست کو پنپنے نہیں دینا۔ آج تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب بھی ترقی پسندوں نے اشرافیہ کی قیادت میں ترقی پسند سیاست کرنے کی کوشش کی تو انھیں نقصان ہوا لوگوں کا شعور آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے گیا۔ یہی وجہ تھی کہ میجر اسحاق اور ان کے ساتھیوں نے نیشنل عوامی پارٹی سے الگ ہو کر پاکستان مزدور کسان پارٹی بنائی۔ مقبول اختر کی زندگی کو پاکستان کی ترقی پسند تحریک کی تاریخ کو جانے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن یہ ایک طویل سفر ہے اس لیے میں اس کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھائے رکھتا ہوں۔

یار کوئی لطیفہ سناؤ۔۔۔ ڈاکٹر مقبول اختر ملتے ہی کہتے۔۔۔ لطیفہ ''شاید پرانا ہے یا ہم نے پہلے سن رکھا ہے۔'' جواباً دوست کہتے۔ مقبول کا جواب ہوتا۔ لطیفہ کبھی پرانا نہیں ہوتا اور اگر آپ نے پہلے سن رکھا ہو تو اخلاق اور تہذیب کا تقاضا اور لطیفہ سننے کے آداب یہ ہیں کہ آپ ہمیشہ جواب دیں کہ آپ نے پہلے یہ لطیفہ کبھی نہیں سنا۔۔۔ یہ تھے ہمارے ساتھی

اور دوست ڈاکٹر مقبول اختر۔۔۔ میں سنجیدگی سے سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس سے آگے کچھ بھی نہ لکھوں تو مقبول کی شخصیت ان چند لائنوں سے سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ سطور مقبول کی شخصیت کی مکمل عکاسی کرتی ہیں کہ وہ کتنے عظیم انسان تھے۔ ان میں حسِ مزاح کتنی تھی اور وہ کتنے مہذب، حسّاس اور دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنے والے تھے۔

دِل تو چاہتا ہے کہ بات یہاں ختم کر دوں مگر ڈر ہے کہ میری بہن منزہ مجھے معاف نہیں کریں گی۔ لہٰذا ان کے احترام میں کچھ مزید عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں کافی دیر سوچتا رہا کہ اس واقعہ کا ذکر کروں کہ نہ مگر مقبول کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کا ذکر ضروری ہے۔ ایک رات کو ایک ساتھی ایک بجے کے قریب میرے گھر آیا کہ اس کے والد قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ میرا تو کسی ڈاکٹر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں ان کو لے کر فوراً ڈاکٹر مقبول کے گھر گیا اور وہ شب خوابی کے لباس میں ہی ہمارے ساتھ ہسپتال گیا۔

ایک ایسے شخص کے بارے میں لکھنا جس سے آپ کے کئی رشتے ہوں بہت ہی مشکل کام ہے مگر جس کے بارے میں آپ کو یقین نہ ہو کہ وہ آپ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے اس کے بارے میں لکھنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر سے پہلا اور دائمی سیاسی رشتہ تھا گو اس کے بعد کئی رشتے پیدا ہو گئے مگر اوّل اور آخر دائمی رشتہ سیاسی ہی رہا۔

لاہور سے ایک دن میجر صاحب اچانک مزدور کسان پارٹی کا رسالہ جسے سرکلر کا نام دیا گیا تھا اُٹھا کر لائل پور لے آئے اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری لائل پور کی پارٹی کے ذمہ لگ گئی۔ ظاہری طور پر تو یہ ذمہ داری میجر صاحب ہی کی تھی مگر غلام نبی کلّو صاحب کے علاوہ مقبول اختر اور منظور نیازی (ان سب کو مرحوم لکھنے کو دل نہیں چاہتا) بھی اس ادارتی بورڈ کے رُکن تھے۔ وہ زمانہ کمپیوٹر کا نہیں تھا لہٰذا پہلا کام تو کاتب تلاش کرنا تھا اور پھر اس کی

اشاعت کے کئی مراحل ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں پارٹی سرکلر جیسے بے ضرر پرچہ کو بھی سامراج اور اس کی پٹھو حکومت بم بنانے کا نسخہ ہی سمجھتے تھے اور اس کے نکالنے والوں کے بارے میں ان کا رویہ بھی ''دہشت گردوں'' سے نپٹنے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ کس طرح منظور نیازی کو سرکلر کے پرنٹر نے ہی بھٹو مخالف تحریک کے دوران خود مخبری کر کے گرفتار کروادیا تھا میں آپ کو بتاتا چلوں کہ کتابت کی غلطیاں لگانے کا کام ڈاکٹر مقبول، منظور نیازی اور میرے ذمہ تھا۔ ہم پرچہ کو پریس میں بھیجنے سے پہلے رات گئے تک اس کی غلطیاں اور پھر غلطیوں کی غلطیاں لگاتے تھے اور جب یہ کام مکمل ہو جاتا تو پھر اس کا جشن گرمیوں میں آئس کریم اور سردیوں میں کھیر یا حلوہ کھا کر مناتے تھے۔ آپ پریشان نہ ہوں اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب ایک قسم کے 'مولوی' تھے وہ تو بھلا ہو ان کی ہارٹ سرجری کا کہ اس سے ان کی قلب ماہیت بھی ہو گئی اور انھوں نے عام آدمیوں والی زندگی بسر کی، جو ایک بہت ہی صحت مند تبدیلی تھی۔ جس کے سہارے وہ کئی سال جیے۔

کیونکہ ڈاکٹر صاحب طبیب بھی تھے اس لیے یقین کریں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمارے خاندان کی صحت کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ڈاکٹر مقبول اور ڈاکٹر احسان پر تھی۔ آج کے دور میں احساس ہوتا ہے کہ یہ کتنا پیچیدہ اور مشکل کام تھا کیونکہ وہ ساری پارٹی کے کامریڈوں کی صحت کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ میں ڈاکٹر احسان کی درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوں کیونکہ وہ یہ کام آج بھی اسی اخلاق، جذبہ اور لگن کے ساتھ کر رہے ہیں۔

باقی نشتر میڈیکل کالج کے زمانے کا حال تو ڈاکٹر احسان ہی بتا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مقبول اختر، ڈاکٹر احسان الحق اور میرے تایازاد بھائی ڈاکٹر جان محمد سے ایک سال سینئر تھے۔

جیسا کہ درمیانے طبقہ کی اکثریت کو زندہ رہنے کے لیے بہت سارے جتن کرنے پڑتے ہیں مقبول کو بھی تلاشِ روزگار کے لیے مسقط جانا پڑا مگر جلد ہی واپس آگئے اور پرائیوٹ پریکٹس شروع کر دی۔ میجر صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ (ڈاکٹر مقبول کے والد اور ان کے

بہنوئی) ڈی ایس پی غلام رسول ایک ایماندار افسر تھے۔

مقبول کو مارکسسٹ فلسفہ ننھیال کی طرف سے ورثہ میں ملا۔ میجر اسحاق ایم اے او کالج امرتسر میں اس کے گھائل ہو گئے تھے گو بعد میں وہ فوج میں شامل ہو کر دادِ شجاعت حاصل کرتے رہے مگر انور ماموں تو پارٹی کے کل وقتی کارکن تھے مگر بعد میں ایسے رخصت پر گئے کہ اسی حالت میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ میجر اسحاق کبھی کبھی بابا گورونانک کے حوالے سے اپنے اور مقبول کے رشتہ کا ذکر کرتے تھے۔

میجر اسحاق نے جب اپنے ہند سندھ کے فلسفہ کو عوامی سطح پر پیش کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس کام کے لیے مقبول اختر کو ہی چنا۔ گو وہ اپنے ڈرامہ 'مصلی' میں اس کو پیش کر چکے تھے۔ مجھے یاد ہے حلقہ اربابِ ذوق کا سالانہ جلسہ کارپوریشن ہال میں تھا اور بنیادی مقالہ ڈاکٹر مقبول اختر کو پڑھنا تھا ہم لائل پور سے چند ساتھی لنگر لنگوٹ کس کر مقبول کو اخلاقی امداد پہنچانے کے لیے میجر اسحاق کی سربراہی میں لاہور گئے۔ یقین کریں کہ مقبول اختر کے تھیسس کی بڑے بڑے سینئر دانشوروں کو بھی داد دینا پڑی۔

ڈاکٹر مقبول اختر ایک صاحب طرز لکھاری تھے ان میں ایک خاص قسم کی حس مزاح تھی۔ انہیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جن لوگوں نے ان کے 'آؤٹ لک' میں مضمون پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان میں کتنی کاٹ تھی اور انہیں شستہ انگریزی میں اپنی بات کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔ لکھنے کا کام انہوں نے کبھی بھی نہیں چھوڑا اور آخری سالوں تک ایڈیٹر کے نام خطوط کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بدقسمتی سے بہت کم لکھا مگر جو بھی لکھا وہ خوب لکھا۔ اب ان کی تحریروں کو ڈھونڈ کر کتابی شکل دینے کی سخت ضرورت ہے۔ میری تجویز ہے کہ منزہ کو مقبول کی ساری تحریریں اکٹھی کر کے چھاپ دینی چاہییں۔

ڈاکٹر مقبول کا کہنا تھا کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی خیال آئے تو فوراً اس کو لکھ کر

پرچی ڈال لیا کریں کیونکہ بعد میں لاکھ آپ اسے یاد کرنے کی کوشش کریں وہ آپ کو یاد نہیں آتا۔ لہٰذا ڈاکٹر مقبول اختر کی کلینک کی میز کی دراز میں جہاں وہ مریضوں کی فیس اور کل وقتی کارکنوں کا مشاہرہ رکھتے تھے وہاں پرچیوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی۔

یہ کل کی بات ہے کہ ہم صفدر کو لاہور بیاہنے گئے اور اس کے بعد منزہ بہن کی شادی بھی میجر اسحاق کے اکلوتے بیٹے میجر سلیم کے ساتھ ہو گئی۔ مگر کیا پتہ تھا کہ صفدر ہم کو اتنی جلدی چھوڑ جائے (ڈاکٹر مقبول کا چھوٹا بھائی) گا۔ مجھے یاد ہے کہ صفدر کے جنازے کے موقع پر مقبول کہہ رہا تھا کہ We are now in the firing line

مجھے یاد ہے کہ مقبول کی اوپن ہارٹ سرجری تھی اور اس زمانے میں یہ کام صرف راولپنڈی میں ہی ہوتا تھا۔ جس دن مقبول کا آپریشن تھا تو ڈاکٹر احسان کا خیال تھا کہ ہمیں آپریشن سے پہلے مقبول کو ضرور مل کر آنا چاہیے لہٰذا ہم لوگ مقبول کو ملنے گئے۔ یقین کریں کہ آپریشن سے چند گھنٹے پہلے تک اس کی حس مزاح زوروں پر تھی اور اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ اس کی چیڑ پھاڑ ہونے والی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس دن مقبول کا آپریشن تھا اسی دن جنرل ضیاالحق نے ہسپتال کا دورہ کیا اور ڈاکٹروں نے مقبول کو بھی جنرل ضیا کے سامنے پیش کیا۔ ہم کئی سال تک مقبول کی اس ملاقات کا مذاق اُڑاتے رہے۔

میں جب مزدور کسان پارٹی میں شامل ہوا تو ایک شام منظور نیازی صاحب نے منصور آباد میں دوستوں کا اکٹھ کیا اور مجھے بھی بلایا وہاں دوستوں نے سوال کیا کہ تم تحریک میں کیوں شامل ہوئے تو میرا دو لفظی جواب تھا کہ یہ ایک شعوری فیصلہ تھا کوئی طبقاتی مجبوری نہیں تھی، مقبول کا بھی یہ شعوری فیصلہ تھا کوئی طبقاتی مجبوری نہیں تھی اور اس فیصلہ پر وہ ساری عمر قائم رہا۔ لوگ آج کل پوچھتے ہیں کہ جس مشن کو تم لوگ لے کر نکلے تھے اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے نظریہ کی وجہ سے ہم لوگ سرمایہ داری نظام کی لوٹ مار کا حصہ بننے سے بچے رہے۔ ہم نے کسی کا حق نہیں مارا بلکہ عوام کو حق دلوانے کے لیے

ساری عمر لڑتے رہے، ناانصافی اور بے ایمانی کے نظام کی آلائشوں سے بچے رہے۔ سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کی۔۔۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ rat race سے بچے رہے۔ اس سے بڑی کیا بات ہے کہ کسی کا حق نہیں چھینا۔ کسی کا مال ہڑپ نہیں کیا۔ کسی کی ٹانگ نہیں کھینچی۔ کسی کی برائی یا چغلی نہیں کی۔ کسی کمزور پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

فیض احمد فیض سے میجر صاحب کی بہت ذاتی دوستی تھی وہ ایم اے او امرتسر کالج میں فیض صاحب کے شاگرد تھے۔ پچھلی صدی کی ستر کی دہائی میں فیض صاحب کی سالگرہ کا لائکپور میں پروگرام بنایا گیا دلچسپ بات یہ ہے کہ جس شخص کو میجر صاحب نے فیض سے نوکری دلوائی تھی اس نے فیض صاحب کے خلاف سٹیج سے مضمون پڑھنا شروع کر دیا۔ فنکشن کے بعد فیض صاحب ساقی صاحب کے گھر پیپلز کالونی چلے گئے۔ ہم نے ڈاکٹر احسان سے خواہش کا اظہار کیا کہ ہمیں ساقی صاحب کے گھر لے چلیں۔ ساقی صاحب، ڈاکٹر احسان کے دوست اکرم کے بہنوئی تھے اور فیض صاحب لائکپور میں انہیں کے گھر رہتے تھے۔ ہم پیدل پیپلز کالونی گئے ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ ایک ساتھی (میں جان بوجھ کر نام نہیں لکھ رہا کیونکہ وہ ساتھی بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے) نے میجر صاحب کے بارے میں نازیبا زبان استعمال کی جس کی وجہ سے ہم فوراً وہاں سے واپس چلے آئے۔ مقبول اختر کا صبر اور ضبط قابل دید تھا۔

مجھے آخری دنوں میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، ڈاکٹر مقبول لوگوں کے ذہنوں کا علاج کرتے تھے مگر خود ان کے ذہن پر اثر ہوا، میں نے اس بات کو نوٹ کیا کہ وہ ایک فقرے میں کئی زبانوں کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ پنجابی ماں کی زبان تھی، اردو اور انگریزی پڑھائی کی زبان تھی، وہ عرب میں رہے اس لیے کچھ عربی بھی بولتے تھے اور ادب سے تعلق کی وجہ سے انہیں فارسی سے بھی لگن تھی تو ان سب زبانوں کو ایک ساتھ بولتے تھے غالباً مختلف

زبانوں کو الگ الگ رکھنے والے خانہ میں کچھ معاملہ گڑبڑ ہو گیا تھا، یہ تو کوئی ماہرِ نفسیات ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟

میں نے نہیں دیکھا مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بہت ہی خوش لباس تھے، مگر جیسا کہ ہوتا ہے کہ نظریہ انقلاب نے انہیں ڈی کلاس نہیں ری کلاس کر دیا تھا گو دل کے آپریشن کے بعد انہوں نے کچھ کچھ نارمل زندگی اختیار کر لی تھی۔

موت ایک حقیقت ہے مگر پتہ نہیں کیوں آدمی کو یقین نہیں آتا بعض لوگ جب دنیا سے رخصت بھی ہو جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی روز آپ کو حیران کر دیں گے اس کی غالباً وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس مشن کے لیے انہوں نے زندگی گذار دی ہوتی ہے۔ وہ مشن ابھی زندہ ہوتا ہے اور اس دوڑ (ریلے ریس) میں مشعل کو لے کر کوئی دوسرا کھلاڑی دوڑ رہا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر ایک Political Bird تھے۔ انہوں نے ساری زندگی مظلوم اور پسے ہوئے طبقات، افتادگان خاک کی آزادی کی جنگ لڑی اور اسی جدوجہد میں اس دنیا سے کوچ کر گئے مگر میری نظر میں وہ ققنس (اسی کی راکھ سے) کی طرح بار بار جنم لیتے رہیں گے جو کوئی بھی مقبول کے راستہ پر چلے گا وہ مقبول ہی ہو گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

آج کی دنیا میں گو اس مشن کے لوگوں میں اضافہ نہیں ہو رہا مگر یہ ایک وقتی مرحلہ ہے۔

میری نظر میں اگر کوئی شخص اپنے مشن پر قائم رہتا ہے گو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں بھی ہوتا تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

مقبول سے ملنے کے بعد چائے میں شکر کا استعمال بند کر دیا مگر میں آج بھی مقبول کی شیریں باتیں محسوس کرتا ہوں۔

ooo

ڈاکٹر بھائی

—پروفیسر شمیم ظفر رانا—

استادِ محترم، ڈاکٹر انوار احمد (نامور افسانہ نگار، نقاد) نے مجھے جب میجر اسحاق محمد کے ڈراموں پر تحقیقی کام سونپا تو میں نے بھی ہر نوآموز محقق کی طرح بڑے جوش و جذبے سے مطلوبہ معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ نتیجتاً جلد بلکہ فوراً ہی مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ فیض احمد فیض کے ہمراہ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کیے جانے والے میجر اسحاق محمد کا تعلق لائل پور کی تحصیل جڑانوالہ کے گاؤں 644 گ ب کوٹ صوفی سے تھا اور اب فیصل آباد کے معروف سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر مقبول اختر میجر صاحب کے بھانجے ہیں نیز یہ کہ مصنفہ منزہ سلیم میجر اسحاق کی بہو اور ڈاکٹر مقبول اختر کی بہن ہیں۔ ان کی تصنیف 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' پڑھ کر ان سے ملنے کی خواہاں تو تھی ہی، اب ان سے ملاقات کا ایک اور بہانہ ہاتھ لگا۔ بہر حال جی۔ سی یونیورسٹی فیصل آباد میں بیٹھے بٹھائے، ملنے والی ان فوری معلومات سے اک گونہ اطمینان ہوا اور اگلے ہی روز میں ڈاکٹر پروین کلّو کے ہمراہ ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک پر پہنچی۔ مسکراتی ذہین آنکھوں والی ایک متین شخصیت ہمارے سامنے تھی۔ ہم نے مدعا بیان کیا

تو انہوں نے اظہارِ مسرت فرمایا اور ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے 'ابتدائی امداد' کے طور پر اپنی میز کی دراز میں موجود مواد ہمارے سپرد کیا اور 'باقی آئندہ' کے لیے وقت متعین فرمایا۔ ہم معین وقت پر 'اگلی قسط' کی وصولی کے لیے پہنچیں تو ان کے گرد کچھ طالب علم نما نوجوان موجود تھے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے خاطر خواہ استفادہ کی غرض سے موبائل کا ریکارڈر آن کر دیا۔ وہ تعلیم اور نفسیات کے شعبہ میں متعارف ہونے والی اصطلاح Dyslexia پر بات کر رہے تھے کہ اس کا لغوی مفہوم الفاظ کا غیر منظم اور ناموزوں عارضہ ہے جس کی وجہ سے طلبہ کو الفاظ پڑھنے، یاد کرنے اور لکھنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی وجوہات Neurological ہوتی ہیں۔۔۔

''سر کیا 'بھولنا' بھی نفسیاتی عارضہ ہے؟''

ایک نوجوان کے اس سوال پر ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور معنی خیز انداز میں بولے:

''جو آپ کو بھول جائے، اسے آپ بھی بھول جائیں۔''

اس جواب پر کلینک جوان قہقہوں سے لبریز ہو گیا۔

؎ یاد کرنے کی ہم نے حد کر دی
بھول جانا ترا کمال سہی

اور فیض نے بھی تو کہا ہے:

؎ وقفِ حرماں و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احسان کا پاس رہتا ہے

(فیض احمد فیض کی شاعری سے ڈاکٹر صاحب بے حد متاثر تھے اور میجر اسحاق محمد کے تو فیض صاحب سے گھریلو مراسم تھے)

ڈاکٹر صاحب ایک دم سنجیدہ ہوئے۔

''بھولنا ایک نفسیاتی عارضہ ہے اور یہ کسی نفسیاتی الجھن کو ظاہر کرتا ہے۔''

کچھ روز بعد، آرٹس کونسل میں منزہ سلیم کی کتاب کی تقریب رونمائی میں ڈاکٹر صاحب کو سنا تو ان کے ادبی ذوق کا مزید اندازہ ہوا۔ میں نے اس جذباتی سی تقریب میں اپنے بھائی رفیق رائے مرحوم کو یاد کر کے آنسو بہائے تو ڈاکٹر صاحب اپنے بھائیوں کی یاد میں آبدیدہ ہوئے۔ بہرحال اس تقریب کے بعد منزہ سلیم میری 'منزہ آپی' اور ان کے ڈاکٹر بھائی 'میرے' ڈاکٹر بھائی ہو گئے۔

آٹھ فروری ۲۰۱۰ء کی ایک نیلی سی شام، میں یونیورسٹی میں ایم۔فل کی کلاس میں تھی کہ منزہ آپی کا فون آیا کہ ڈاکٹر بھائی، کراچی سے دماغ کے کامیاب آپریشن کے بعد شام کی فلائٹ سے سیدھے میرے گھر آ رہے ہیں اور میں نے اسی خوشی میں چند قریبی دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ تمہیں ضرور آنا ہوگا۔ چنانچہ کلاسز کے بعد آپی کے جدید اور کشادہ گھر پہنچی تو یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر بھائی تشریف لا چکے ہیں۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، ایسا ہشاش بشاش Serious مریض کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سنگین بیماری اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کی تکان قطعاً ہویدا نہ تھی۔ البتہ ان کی قوت سماعت مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ منزہ آپی نے وائیٹ بورڈ پر لکھ کر ان سے پوچھا۔

''یہ کون ہیں؟''

''شمیم ظفر رانا'' انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرا پورا نام لیا تو بے حد خوشی ہوئی۔ اسی وقت، حال ہی میں اپنی مرتب کردہ میجر اسحاق کی کتاب 'نشتر غمزے' اپنے دستخط کر کے مجھے دی تو گویا اس 'آخری ملاقات' کو سند عطا کر دی۔ قریبی رشتہ داروں کے علاوہ قرابت داروں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ معروف کرکٹ کمنٹیٹر محمد ادریس، مشہور معالج ڈاکٹر احسان الحق بھی موجود تھے جو کہ ڈاکٹر بھائی کے نہایت عزیز دوست ہیں۔ آپی نے پر تکلف

کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک روایتی مشرقی بہن کا اپنے 'ویر' کے لیے اظہار محبت دیدنی تھا۔

اگست کے اوائل میں ملتان اور فیصل آباد کی گرمی کی شدت سے گھبرا کر چند روز کے لیے مری گئی تو آپی کا فون آیا کہ ڈاکٹر بھائی۔۔۔
ایک غیر معمولی خبر، انہوں نے خلاف معمول مختصر الفاظ میں قدرے تاخیر سے دی اور جواباً میں بھی خلاف عادت خاموش رہی۔ مری کے سبزہ زاروں نے اداسی اوڑھ لی اور دراز قامت چیڑ، خزاں کی آغوش میں چلے گئے۔

ع یہ مسافر لوگ، پت جھڑ میں چلے جاتے ہیں دور۔۔۔

یہ مضمون لکھنا میرے لیے کارے دارد تھا، مگر یہ ایک عالمی سچ ہے کہ کچھ کام بادلِ نخواستہ بھی کرنے پڑتے ہیں۔

ooo

صاحبِ علم

۔صبیحہ ادریس۔

یہ 1966ء کی بات ہے کہ ادریس ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر تھے۔ میری شادی کو دو سال ہو چکے تھے جب ادریس کو خاندانی مفاد کی خاطر براڈکاسٹنگ کو خیر باد کہہ کر میرے بھائی کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونا پڑا۔ ہم کراچی سے فیصل آباد آئے اور یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے شکر کے ساتھ آباد ہیں۔ لائل پور اور پھر بعد میں فیصل آباد۔ میں سوچتی ہوں اگر ڈاکٹر بھائی تک رسائی نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ ڈاکٹر بھائی گلبرگ میں ہمارے گھر کے پاس ہی کلینک کرتے تھے۔ ادریس کا تعارف ڈاکٹر بھائی سے محمد اسلم صاحب کے میڈیکل سٹور پر ہوا۔ ادریس کا ایک لطیفہ ڈاکٹر بھائی کو ایسا پسند آیا کہ دونوں ایک دوسرے کا خیال کرنے والے اور پھر بہت قریب ہو گئے۔ ڈاکٹر بھائی، ادریس کے کرکٹ کلب میں باقاعدہ شامل ہوئے اور دل لگا کر کرکٹ کھیلی ایسٹرن کرکٹ کلب کے صدر بھی رہے۔ میرے شوہر کو کرکٹ کمنٹیٹر بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا وہ علم کا دریا تھے ہر شعبہ میں سند کا درجہ رکھتے تھے اور علم کے سلسلہ میں کھل کر مدد کرتے تھے۔ ملتے جلتے ہمارا ڈاکٹر مقبول کے خاندان سے ایسا تعلق ہوا کہ ہم ان کے خاندان کا حصہ سا بن گئے۔ ہمیشہ ہنستے رہنے والے

ڈاکٹر بھائی نے ہمارے گھر میں ایسی بابرکت خوشگوار خوشبو بکھیر دی جو اُن کے رُخصت ہونے کے بعد بھی آئے چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مقبول اپنی تین بچیوں کے ساتھ ہماری ہر تقریب میں موجود ہوتے۔ ہمیں ڈاکٹر بھائی سے اتنا کچھ ملا جو شاید اپنوں سے نہ مل سکا۔ کبھی سوچتی ہوں میرے اِتنے ہنس مکھ بھائی کو اتنا بہت سارا ''غم'' کیوں ملا؟ میں نے اپنی زندگی میں کسی ایک بھائی کو اتنا غم اُٹھاتے نہیں دیکھا۔ تمام زندگی انھوں نے سانحوں کے ساتھ گزاری وہ اس طرح جیے

ع چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے

1985ء میں وہ دِل کے عارضہ میں مبتلا ہو کر بائی پاس کے لیے راولپنڈی گئے۔ کتنے لوگ تھے جن کا مشورہ تھا کہ وہ انگلینڈ یا امریکہ جائیں، لیکن ڈاکٹر بھائی کو وطنِ عزیز کی مٹی سے پیار تھا اور ہنر مند لوگوں میں ان کا کامل یقین تھا۔ ڈاکٹر بھائی نے کسی کی نہ مانی اور پاکستان میں بائی پاس کرایا۔ یاد رہے کہ ان دنوں پاکستان میں بائی پاس شاذ شاذ ہوتے تھے۔ پنڈی جانے سے قبل انھوں نے مجھ سے کہا ''بھابھی سن لو میں گیا اور آیا تیاری کر لو واپس آ کر میں آپ کے ہاتھ کے بنے ہوئے اچھے اچھے کھانے دِل بھر کر کھاؤں گا۔''

اللہ کے کرم سے جب کامیاب علاج کے بعد فیصل آباد آئے تو آج بھی ان مجلسوں کی یاد آتی ہے جس میں ڈاکٹر مقبول اختر ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ، ڈاکٹر احسان الحق، پروفیسر رانا ارشاد، ڈاکٹر فیاض محمود آتے اور رات گئے تک محفل جمی رہتی۔ علم و دانش کے یہ لوگ پتہ نہیں کن موضوعات پر پڑھی لکھی گفت گو کرتے رہتے اور ادریس نیند سے باقاعدہ لڑتے نظر آتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرا احساس یہ تھا کہ ادریس اس محفل کا حصہ ہوتے ہوئے بھی حصہ نہ تھے یوں لگتا تھا کہ علم و دانش کی باتیں ان کے سر سے گزری جا رہی ہیں۔ ادھر میں اور مسز مقبول سوتے جاگتے باتیں کرتے رہتے۔ ظاہر ہے عورتوں کا مقبول موضوع

کوئی تیسری عورت ہی ہوتی یا نئے سوٹ اور ڈیزائن کی باتیں۔ ڈاکٹر بھائی کے بیوی بچوں کے ساتھ ہمارا ایسا اعتماد تھا کہ ڈائری کے خانہ میں جہاں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ''حادثہ کی صورت میں کس کو اطلاع دیں'' تو اس میں ڈاکٹر مقبول اختر کا نام و پتہ لکھا ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر زندگی سلیقہ سے گزارنے، بچوں کی ٹھیک پرورش کے لیے میں جب اُن سے بات کرنا چاہتی وہ وقت دیتے اور ہمیشہ بہت حوصلہ دیتے۔ وہ مجھے اور بھی پیارے اس لیے ہوئے جب میرے بھائی عارف کبیر جعفری سے ان کی ملاقات ہوئی پھر ان دونوں کی اچھی مزے کی محفلیں تھیں جو مجھے کبھی نہ بھولیں گی۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ میری باتیں جو ڈاکٹر مقبول کے بارے میں پڑھ رہے ہیں کہیں کہ یہ بکھرے ہوئے خیالات کیا ہیں؟ صبیحہ، ڈاکٹر مقبول کے بارے میں کہنا کیا چاہتی ہیں؟ بات سچ ہے مَیں اُن کو دل سے یاد کرتی ہوں اُن کی مغفرت کے لیے دُعا کرتی ہوں شاید اس عظیم شخصیت کا ٹھیک خاکہ نہ پیش کر سکی پر یہ تو ادیبوں کا کام ہے۔ کچھ چیزیں الفاظ کی صورت میں مَیں فراہم کر دیتی ہوں۔ جتنی عمدہ شکل آپ بنا سکیں بنا لیں۔ حسین و جمیل، دراز قد مسکراتا چہرہ، خوش لباس۔ اقدار کا پاسبان، صاحبِ علم، آتے ہیں جو کام دوسروں کے۔

ooo

فیصل آباد کا ایک اور مسیحا رخصت ہوا

—پروفیسر صادق حسین—

فیصل آباد کا ایک مسیحا مختصر علالت کے بعد چپکے سے اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا، وہ اس فانی دنیا سے چلا گیا جسے مہاتما بدھ نے دکھوں کا گھر قرار دیا تھا۔ یہ وہ دنیا ہے، جس میں ہر شخص غموں سے نڈھال اور دکھوں سے چور ہے۔ ہر شخص دل گرفتہ اور اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے فکر مند ہے، اس شخص کا جنازہ اٹھا تو بادل برسا، ہر آنکھ اشکبار ہوئی، چہرے غم کی تصویر بنے اور دھاڑیں مارتے ہوئے غریب لوگ بار بار اس شخص کی طرف اشارہ کر رہے تھے، جو کبھی ان کا مسیحا اور زندگی کی آخری امید تھا، یہ ڈاکٹر مقبول اختر کا جنازہ تھا۔ جس نے اپنی زندگی انسانیت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس نے ساری عمر نہ جائیدادیں خریدیں، نہ کوٹھیاں بنائیں، نہ بڑی بڑی گاڑیوں کی حسرت کی، وہ ایک پولیس آفیسر کا بیٹا تھا، جس نے شانِ امارت کی بجائے، شان قلندری کو ترجیح دی۔ جس نے اس حرص و ہوس کی دنیا میں غریب پروری اور مزدوروں کے حقوق کی بات کی، وہ غریبوں کا حامی دوست اور محبوب مسیحا تھا، میرا ان سے کوئی تعلق تھا تو ڈاکٹر اور مریض کا، انسانیت کا، محبت اور علم دوستی کا مضبوط بندھن تھا۔ جس نے مجھے ڈاکٹر کا پرستار بنا دیا۔ ان سے میری پہلی ملاقات

بطور ایک مریض کے ہوئی۔ ڈاکٹر نے محبت بھری نظروں اور مسکراتے ہوئے چہرے سے کہا تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں ٹھیک ہوا، پھر صورت حال یہ ہوئی کہ میرے گاؤں کا کوئی شخص بیمار ہوتا تو میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتا، اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا، ان کا لکھا ہوا نسخہ مریض کو صحت کی دولت سے مالا مال کر دیتا۔ ایک دن میں ایک ایسے مریض کو اپنے گاؤں سے لے کر آیا جس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس کی غربت بتائی ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اس کی مالی مدد کی بلکہ اس کے فری علاج کا بھی بندوبست کیا۔ میں نے ان کے جنازے میں انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ایسے ہی لاوارث لوگوں کو دیکھا، جن کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ آج کے انسان کے پاس وقت نہیں، دولت نہیں، تو دور دراز سے یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟ پھر دل نے کہا کہ شاید یہ لوگ ساری عمر ڈاکٹر صاحب کو فیس تو نہ دے سکے ہوں گے لیکن آج وہ ان کے احسانوں کا قرض اتارنے کے لیے انھیں آخری سلام پیش کرنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ساری عمر غریبوں کے زخموں پر مرہم رکھا اور انھیں زندگی کی امید دکھائی۔ ڈاکٹر صاحب سائیکاٹری کے ماہر تھے، اسی لیے بعض جنونی مریض یہ کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر تو چلے گئے ہمارا کون پرسان حال ہوگا؟ ڈاکٹر صاحب تو منوں مٹی کے نیچے چلے گئے لیکن ان کی چھوڑی ہوئی روایات، کردار اور کارنامے شاید تاریخ کا حصہ بنیں۔

ڈاکٹر صاحب کے عزیز و اقارب کو تو شاید صبر آ جائے لیکن ان غریبوں کو کبھی قرار نہیں آئے گا جو معاشرے کی بے رحمی اور عدم تقسیمِ دولت کا شکار ہیں۔ شاید اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا۔

ع یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

ڈاکٹر صاحب نہ صرف جسمانی مریضوں کا علاج کرتے تھے بلکہ وہ مختلف اخبارات میں کالم اور مضامین لکھ کر غریب پروری کا روحانی پیغام بھی دے رہے تھے۔ انھوں نے غریبوں کے مسائل کے حوالے سے فکری اور عملی جدوجہد بھی کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے اور ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین!)

(بشکریہ روزنامہ 'امن' ۱۹ راگست ۲۰۱۰ء)

○○○

سرخ سبز قندیلوں میں بساطاق

-علامہ ضیاء حسین ضیاء-

وہ ۲۰۰۸ء کے موسم گرما کی شام تھی۔۔۔ حلقہ ارباب ذوق فیصل آباد نے محترمہ منزہ سلیم کی نو آمدہ کتاب "پھول لاکھوں برس نہیں رہتے" کے اعزاز میں تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا ہوا تھا۔۔۔ تھری سٹار ہوٹل چنیوٹ بازار کا ہال جس میں حلقے کے اجلاس عرصۂ طویل سے منعقد ہو رہے تھے، شہر کے مقتدر اور نوجوان ادیبوں، شاعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔۔۔ نشستوں کی روزمرہ تعداد کے علاوہ اضافی نشستوں کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔۔۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس اجلاس کی صدارت، شہر کے معروف طبی معالج جناب ڈاکٹر احسان الحق کر رہے تھے، جن کا اپنا ایک منتخب اور چنیدہ ذوق اہلِ نظر تئیں محقق ہے۔ ساتھ میں منزہ سلیم تشریف فرما تھیں۔ ان کے ساتھ شہر کی مقبول ادبی شخصیت اور دانشورانہ شکوہ کی زندہ علامت۔۔۔ ڈاکٹر مقبول اختر صاحب اپنی ہمشیرہ کے ساتھ براجمان تھے۔ اسی صوفے کے آخر میں معروف دانش ور اور مصنف جناب پروفیسر اشفاق بخاری صاحب بھی رونق افروز تھے۔۔۔ شہر کی تقریباً تمام ہی قابلِ ذکر شخصیات موجود تھیں۔ میں نسبتاً ذرا تاخیر سے پہنچا اور سائیڈ والے صوفے میں احباب نے از راہِ محبت اور مروّت میرے لیے جگہ

بنائی۔ میں اپنے حواس میں یکجا ہوا اور میری سماعت، میرے شعور سے رِشتہ و پیوند میں میسر ہوئی تو میرے اعتبارِ سماعت میں اُترنے والی آواز منزہ سلیم کی تھی، جو اپنی کتاب سے چیدہ چیدہ نثر پارے پڑھ کر سنا رہی تھیں۔۔ دلچسپ یادوں کی پٹاری کھولے، منزہ سلیم اپنے خاندان کے ساتھ گزارا اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ایام کے ان وقتوں کو دُہرا رہی تھیں جو کسی سنہری بارش کی طرح آئے اور پھر گزر گئے۔ منزہ سلیم کی مختصر تحریروں میں پتا نہیں کیا تاثیر اور جادو بیانی تھی کہ بار بار میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔۔۔ منزہ سلیم احباب کی سماعت کی دلہیزوں پر چراغ اور قندیلیں جلائے چلی جا رہی تھیں، کبھی عید کے تہوار پر گھر میں رنگ چھوٹتی کرنوں کی باتیں، کبھی شب برات، پھر پھلجھڑیاں اُڑاتی ہوئی یادوں کا تذکرہ، کبھی چودہ اگست پر پاکستان اور حب الوطنی کے حوالے سے اس دانشور گھرانے میں منڈیروں پر موم بتیاں جلانے کا قصہ۔۔۔ ان سب واقعات میں ایک بات جو قدرِ مشترک کے طور پر یکساں تھی وہ تھا منزہ سلیم کا محبتوں اور رِشتوں میں ملبوس گھرانہ۔۔۔ جہاں ماں باپ کی لازوال محبت نظر آ رہی تھی اور منزہ سلیم کے بھائیوں کی، بہن کے لیے محبت کی چھت اور جب منزہ سلیم اپنے بھائیوں کی محبت کی اس چھت کو کڑی کڑی گن کر سنا رہی تھیں تو جہاں ان کے چہرے پر اپنے بچھڑ جانے والوں کا دُکھ، ان کی آواز کو اضمحلال اور افسردگی پہنا رہا تھا وہیں وہ دلپذیر انداز میں اپنے ''ڈاکٹر بھائی'' کی لمبی زندگی کے لیے دُعائیہ پڑھنے لگتیں۔۔۔

ڈاکٹر مقبول اختر کے چہرے پر ایک عجب وقار، طمانیت اور سکون نظر آ رہا تھا۔ گہرے انبساط میں ڈوبی، ان کی شربتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور منزہ کی کتاب کا فسوں تھا کہ ان نثر پاروں پر، ان کو احباب سے یوں داد مل رہی تھی جیسے کسی اچھے اور منجھے ہوئے شاعر کو کسی مشاعرے کو لوٹ لینے پر ملتی ہے۔

میں نے تب بھی محسوس کیا تھا کہ منزہ سلیم ناسٹلجیا کی وہ مریضہ ہیں جو غم کاشت کر کے حضورِ جاں میں ایک باغ تیار کرتی ہیں اور اس باغ میں بھیگی ہوئی خوشیوں کی ایک بادِ نسیم

چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ ناسٹلجیا اگر ایسا ہی ادب جو رُوح کی بالیدگی کا ضامن اور گھرانوں کی یکجائی اور مضمرائی کا صداکار ہو تو کس کافر کو اس کے ہونے سے مکرنے کا یارا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آپ کے پاس باتیں کرتا ہوا، ادبی اور خوشگوار وجدان ہو جو ایک ہی لمحے میں غم کی کایا پلٹ کرا سے صحت مند ہونے کی سند عطا کرتا ہو۔

منزہ سلیم نے جب اپنے مرحوم بھائیوں کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی اپنے آخری حیات بھائی ڈاکٹر مقبول اختر کی درازیٔ عمر کی دُعا مانگی تو سب کے دِلوں کی گہرائی سے 'آمین' نکلی۔ اور میں اس غم گرفتہ بہن کے درد اور چاہت کو سمجھتے ہوئے دیر تک کہی جانے والی اجتماعی آمین کی بازگشت کو اپنے وجدان میں گونجتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔

ڈاکٹر مقبول اختر کو مرحوم ہوئے ایک سال ہو چکا ہے مگر ان کا مکھن اور چاند میں گندھا چہرہ، میری آنکھوں کو ہمیشہ ایک بڑے پیکر سے بھر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی کبھی، حلقہ اربابِ ذوق میں کسی اہم تہوار پر مضمون پڑھنے کے لیے تشریف لاتے تو بہت تپاک سے ملتے۔۔۔ میں نے یکے بعد دیگرے اپنے دو ناول انھیں پڑھنے کے لیے دے رکھے تھے 'ماہین' اور 'دروازہ کُھلا' وہ جب بھی ملتے تو ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے، نیم دروں مسکراتے اور اس مسکرانے میں ان کی آنکھیں ان سے بھی سبقت لے جاتیں۔۔۔

میں کہتا، ڈاکٹر صاحب میرے ناول پر کب مضمون لکھیں گے! ہلکا سا مسکراتے اور کہتے۔

''بس ایک ناول اور لکھ دو، پھر میں لکھوں گا۔''

ڈاکٹر مقبول اختر ایک ماہر نفسیات تھے اور آخری وقت تک پریکٹس کرتے رہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور زرخیز تھا۔ بلا کے مطالعہ کیش اور معنی کش انسان تھے۔ انگریزی ادب پر انھیں بہت عبور حاصل تھا۔ انگریزی ادب میں ناول ان کا پسندیدہ شعبہ تھا۔ ان کے ساتھ مختصر ملاقاتیں ہوتی رہتیں، جن میں ہم ایک دوسرے کے اثباتِ ذات کا بہت خیال

رکھتے۔ دو ایک بار چناب کلب میں، ڈاکٹر صاحب، پروفیسر اشفاق بخاری اور میں یکجا بھی بیٹھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہنس مکھ شخصیت گوہر برساتی رہی۔۔۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب کو برین ہیمرج ہوا ہے۔ منزہ سے فون پر بات ہوئی تو جو جملہ اس کے لبوں سے الگ نہیں ہو رہا تھا، وہ یہ تھا کہ ان کے برین کا Intelect والا حصہ متاثر ہوا ہے۔ بھائی بہت ذہین تھے۔ سارا علم تو ادھر ہی تھا۔ میں نے منزہ سے نہیں کہا لیکن تب بھی اور اب بھی مجھے ایک بات اندر ہی اندر محسوس ہوتی رہتی ہے کہ ذہین لوگوں کے پاس کل خزینہ صرف دماغ ہی تو ہوتا ہے اور اسے بھی بیماری کا پنجہ استبداد چھین لیتا ہے تو انسانی شخصیت کا سارا تشخص کھو جاتا ہے۔

تب، جون ایلیا کی ایک تحریر یاد آئی جس میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی رئیس امروہوی کے قتل کا ذکر کیا تھا۔ جون نے کہا تھا کہ قاتل بہت ذہین تھا، اس نے تاک کر گولی کا نشانہ بھائی کے سر کا لیا۔۔۔ اور پھر یہ کہ بھائی 'برین' ہی تو تھے۔

ڈاکٹر مقبول اختر، منزہ سلیم کا چہیتا بھائی۔۔۔ جس نے باپ اور بھائی کی شفقت کو گھلا ملا کر منزہ سلیم کو پلایا اور اب یہ اپنے بھائی کی یادوں کو جمع کر رہی ہے تو ایک دیوانگی اور شیفتگی ہے جو کہ اس سے بڑے بڑے کام کروانے جا رہی ہے۔ بھائی کی فرمائش پر اپنا ناول ''ادھوری عورت'' مکمل کیا۔۔۔ اور یہ ایک کامیاب ناول ہے۔

اب بھائی کی یادوں کو اکٹھا کرنے چلی ہے تو اسے سوائے ڈاکٹر مقبول کے کسی کا ذکر ہی اچھا نہیں لگتا۔

؎ یا ترا تذکرہ کرے کوئی
یا کوئی مجھ سے بات ہی نہ کرے

وہ ایک بڑے بھائی کی بہن ہے اور ادب، شیرینی اور شیریں سخنی، اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔

وہ جو کہتے ہیں دانشور کی موت، زمانے کی موت ہے تو ٹھیک ہی تو ہے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے، اپنی یادوں اور علمی دستاویزوں کے ساتھ، واقعی پھول لاکھوں برس نہیں رہتے۔۔۔ لیکن پھول اگر اپنے ماحول کو اپنے رگ و ریشہ سے خوشبودار کر دے تو وہ اپنی تخلیق سے وفا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک دانشور اپنے علم و ادب سے ماحول کو جگمگاتا ہے تو امر ہو جاتا ہے۔ منزہ سلیم، ڈاکٹر مقبول اختر کی یادوں کو جمع نہیں کر رہی بلکہ اپنی تنہائیوں کی جگمگاہٹ کے لیے ایک نیا ڈاکٹر مقبول اختر تیار کر رہی ہے۔۔۔ اور اس ڈاکٹر مقبول اختر کو ایک زمانہ جانتا ہے۔

ooo

غیر مقبول ادیب —— مقبول ڈاکٹر

—عارف حسین عارف—

انسان دنیا سے جاتے ہوئے دو چیزیں چھوڑ کر جاتا ہے، ایک کردار، دوسرا اپنے الفاظ۔ الفاظ جب کردار میں ڈھلنے شروع ہو جائیں تو انسان بنتا ہے جسے فرشتوں سے بہتر کہا گیا ہے۔ یہی انسان جب الفاظ میں ڈھل کر سینہ قرطاس پہ سجنے لگے تو ادب تخلیق ہوتا ہے اور سجانے والا فنکار اور ادیب کہلاتا ہے۔ ایک سچا فنکار اپنے لہو کی آبیاری سے لفظوں کی کھیتیوں کو سینچتا ہے اور معنی کا سونا پیدا کرتا ہے۔ جب وہ سونا بازار میں آتا ہے تو ہر دیکھنے والا پکار اٹھتا ہے کہ یہ تو میرے اندر کی حرارت سے پگھلا ہوا لگتا ہے، مگر یہ تکلیف وہی جانتا ہے جس کا سیروں خون خشک ہوتا ہے تو ایک مصرعِ تر کی صورت سامنے آتی ہے۔ ادیب کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں سماج میں رہتے ہوئے سماج کی مکمل تصویر کشی ایک ادیب کا فرضِ عین ہے۔ ایک ادیب اگر صرف اپنے دل کی بات کرے گا تو فن کے ساتھ ناانصافی ہے۔ یہ چند ایک چنیدہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ تمام دنیا پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ اس دنیا کے تمام مسائل اور ان کے حل بھی اپنے تخیل اور مشاہدے کی مدد سے عوام کے سامنے رکھ دیتے ہیں تا کہ ہر شخص اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھ سکے۔ اس

بے ثباتی کے دور میں یہ فریضہ انجام دینا بھی نہایت مشکل ہے مگر چند لوگ ہیں جو بادشاہوں کے خزینوں سے گوہر تلاش کرنے کی بجائے دریدہ دل رکھتے ہوئے ادب کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ انہی چند گنے چنے لوگوں میں ایک نام ڈاکٹر مقبول اختر کا بھی ہے۔ ان کا نام جب بھی میرے کانوں میں پڑتا ہے ایک عجیب طرز رفاقت میری سوچوں میں بجلی کی طرح کوندنے لگتی ہے۔ بے ساختہ یہ شعر میری سماعتوں سے ٹکرا کر میرے ذہن کے طاقچوں پر دستک دینے لگتا ہے:

ے وہ جاتے ہوئے خود کو یہیں چھوڑ گیا ہے
اس کو تو بچھڑنے کا سلیقہ بھی نہ آیا

ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف کوئی اتنا پرانا تو نہیں مگر بعض لوگ ایک آدھ ملاقات میں ہی دل موہ لیتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں حلقہ ارباب ذوق فیصل آباد کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے میں تھری سٹار ہوٹل فیصل وآباد میں پہنچا تو ابھی اجلاس شروع نہیں ہوا تھا۔ چند ایک احباب تشریف فرما تھے۔ سامنے والے صوفے پر ارشد جاوید کے پہلو میں ایک شخص دکھائی پڑا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس، خاصا قد و قامت، گورا رنگ، ماتھا کھلتا ہوا، بغیر ہلائے مسکراتے ہوئے ہونٹ، ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک ہاتھ گود میں اور دوسرے کی کہنی ایک گھٹنے پر ٹکائے ہوئے ہاتھ موڑ کر ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا، بڑے شیشوں والی بڑی سی عینک کے پیچھے جھانکتی ہوئی باریک بین آنکھیں، میں آگے بڑھا سب کو سلام کیا اور بیٹھ گیا مقصود وفا صاحب نے تعارف کرایا کہ یہ ڈاکٹر مقبول اختر ہیں۔ میں احتراماً اور احتیاطاً چپ سا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں نے ان کا نام تو بہت سنا تھا مگر یہ پہلی ملاقات تھی جس میں، میں ان کے بارے میں سنی ہوئی ساری باتیں ان کی خموشی سے ہی سمجھ گیا اور ان کی گفتگو سننے کو اور بے قرار ہونے لگا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر صاحب فرمانے والے تھے۔ کچھ دیر بعد اجلاس شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب

نے ابتدائی جملے ہی ادا کیے تو روایتی بوریت جو حلقہ کے اجلاسوں میں ہوتی ہے ختم ہو گئی۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی کمال تھا۔ لفظوں کی پورے مخرج میں ادائیگی اور انداز ایسا کہ لفظ بولتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ تنقید کے لیے غزل تھی کسی کی۔ ڈاکٹر صاحب نے غزل کے بارے میں جو ابتدائیہ دیا اس میں ہی اتنی جملہ سازی اور معنی خیزی تھی کہ میں تو ان کا معتقد ہوتا چلا گیا۔ پورے اجلاس کو ایسے احسن انداز سے نبھایا کہ کہیں بھی بوریت کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ پروگرام کے بعد ان سے کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ لفظوں کو برتنے کا جو سلیقہ ان کے ہاں نظر آیا وہ آج تک میں نے کسی ادیب کے ہاں نہیں دیکھا۔ وہ تحریر میں ہی نہیں گفتگو میں بھی لفظوں سے کھیلتے تھے۔ ایک ایک لفظ کو اتنے معانی میں استعمال کر جاتے تھے کہ سننے والا حیرت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

ان کی تحریر بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ۲۰۰۵ء میں جب میں حلقہ کا جوائنٹ سیکرٹری بنا تو ڈاکٹر صاحب کا ایک انشائیہ قسم کا مضمون ہم نے تنقید کے لیے رکھا۔ مضمون کا عنوان تھا ''چک جھمرے کا بکرا''۔ اس مضمون کی ایک ایک لائن انتہائی قیمتی اور معنی خیز تھی۔ چند لائنیں مجھے یاد ہیں، وہ کچھ یوں تھیں:

''جب کبھی چک جھمرہ سے ٹرین سیٹی بجاتی ہوئی گزرتی تو بکرے کا خون کھولنے لگتا۔ اس کا دل کرتا کہ اس انجن سے ٹکرا جاؤں جس کی شکل کانے دجال سے ملتی ہے۔۔۔ اسے سب سے زیادہ غصہ رات کے تین بجے گزرنے والی ٹرین پر آتا تھا۔ جس سے سارا گاؤں جاگ جاتا۔ اب یہ وقت نہ تو نماز کا ہوتا تھا اور نہ دوبارہ سونے کا لہٰذا چک جھمرہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔''

ہر چند ڈاکٹر صاحب کی تحریر اور گفتگو دونوں میں اتنی چاشنی ہوتی تھی کہ سننے والا اور پڑھنے والا ان کے سحر میں ایسا مبتلا ہو جاتا کہ خود کو بھی بھول جاتا۔ ایک سال پہلے دو احباب یکے بعد دیگرے ہم سے جدا ہو گئے جن کی موت سے نہ صرف انسانوں بلکہ بہترین

ادیبوں میں بھی کمی آئی ایک نام ڈاکٹر مقبول اختر کا ہے اور دوسرا شہادت سیال کا۔ ڈاکٹر صاحب کی موت کی خبر تو اچانک ملی۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی چند روز پہلے مل کر آیا تھا۔ وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔ لکھنوی سٹائل کی گفتگو جیسے ہر لفظ اپنی ادائیگی اور تلفظ لے کر نہیں بلکہ پورے معانی لیے ان کے منہ سے ادا ہو رہا ہو۔ کافی دیر بیٹھے رہے ڈاکٹر صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں سنتا رہا اٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا مگر وقت کی زنجیریں پاؤں کھینچ رہی تھیں۔ مجھے کہاں خبر تھی کہ ڈاکٹر صاحب سے یہ آخری ملاقات ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب کا وہ جملہ مجھے آج بھی یاد آتا ہے ''عارف صاحب بے لوث ہو کر اپنے کام میں لگے رہو دنیا نہیں اللہ صلہ دیتا ہے اور ضرور دیتا ہے۔''

میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے اور ہمیں ان کے الفاظ سے سیکھنے کی ہمت اور توفیق عطا کرے۔ (آمین)

ooo

مقبولِ خاص

(ڈاکٹر مقبول اختر — کچھ یادیں)

— عمیر غنی —

(عمیر غنی، ڈاکٹر بھائی کے بہت عزیز دوست پروفیسر ارشاد احمد خاں کے بیٹے ہیں اور بھائی انہیں پروفیسر صاحب کا "کلون" کہا کرتے تھے۔ مصنف)

میں نے دیکھی زرق برق زندگی، اجلے اجلے دن، مہکی مہکی ڈھلی ہوئی راتیں اور ان میں بستے بستے خوش طبع و خوش پوشاک لوگ جن کے قہقہے ہمارے جیون کا حسن تھے۔ انسانوں کا یہ گروہ، جس میں ڈاکٹر مقبول اختر ایک سرکردہ شخصیت تھے، لائل پور کی ادبی، سیاسی، سماجی اور روزمرہ زندگی کا دل تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کی دھڑکن۔

ان کو میں ہمیشہ سے ابا کے ساتھ دیکھتا آیا تھا۔ از قضا موشے و چغرے باوفا[1] کے مصداق مجھے تو لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور ابا کا ساتھ لوحِ تحریر کے ساتھ ہی کُن فیکون ہوا ہوگا۔ کم از کم میں نے تو شاذ ہی دو انسانوں کو عرصہ ہائے دراز زندگی کے ہر معاملے میں

۱۔ از قضا موشے و چغرے باوفا از مثنوی مولانا روم

ترجمہ: (مقدر ٹھہرا کہ چوہے اور پرندے کی آپس میں دوستی ہو جائے)

اس طرح باہم پیوست دیکھا ہے۔ کبھی میرے استفسار پر ابا نے بتایا بھی تھا کہ محبت کی یہ کہانی میری پیدائش سے پہلے کی تھی۔ مجھے تو لگتا تھا یہ پیدائشِ آدم سے بھی پہلے کی ہوگی۔ بہر حال اس وسیلے سے ڈاکٹر صاحب کا ساتھ میرا بھی مقدر ٹھہرا اور کیا خوش بختی تھی، کیا کمال دولت تھی جو ہاتھ لگی اور تقدیر کو چکا چوند کر گئی۔

بھلے دن تھے یا یوں کہیے کہ بھلے لوگوں کا سایہ سر پہ تھا جن کے دم سے ہر سانس تروتازہ تھی۔ ڈاکٹر صاحبان (ڈاکٹر مقبول اختر اور ڈاکٹر احسان الحق) اور ابا کی ملاقات تقریباً روز کا معمول تھی۔ اپنی فیاضی طبع میں میری تجسس آمیز دخل اندازی کو یہ لوگ یکسر نظر انداز کیا کرتے اور عہدِ حاضر کے حالات پر جامع گفتگو، راشد اور احمد شاملو پر تنقیدی بحث اور سماجی امور کی پرلطف تفسیر میری جھولی میں "کڑیو بالو چیز ونڈی دی لئی جاؤ" کے چکر میں پڑ جاتی۔

ڈاکٹر مقبول اختر کی شخصیت کا سحر انگیز فسوں ان محفلوں پر ہمیشہ حاوی رہتا۔ تجربے کی سان پر آزمودہ، پختہ کار نظریات کی بنا پر ان کی گفتگو ہمیشہ ٹھوس اور مدلل ہوتی۔ اپنے کہے اور لکھے ہوئے لفظ کی حرمت پر ہمالیاتی مضبوطی اور بے نیازی سے قائم رہتے۔ ایک نروانی مسکان ہمیشہ ان کے پرشکوہ چہرے کو سجائے رکھتی اور پر جوش والہانہ قہقہے ان کی روح میں اُمڈتے آسودہ چشموں کے مقدس پانی سے پورے ماحول کو معطر کرتے نظر آتے۔ قدرت نے ان کے ذمہ دلِ آزار انسانوں کی دل جوئی اور راہنمائی کا کام لگایا تھا۔ ڈاکٹر مقبول اختر نے اپنے ہمجولیوں کو آلامِ زیست کے ساتھ حوصلہ سے نبرد آزما ہونے کا فن اپنی آخری سانس تک پوری ایمانداری اور پیشہ ورانہ یکسوئی سے سکھایا۔ لائل پور کے باسیوں کے لیے ڈاکٹر مقبول اختر ایک غنی و غیاث صوفی کی مانند باعث رحمت و برکت تھے۔ تقدیر کی چکی میں پسے اور خود ساختہ مصائب کے پٹے ناآسودہ لوگ ان کے پاس آتے اور بے ساختہ پررونق گفتگو اور چائے کی دو پیالیاں پی کر شاد مان، مسرور ڈاکٹر صاحب کو دعائیں دیتے رخصت ہوتے۔ یہ کشف کمال تھا۔

ستیانہ روڈ پر واقع سائیکاٹرک کلینک محض گردشِ بخت کے ہاتھوں پریشان حال افراد کی علاج گاہ ہی نہیں تھا بلکہ بہت حد تک ایک ایسا دبستان تھا جہاں نظریات و مشاہدات پر بحث ہوتی اور زندگی کی کثافت سے ماورا ہو کر اس کی لطافت و دلکشی کو اپنانا سکھلایا جاتا۔ حیرت اس بات پر ہوتی کہ یہ راز روزمرہ گفتگو اور لطائف کی بھرمار میں ایک سہل اسلوب سے کھولے جاتے۔

ڈاکٹر صاحب کی آزادیِ طبع اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے بے باک نظریات کو لائل پور کے نیم پڑھے لکھے اکثر اوقات ملحدانہ قرار دیا کرتے اور اپنے تئیں ان کی زد سے بچا بچا کر رکھتے رہے۔ خود ڈاکٹر صاحب اپنے رفقا کی اس کوتاہ بینی کو چند بے نیاز قہقہوں میں اُڑا دیا کرتے۔ پُرعزم و پرشکوہ ڈاکٹر مقبول اختر شیر سنگھ والا کی پرانی حویلی میں کچھ اور ہی روپ میں دکھائی دیا کرتے۔ زمستاں کی شام کی ہلکی دھوپ میں گرم چادر اوڑھے ایک مدبرانہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے اہلِ خانہ کی قبروں کے سرہانے چٹانی سپاٹ چہرے کے ساتھ ایک گھنی چپ لیے کھڑے ہیں۔ نروان تھا یا مکاشفہ کہنا مشکل ہے۔ صاحب اسرار تھے اور صاحب اسرار ہی رہے۔

آج بھی یہ سب لکھتے اور یاد کرتے یوں لگا کہ چند عشرے پہلے کی رات ذرا گہری ہوئی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبان (مقبول اختر اور احسان الحق) کی آمد آمد ہے۔ شطرنج پارٹی ابا کے کمرے سے رخصت ہو رہی ہے اور ابا بے چینی سے کچن میں چکر لگا رہے ہیں۔ اماں اور بہنوں کے ذمہ چائے اور دیگر لوازمات کے انتظام ہیں اور مجھے اور عدنان کو وقتاً فوقتاً مہمان داری ایک تسلسل سے جاری رکھنے کی تاکید خاص ہو رہی ہے۔ سڑک پر کار رکتی ہے۔ ڈاکٹر مقبول اختر کے قہقہوں کی گونج میں دروازے کھلتے اور بند ہوتے ہیں اور اس منظر میں موجود ہر شخص کا چہرہ ایک تفریحی مسکان سے جگمگا جاتا ہے۔

○○○

عملی ریاض

—کیپٹن نثار اکبر خاں—

ے پڑھنے بیٹھوں تو نظر آتی ہے تصویر تیری
لکھنے بیٹھوں تو فقط ہاتھ تیرا نام لکھے
آنکھ وہ ظرف کہ ہر روز بھرے اور بہے
دل وہ وحشی کہ صبح و شام تجھے یاد کرے

اس شعر کے حوالے سے ڈاکٹر مقبول اختر کی شبیہ مجھے صاف نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ایک خوبصورت انسان تھے اور انتہائی پُرکشش شخصیت کے مالک بھی۔ دراز قد، چھریرا بدن، وجیہہ اور حلیم الطبع۔ بہت پڑھے لکھے ہونے کے ناطے انہوں نے جدت پسندی، مساوات اور سوشل تحریکوں کے ذریعے معاشرے کے لیے بہتری کی راہیں تلاش کیں اور انہی کو اپنا شعار بنایا۔

ان کا عملی ریاض یہ تھا کہ انہوں نے قصداً غربا کے علاقوں میں پریکٹس کی اور یوں ان کے دکھ درد اور محرومیوں میں عملاً شرکت کی۔ آپ کی مسیحائی، انسانیت کے بہت کام

آئی۔۔۔اس حد تک جہاں تک ایک اکیلے شخص کی رسائی ممکن ہے۔

انہوں نے تاعمرِ رواں، اپنی مخصوص مسکراہٹ سے ماحول کو خوشگوار بنانے کی سعیِ مسلسل کی۔ وہ صحیح معنوں میں لوگوں سے ملاقات کا فن جانتے تھے۔ پوری توجہ، مسکراہٹ، خلوصِ نیت اور انتہا درجہ محبت سے ملنے کا فن۔۔۔ کاش کوئی ان سے یہ سب سیکھتا۔

معاشرے کی ناہمواریوں کی درستگی کے لیے وہ تمام عمر کوشاں رہے۔ اپنی بیٹی کے میڈیکل کالج میں داخلے کے سلسلے میں ناانصافی کی تلافی کے لیے انہیں ہائی کورٹ تک جانا پڑا اور آخر اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔

علمی و ادبی حلقوں کی معروف مصنفہ 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' اور ناول 'ادھوری عورت' کی خالق، پروفیسر منزہ سلیم کے آئیڈیل بھائی ڈاکٹر مقبول اختر، حقیقی معنوں میں بڑے انسان تھے، جو کم کم پیدا ہوتے ہیں۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

ان کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ، ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ooo

ہم سب کے ڈاکٹر مقبول اختر

—محبوب علی شاہ—

میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اپنے دوستوں کی صحیح تعداد کا اندازہ بھی لگا سکوں، لیکن میں اپنے تمام غائب اور سلامت جگری دوستوں کی صحیح تعداد ضرور بتا سکتا ہوں۔ شاید اس لیے کہ یہ تعداد ہاتھ کی انگلیوں سے بھی کم ہے۔ جب میں اپنے جگری دوستوں کا موازنہ ایک دوسرے سے کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ان کی ذاتی اوصاف بالکل ایک جیسے کیوں ہیں؟ حالانکہ پہلی ملاقات میں سنی سنائی باتوں کی بنا پر ان کی ایک آدھ خاصیت کا ہی ہلکا سا علم ہوتا ہے۔ وہ تو بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ بھی باقی گہرے دوستوں کی کاربن کاپی نکلے۔ اپنی دوستی کا بھی عجب حال ہے اور جگری دوستی کا عجب تر۔ جن سے دوستی گہری ہونا ہوتی ہے ان سے ایک، دو یا تین ملاقاتوں میں ہو جاتی ہے۔ باقی تمام عمر دوست رہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ کسی سے بگاڑنا میری سرشت میں نہیں۔ ڈاکٹر مقبول اختر کو میں اپنے جگری دوستوں میں نہایت اعلیٰ درجے پر فائز پاتا ہوں اور اسی قدر احترام کرتا ہوں، صرف اس بنا پر نہیں کہ مرحوم ان تمام اعلیٰ ترین صفات کے حامل تھے جو کسی فرد کو محبوب و محترم بنانے کی ضامن ہیں

بلکہ یہ اس سے بھی پرے کی بات ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ عرصہ پہلے فیصل آباد میں ایک بین الاقوامی کرکٹ میچ کھیلا جا رہا تھا۔ جس میں امپائرنگ کا فریضہ اس خاکسار کو انجام دینا تھا۔ اس زمانے میں فیصل آباد میں صرف دو جگہیں ایسی تھیں، جہاں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو ٹھہرانے کا انتظام ہوتا تھا۔ ایک ہوٹل گرین اور دوسرا چناب کلب۔ یہ دونوں ٹھکانے، ٹیسٹ میچ کے دوران قطعی ناکافی تھے۔ لہٰذا منتظمین، مہمانوں کی رہائش کا انتظام سرکاری ڈاک بنگلے یا گیسٹ ہاؤس وغیرہ میں کر دیا کرتے تھے۔

میں جب فیصل آباد پہنچا تو تمام ٹھکانے پر ہو چکے تھے اور کوئی جگہ دستیاب نہ تھی۔ لیکن میرا مسئلہ ٹھکانے کی عدم دستیابی نہیں تھا، بلکہ ایک سے زیادہ ٹھکانوں میں انتخاب کا تھا، جو میرے لیے کارے دارد تھا۔ بھلا آپ محمد ادریس اور ڈاکٹر مقبول اختر میں سے کس کی پیشکش کو رد کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹر مقبول اختر نے مجھے محمد ادریس سے چھین کر کمال کر دیا۔ محمد ادریس میرے جگری دوستوں میں سب سے سینئر ہیں۔ ان کے پاس ہر چیز کا جواز ہر وقت موجود رہتا ہے، ایسے شخص سے جیتنا کمال نہیں تو کیا ہے؟

دسمبر میں رات کے تین بجے جب سردی اور نیند کی شدت عروج پر ہو اور آپ کے کمرے کے باہر کوئی پراسرار سرگرمی ہو رہی ہو تو صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرنے کی جستجو تو ہوتی ہی ہے، خاص طور پر جب جگہ بالکل نئی ہو۔ چنانچہ حسِ تفتیش کے جاگتے ہی باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ پردے کے پیچھے ان کھڑکیوں سے جن کے حدود اربعہ کا صحیح اندازہ بھی نہ تھا۔ آخر کار ایک ایسا مقام مل ہی گیا جہاں سے باہر کا کچھ منظر، کم روشنی کے باوجود کافی حد تک صاف تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سر سے پیر تک کمبل میں لپٹا، ایک مردانہ سایہ کمرے کی طرف آتا ہے، کچھ لمحے ٹھہرتا ہے اور پرے چلا جاتا ہے۔ خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب کو فوراً اس مشکوک صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔ مگر کس طرح؟ یہ موبائل فون سے بہت پہلے کی بات

ہے۔ کئی آپشنز پر غور کرنے کے بعد میں نے پراسرار سائے کو خود قابو کر کے ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا جو کچھ ایسا مشکل کام نظر نہیں آ رہا تھا۔ بھلا جو اوپر سے لے کر نیچے تک دبیز کمبل میں لپٹا ہوا سے قابو میں کرنا کون سا مشکل تھا؟

منصوبہ بندی پر عمل کرنے سے پہلے ہی یہ عقدہ کھل گیا کہ وہ ڈاکٹر مقبول تھے۔ جو گویا ہوئے۔

''معذرت خواہ ہوں کہ آپ کی نیند میں خلل پڑا۔''

''آپ یہاں؟ اس وقت؟''

''گیزر چیک کر رہا تھا۔''

''اس وقت؟''

''ہاں تاکہ آپ کو صبح گرم پانی مل سکے۔''

''مگر رات کے تین بجے؟''

''ہاں یہ گیزر پرانا ہو گیا ہے، پانی گرم کرنے میں وقت لیتا ہے۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب۔۔۔''

''افسوس کہ نئی ماچس تلاش کرنے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی اور آپ کو بے آرام ہونا پڑا۔''

ڈاکٹر صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ اگر ماچس ختم نہ ہو گئی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازی کا یہ پہلو میں کبھی نہ جان پاتا۔

یہ تھے میرے، آپ کے، ہم سب کے ڈاکٹر مقبول اختر، جن کی یاد آج ہم منا رہے ہیں۔

OOO

مرشدِ من — اخترِ من

— محمود شاہ —

فون کی گھنٹی بجی دوسری جانب مقبول اختر تھے کہنے لگے مریض کو آرام آجائے تو ڈاکٹر کے پاس آنا چھوڑ دیتا ہے یا مایوس ہو کر ڈاکٹر تبدیل کر لیتا ہے؟ تم کس حالت میں ہو؟ اور ساتھ ہی عادتاً ہلکا سا قہقہہ۔ میں نے فون بند کیا اور پھر حاضرِ کلینک ہوا۔ عرض گزاری کہ دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ نہ صحت یاب ہوا ہوں نہ مایوس صرف شاعرانہ مزاج کا مسئلہ ہے۔ معاف کیا جائے!

کمالِ خسروانہ سے فرمایا "مابدولت نے معاف کیا۔"

میں "محمود شاہ" صرف شاعر ہوں۔ نثر نگاری یا شخصی خاکہ تحریر کرنا میرا میدان نہیں ہے۔ مگر وہ شخص جسے لوگ "ڈاکٹر مقبول اختر" کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں کی دوستی، محبت "تو چیز ے دیگری" والا معاملہ ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ مضمون نہیں ہے صرف چند یادیں ہیں جن کے ذکر سے ڈاکٹر صاحب کی محبتوں کا قرض تو ہرگز نہیں اتر سکتا مگر پھر بھی۔۔۔

فروری ۱۹۷۲ء مجھے آنتڑیوں میں درد کا مرض لاحق ہو گیا والد مرحوم (گرچہ خود

ہومیو پیتھک معالج تھے) مجھے منٹگمری بازار میں واقع ٹیکہ گلی کی ڈسپنسری میں لے گئے۔ ایک دراز قد، کلین شیو، سرخ و سفید دلفریب مسکراہٹ والے ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کیا۔ کچھ ادویات دیں ایک انجکشن لگایا۔ درد غائب، ڈاکٹر اور اس کا انداز بہت اچھا لگا۔

میں نے ۱۹۶۵ء سے جنوری ۱۹۷۲ء تک کا زمانہ عبدالحکیم میں اپنے تایا کے پاس گزارا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں لائل پور واپس آیا۔ اقبال نوید کی رفاقت مجھے حلقہ اربابِ ذوق تک لے گئی۔ مختلف ادبی، سیاسی دانشوروں، شاعروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کئی سال بیت گئے اور میں مختلف مراحل طے کرتا سٹڈی سرکل سے فیض یاب ہوتا ہوا "انجہانی مجید جوزف" کے توسط سے مزدور کسان پارٹی تک جا پہنچا، مجید جوزف نے مجھے دو اصحاب سے خصوصی طور پر ملایا ایک صاحب تو میری طرح کے ہی تھے یعنی "منظور نیازی" اور دوسرے صاحب کا نام ڈاکٹر مقبول اختر بتایا گیا فراز کے محبوب جیسی قد و قامت خوش رو، خوش لباس دیو مالائی مسکراہٹ، دماغ نے فوراً گھنٹی بجائی "میاں یہ تو وہی ڈاکٹر ہے جس نے تمہارا علاج کیا تھا" میں نے مولانا بھاشانی کے بعد جہاں میجر اسحاق محمد کے ہاتھ پر نظریاتی بیعت کی تھی وہیں مقبول اختر کو بھی مرشد تسلیم کر لیا۔

پارٹی میٹنگ کا یہ تعارف ہر گزرتے دن کے ساتھ نہ صرف نظریاتی بلکہ ذاتی سطح پر ایک مضبوط بندھن میں تبدیل ہوتا گیا۔ دوستی کے بندھن میں، محبت کے بندھن میں، اخلاص کے بندھن میں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کسی تعلق کو کبھی سطحی طور پر نہیں رکھا دوستوں کے ہر مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھا اور مکمل دل چسپی سے اسے حل کرنے یا کروانے کی کوشش کرتے۔ دوستوں کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا اپنا فرض جانتے تھے۔ میں وارث لاء کالج سے منسلک تھا۔ ۲۰۰۳ء میں کالج معاملات کافی گھمبیر صورت اختیار کر گئے تھے۔ رشید مصباح اکثر لاہور رہتا تھا اور تمام مسائل کا سامنا مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ انتہائی ذہنی اذیت کے دن تھے۔ میری بیوی نے اس صورتِ حال کا ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا۔ انھوں نے مجھے بلا کر کہا

''گھر میں داخل ہوتے وقت کالج کی جوتیاں گھر سے باہر اتار دیا کرو جیسے مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتیاں اتار دیتے ہیں۔'' ان کی ہر وابستگی پورے اخلاص سے ہوتی تھی دوستوں سے ہو یا گھر والوں سے ''زہرہ'' بھابھی کی وفات کے چند دن بعد میری بیوی ان سے تعزیت کے لیے گئی، باتوں باتوں میں ازدواجی رفاقت کا ذکر چل نکلا کہنے لگے:

''زہرہ اور میری رفاقت ۳۶ سال پر محیط ہے جب اس کی میت گھر لا کر رکھی تو میں باہر صحن میں نکل آیا۔ صحن میں آباد قبروں کو آنکھ بھر کے دیکھا ایک جگہ پہ نظر جا ٹکی دل میں خیال آیا اندر جا کر ''زہرہ'' سے پوچھتا ہوں فلاں جگہ تمہارے لیے مناسب رہے گی۔''

خدا گواہ ان کی وفات کے بعد جب ۱۰ اپریل ۲۰۱۱ کو میری اپنی ازدواجی زندگی کے بھی ۳۶ سال مکمل ہو گئے تو مجھے مقبول اختر اور ان کی یہ بات اس طرح یاد آئی کہ میری دھاڑیں نکل گئیں۔

یکم جنوری ۲۰۰۰ء کو میری پہلی کتاب ''مسافرت'' شائع ہوئی۔ کتاب کی اشاعت پر ''لڈیاں'' ڈالنے والوں میں ڈاکٹر صاحب سب سے آگے تھے۔ وہ اکثر شام کو ڈاکٹر احسان صاحب کی موجودگی میں مجھے بلا بھیجتے اور دراز سے ''مسافرت'' نکال کر نظمیں سنانے کا کہتے۔ انہیں میری نظم ''سنو اک بات کہنی ہے'' بہت پسند تھی۔ میں جن دنوں اپنی طویل نظم ''والعصر'' لکھ رہا تھا اس کے ہر موضوع پر ان سے تبادلہ خیال ہوتا رہا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں 'دشت سوس' ''حسین بن منصور حلاج'' کو نظم کروں۔ ڈاکٹر مقبول اختر کو اردو، انگریزی، پنجابی، فارسی اور عربی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ میں نے فیض، راشد، بلھے شاہ اور قراۃ العین طاہرہ کی شرح انہی سے پڑھی ہے۔ لفظ کی حرمت، اپنے کہے پر پہرہ دینا اور لکھے پر قائم رہنا انہی کا فیض ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک مکمل تربیت گاہ تھے۔ فیصل آباد کی ادبی، سماجی اور پرولتاری ترقی پسند سیاست ڈاکٹر مقبول اختر کے ذکر سے ہی مکمل ہو گی۔

OOO

دوستی ایسا ناتا۔۔۔

۔نذیر احمد گل (تایازاد بھائی)۔

ڈی۔ای (PTCL(R اسلام آباد

؎ کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

بغیر تمہید باندھے یہ کہوں گا کہ ڈاکٹر مقبول ان معدودے چند لوگوں میں سے تھا جنہیں بہت سے لوگ تا حیات بھلا نہ پائیں گے۔ ان لوگوں میں عزیز و اقارب، دوست احباب، ملنے جلنے والے اور مریض سبھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ڈاکٹر صاحب سے ایک ہی بار ملے ہوں۔

پیشتر اس کے کہ میں اس کی ہر دلعزیز اور مقناطیسی شخصیت کے بارے میں کچھ کہوں میں ڈاکٹر مقبول سے اپنی وابستگی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے بیچ متعدد رشتوں کا تانا بانا (جسے پنجابی میں 'گھالا مالا' کہتے ہیں) پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر دوستی کا رشتہ تھا۔

ذکر مقبول سے پہلی ملاقات کا۔

یہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے اوائل کی بات ہے، ہمارے مشترکہ عزیز کی شادی تھی۔ ہم دولہا اور دلہن دونوں خاندانوں کی طرف سے مدعو تھے۔ ہم لوگ شادی سے ایک دن پیشتر دلہن والوں کے گاؤں پہنچ گئے۔ مقبول لوگوں کا رشتہ دولہا سے زیادہ قریبی تھا اس لیے انہیں بارات کے ساتھ آنا تھا۔ یہ میرے بچپن کا اولین واقعہ ہے جو مجھے آج بھی من وعن یاد ہے۔ اس سے آپ مقبول سے میرے لگاؤ کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

ہم دیہاتی (پینڈو) لوگ تھے۔ اس زمانے میں دیہاتی رسم ورواج کے مطابق بارات اور دیگر مہمانوں کو 'تکیہ' (جسے آپ شاید چوپال بھی کہہ سکتے ہیں) میں ٹھہراتے تھے۔

'تکیہ' مشرقی پنجاب کے کنڈھی کے علاقے میں اس مخصوص جگہ کو کہتے تھے جو گاؤں کی شاملات میں رفاہ عامہ کے لیے وقف ہوتی تھی۔ تکیہ میں ایک کچا کوٹھا (کمرہ) ہوتا تھا جس میں خدمت گار رہتا تھا۔ یہاں گھنے درختوں کا جھنڈ ہوتا تھا۔ خدمت گار کے فرائض میں دیگر بیگار کے علاوہ گاؤں والوں کے حقوں کے لیے اپلوں کی آگ مہیا کرنا بھی ہوتا تھا۔ عام دنوں میں کام کے بعد تھکے ہارے کسان، چھاؤں میں چارپائیاں بچھا کر آرام کرتے اور لڑکے تاش وغیرہ کھیلا کرتے۔ شادی بیاہ کے موقعہ پر سارے گاؤں سے چارپائیاں اور بستر جمع کیے جاتے اور چھاؤں میں قطار در قطار مہمانوں کے لیے بچھا دیے جاتے۔ بارات اکثر دو یا دو سے زیادہ دن، دلہن کے گاؤں ٹھہرتی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم تکیے میں موجود تھے کہ باجے (Brass Band) کی آواز سنائی دی۔ سب لوگ شہر سے آنے والے راستے کی طرف، بارات کے استقبال کے لیے چل پڑے۔ باراتیوں اور مہمانوں کی دودھ اور شربت سے تواضع کی گئی اور پھر عمر رسیدہ مہمان نیم دراز ہو گئے اور ہم بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔

دریں اثنا، بارات کے ساتھ آنے والے دو گورے چٹے، اجلے اجلے، نکھرے نکھرے

بچے میری توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ان کے لباس کی عمدگی اور سلیقے سے بنائے گئے بال، مجھے بہت اچھے لگے۔ دونوں خاکی نیکر اور سفید قمیص میں ملبوس تھے۔ پاؤں میں انگریزی جوتے (بوٹ) پہن رکھے تھے۔ میرا دل چاہا جھٹ سے دوستی کرلوں اور جلد ہی ہم گھل مل گئے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ رشید اصغر اور مقبول اختر اور یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔ عمر میں مَیں ان دونوں سے بڑا تھا اور دیہاتی ماحول سے زیادہ مانوس، چنانچہ میں نے سیکشن کمانڈر کے فرائض سنبھال لیے اور گاؤں کی گلیوں کی طرف نکل گئے۔ ہم تینوں، باقی مہمانوں سے الگ تھلگ گاؤں کی گلیوں میں گھومتے رہے اور خوب مزا کیا۔ دو دن ہم ساتھ رہے پھر بارات رخصت ہو گئی اور ہم اپنے گاؤں لوٹ گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک ہمارا رابطہ منقطع رہا کہ اس زمانے میں مواصلات کے ذرائع محدود تھے۔ ہاں دیگر رشتہ داروں سے کبھی کبھار خیر خیریت کا پتا چلتا رہا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ میں بڑا ہو گیا تھا۔ سمجھ بوجھ بھی بہتر ہو گئی تھی۔ چھ، سات سال کی عمر میں دو دن کی رفاقت کئی سال گذرنے کے باوجود میرے ذہن سے محو نہ ہوئی تھی بلکہ دل میں دوبارہ ملنے کی تمنا جوان رہی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی پانچ چھ سال تک کوئی قابلِ ذکر ملاقات نہ ہوئی۔

یہ ۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ میں نے ایمرسن کالج ملتان میں B.Sc میں داخلہ لیا۔ دریں اثنا چچا غلام رسول صاحب (والد ڈاکٹر مقبول) بطور DSP ملتان تعینات ہوئے۔ یہ جان کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میری دلی خواہش پوری ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ہمارا زیادہ وقت کھیل کود، گپ شپ اور شرارتوں میں گذرنے لگا۔ ہم نے وہ دو سال کا عرصہ بہت enjoy کیا۔

آپ شاید یقین نہ کریں کہ میں نے مقبول کو کبھی Text Books پڑھتے نہیں دیکھا۔ اسے باری تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت عطا فرمائی تھی، اگر میں یہ کہوں کہ وہ genious

تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ میں اپنے مشترک دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر مقبول کو بہتر وسائل میسر ہوتے تو شاید بہت آگے نکل جاتا (ڈپٹی صاحب کی پولیس میں نوکری کے باوجود وسائل کی کمی سے آپ ان کے گھرانے کی شرافت، ایمان داری اور اعلیٰ اقدار کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں) اگر میں یہ کہوں کہ یہی شرافت، دیانت، قناعت، مقبول کو اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی تھی تو بیجا نہ ہوگا۔ اسی طرح ذہانت اس کے ننہال کا ورثہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ماموں میجر اسحاق محمد کے فلسفۂ حیات سے بہت متاثر تھے۔ میجر اسحاق محمد صاحب مزدور کسان پارٹی کے صدر تھے۔ مقبول بھی اس سے وابستہ رہا۔ میجر صاحب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد یہ پارٹی شکست و ریخت کا شکار ہوگئی۔ مقبول انتہائی صاف گو اور نڈر شخص تھا۔

اب میں جو واقعہ بیان کرنے لگا ہوں، اس میں آپ کو مقبول میں ایثار و قربانی اور منزہ سے بے پایاں محبت کی ایک جھلک نظر آئے گی۔ ڈپٹی صاحب اوکاڑہ میں تعینات تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں بھی ملنے کے لیے اوکاڑہ گیا ہوا تھا۔ ایک دوپہر ہم نے اوکاڑہ کے نزدیک بڑی نہر (نہر کا نام مجھے یاد نہیں) پر جانے اور نہانے کا پروگرام بنایا۔ منزہ اس وقت بہت چھوٹی سی تھی۔ میں، رشید، مقبول، صفدر اور منزہ نہر پر چلے گئے۔ بڑی نہر کے متوازی، ایک چھوٹی نہر (جسے 'مائنر' کہتے ہیں) بہہ رہی تھی۔ میں اچھا تیراک تھا اس لیے بڑی نہر میں نہانے لگا۔ مقبول، منزہ کو کندھوں پر بٹھائے، مائنر میں نہانے لگا۔ رشید اور صفدر کنارے پر چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد رشید چیخا۔

''بچاؤ، بچاؤ، مقبول اور منزہ ڈوب رہے ہیں۔''

میں تیزی سے مائنر کی طرف بھاگا (مائنر اور نہر کے درمیان بمشکل ۲۰ گز کا فاصلہ تھا) میں نے دیکھا کہ مقبول اور منزہ غوطے کھا رہے ہیں۔ میں نے مائنر میں چھلانگ لگائی اور مقبول اور منزہ کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ یقین کریں پانی بمشکل مقبول کی کمر تک گہرا تھا لیکن جب بہن اس کے کندھوں سے پھسل کر پانی میں گر گئی تو اسے غوطے کھاتے دیکھ کر مقبول حواس کھو

بیٹھا اور منزہ کو بچانے کے دوران خود بھی غوطے کھانے لگا۔ کیا یہ بہن کے لیے مقبول کا محبت اور ایثار کا جذبہ نہیں تھا؟

ہر انسان رشتوں کے تانے بانے میں محبتوں نفرتوں اور رقابتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے لیکن آفرین ہے مقبول پر کہ اس نے تمام رشتوں کو بڑے احسن طریقے سے نبھایا۔ شریک حیات سے گہری وابستگی کے باوجود بہنوں اور بھائیوں کی محبت میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیا۔ ماں جائیوں سے بے پناہ محبت کو اولاد سے گہری محبت کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔ ساری زندگی رشتوں کو اس طرح نبھایا کہ تمام تر مصروفیتوں کے باوجود دوستوں حتیٰ کہ دور پار کے رشتہ داروں کی غمی خوشی میں برابر کا شریک رہا۔

والدین کی شفقت ہو یا اولاد کی فرماں برداری، بہن بھائیوں کی محبت ہو یا ایثار و قربانی، علم و دانش ہو یا قناعت پسندی، ڈپٹی صاحب کا گھرانہ تمام رشتہ داروں میں منفرد مقام رکھتا تھا۔ تمام رشتہ دار، دوست احباب اس گھرانے کو اپنا ideal گھرانہ سمجھتے تھے اور پھر نہ جانے، خوشیوں سے اس ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ یکایک مقبول پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یکے بعد دیگرے ایک سے بڑھ کر ایک صدمہ مقبول کا مقدر بن گیا۔

سب سے پہلے، خوش و خرم چھوٹا بھائی چشم زدن میں مقبول کی آنکھوں کے سامنے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دس ماہ کے بعد اس کے والد صاحب جو اس کے لیے مشعل راہ تھے، اچانک داغِ مفارقت دے گئے۔ دو سال کے بعد بڑا بھائی رات کو ٹھیک ٹھاک سویا اور صبح پتا چلا کہ وہ سارا بوجھ مقبول کے کندھوں پر ڈال کے ابدی نیند سو گیا ہے۔ یہ سب صدمے دیکھنے کے چھ ماہ بعد، جان سے پیاری ماں بھی چل بسیں۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں والدین اور بھائی چلے گئے اور مقبول کو دکھوں کے پہاڑ سے نبرد آزمائی کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔ دعاؤں اور شفقت کا سایہ بھی چھن گیا۔

آفرین ہے مقبول کی ہمت، حوصلے اور برداشت پر۔ تمام تر دکھوں اور آزمائشوں کے باوجود، مقبول نے سارے دکھ درد اپنے سینے میں سمو لیے اور ایک نئے عزم کے ساتھ، ڈپٹی صاحب کے باقی ماندہ خاندان کے ہر فرد کے تحفظ اور رہنمائی کا تنِ تنہا بیڑا اٹھایا۔

مقبول ابھی پچھلے صدموں سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ شریک حیات بھی داغِ مفارقت دے گئی۔ باری تعالیٰ نے 'ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں' کے مصداق، آخری اور کڑا امتحان باقی رکھ چھوڑا تھا جو موذی مرض کی صورت میں وارد ہوا۔ واہ میرے یار تو نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ چھوٹی بہن اور بڑی بیٹی کی رفاقت میں اس مرض کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پھر تمام ذمہ داریاں منزہ کو سونپ کر آخری ہچکی لی اور غموں سے آزاد ہو گیا۔

آخر میں مَیں مقبول کی حکمت و دانش، علم و فضل اور عزم و ہمت کی صلاحیت کو انگریزی کے ایک فقرے میں دادِ تحسین پیش کروں گا۔

"He was the man, who managed relations, friends and affairs very well."

ooo

❀

—نوشین حیدر—

؎ قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

"تم لکھا کرو"

"سر، مجھے نہیں لگتا کہ میں اتنی Creative ہوں کہ کچھ لکھ پاؤں۔"

"اس شہر میں تم سے زیادہ Creative اور کوئی نہیں۔"

وہ مدبّر اور دانا شخص میری عزتِ نفس کی بحالی کے لیے انتہائی پرخلوص مشورہ دے رہے تھے۔

اور آج جب زندگی میں پہلی مرتبہ لکھنے بیٹھی ہوں تو اس افسوس کے ساتھ کہ وہ مشورہ جو ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں دیا تھا اس پر عمل، ان کے جانے کے بعد کر رہی ہوں۔

میرا قلم، میرا ساتھ نہیں دے رہا اور سوچ رہی ہوں کہ مجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانے والے اب اس ناپائیدار دنیا میں نہیں ہیں۔

ڈاکٹر مقبول میرے Mentor تھے۔ اپنے بچوں یا اپنی زندگی سے متعلق کوئی

مسئلہ ہو، ڈاکٹر صاحب انتہائی توجہ سے سنتے اور چند دن غور کرنے کے بعد اس پر فیصلہ دیتے۔ میرا M.Phil کرنے کا فیصلہ بھی انہوں نے دیا اور پھر اس کھردری، خود پسند اور فانی دنیا سے مجھے اکیلے لڑنے کے لیے چھوڑ کر، خود کہیں دور، بغیر کوئی ٹھکانہ بتائے چلے گئے۔

بظاہر Leftist نظر آنے والے، خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات پر بہت سے نام نہاد، مذہبی پیشواؤں سے زیادہ عمل کرتے تھے۔ سادگی، توازن اور خلوص کا مرقع ایک بڑا آدمی، جس نے کسی کی لاش پر پاؤں رکھ کر، اپنے قد کو کبھی اونچا نہیں کیا۔

اس شہر کے واحد ڈاکٹر جو کہ فیس لینے کی بجائے اپنے مریضوں کی تواضع کرتے۔ جن کے سینے میں Calculator کی جگہ دل تھا۔

ایک روز کہنے لگے۔

''مٹھیاں بنانی اب کسی کو بھی نہیں آتیں۔ پرانی بیبیاں کونڈوں کی نیاز اور شادی بیاہ پر بنایا کرتی تھیں۔''

میں نے کسی 'پرانی بی بی' سے recipe پوچھی، بنا کر رکھیں تو پتا چلا کہ وہ ہسپتال میں ہیں۔ ان کی بیٹی زرقا کے گھر گئی تو آرام فرما رہے تھے۔ میں انتظار کرتی رہی مگر۔۔۔ یہ وہ ڈاکٹر مقبول نہیں تھے۔ الفاظ کو comprehend کرنے سے قاصر۔۔۔ آنکھوں میں اجنبیت۔۔۔ میرا دل ناتواں برداشت نہ کر پایا اور نہ ہی دوبارہ جانے کی ہمت ہوئی مگر دل کے کہیں قریب سے آواز آئی۔

''ہم ڈاکٹر مقبول صاحب کو کھو چکے ہیں۔''

میرے جیسے کم مایہ لوگ، ان کی شخصیت پر کیا روشنی ڈال سکتے ہیں۔ انہیں ایک اچھا انسان، اچھا ڈاکٹر اور انٹلکچوئل کہہ کر ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ جتنا خلوص، جتنا وقت انہوں نے مجھے دیا۔ میں یہ چند بے ربط حروف لکھ کر یقیناً اس کا رتّی بھر بھی بدلہ نہ چکا سکوں گی۔

ایک Feminist ہونے کے ناطے، مجھے ان کی سب سے زیادہ بھلی بات یہ لگتی تھی کہ ان کے دل میں عورت کی عزت تھی۔ اپنی بیٹیوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے، ان کی آنکھوں میں چمکتے جگنو، میں نے کسی باپ کی آنکھوں میں آج تک نہیں دیکھے۔ اپنی مرحومہ بیوی کا Extrovert ہونا ان کے لیے انتہائی قابلِ فخر تھا۔

مجھے اکثر محبت سے ڈانٹتے ہوئے کہتے:

''تم دوسری منزہ ہو۔ وہ بھی بہت Nostalgic ہے۔ کبھی بھی اپنے میکے کی یاد سے باہر نہیں آ سکتی۔''

Sir، آج آپ نہیں ہیں لیکن میرے جیسی Nostalgic اس حقیقت کو کبھی قبول نہیں کر پائے گی۔ جب کبھی کسی سوال کا جواب چاہیے ہوگا تو آپ کی بتائی ہوئی wisdom سے اس کا جواب ڈھونڈنے کی اپنی سی کوشش کروں گی اور مجھے مایوسی نہیں ہوگی۔ آپ ایک عطیہ خداوندی ہیں۔ میں کبھی 'تھے' نہیں کہہ پاؤں گی کہ بخدا آپ اپنے پیاروں کے دلوں میں زندہ جاوید رہیں گے۔

؎ یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

ooo

ڈاکٹر مقبول صاحب

—نویدہ کوثر—

میں ان ڈاکٹر مقبول صاحب کی بات کر رہی ہوں کہ جن کے کلینک پر جاتے ہوئے چاہے موڈ پر اُداسی کے گہرے سائے ہوں مگر باہر نکلو تو مسکراتے ہی جانے کو جی چاہے۔

جب میری ان سے ملاقات ہوتی تو وہ اپنے دونوں تالی بجانے کے انداز میں جوڑتے اور کہتے:

"بی بی رانی، لائل پور کی دیوانی، خدا کے لیے خود کو ضائع نہ کرو کہ چار، پانچ لوگوں کے برابر علم و دماغ ہے تمہارے پاس قلم اُٹھاؤ اور شروع ہو جاؤ۔"

نہ کوئی غرض، نہ کوئی طلب، پھر بھی روشنی ہی روشنی، ایسا بھی ہوا کرتا ہے کوئی؟ نہ ہوا اور کوئی، ڈاکٹر مقبول صاحب تو بس ایسے ہی تھے۔

ے عجیب رنگِ صداقت تھا اس کے چہرے پر
گلوں سے اٹھتی صبا شمیم لگتی تھی

دلی سکون میسر تھا اس کی قربت میں
ہر اک ادا اس کی بہت کریم لگتی تھی
تیری ہر اک عنایت پہ رشک آتا ہے
ذات تیری ہر وصف سے کیسی عظیم لگتی تھی

میں سابقہ لائل پور اور حالیہ فیصل آباد کی سحر انگیزی کی اسیران سے بحث کرتی۔

"کیا ہوا جو بخاری صاحب نے کتاب لکھ ماری اور آپ نے اور ڈاکٹر احسان صاحب نے ان کی مدد کر دی۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ بخاری صاحب اس شہر کے مجھ سے بڑے عاشق ہیں۔"

وہ کھل کر ہنستے اور کہتے

"بالکل درست، ایسا ہی ہے، ہور دس، ہور کی اعتراف جرم کرنا اے۔"

میں اور بشریٰ علم الدین دونوں ان کے ساتھ مل کر ہنس دیتیں۔ ایسا عالی ظرف دوسرا کہاں ملے گا جو صرف ایک مسکراہٹ کی خاطر، اپنے کارنامے سے انکاری ہو جائے۔

اس بے رحم دنیا میں کاش رب نے دو چار اور ڈاکٹر مقبول بنائے ہوتے تو دنیا کا یہ حال نہ ہوتا کہ:

ے ڈھونڈتے ہیں راستہ اک دوسرے کو روند کر
اے خدا کیا اس زمیں کی وسعتیں جاتی رہیں

خدا نے ہمارے پاس Choice نہیں رکھی۔ ورنہ ڈاکٹر مقبول صاحب کی جگہ، مجھ جیسے چلے جائیں تو کام چل سکتا ہے لیکن اب ان کئی سو لوگوں کا کیا بنے گا جو ان سے جینے کا ہنر سیکھتے تھے۔

ے مسافتوں نے تھکا دیا ہے سو رو پڑی ہوں
کسی نے دل کو دکھا دیا ہے سو رو پڑی ہوں

ے تاریک راہوں میں جس کی خاطر دیہ جلایا
اسی نے اس کو بجھا دیا ہے سو رو پڑی ہوں

یہ مشیت ایزدی ہے ورنہ وہ ضرور منزہ، نویدہ اور ہم جیسے بے شمار لوگوں کے بہتے آنسوؤں کو ضرور مدنظر رکھتے کہ ڈاکٹر مقبول صاحب کی چھاؤں ہمارا وہ قیمتی اثاثہ ہے جوان کے جانے سے، ہم سے چھن گیا۔

○○○

رپورٹ جلسہ مزدور کسان پارٹی

—نور خان—

عظیم دانشور، ادیب، ڈرامہ نگار، قانون دان اور پاکستان مزدور کسان پارٹی کے بانی صدر میجر اسحاق محمد کی چھبیسویں برسی بڑے ہی جوش وخروش عقیدت واحترام کے ساتھ ۴۴۴ گ ب اسحاق نگر تحصیل جڑانوالہ ضلع فیصل آباد میں منعقد ہوئی۔

جو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل تھی کہ دو حصوں میں تقسیم ہونے کے سات سال بعد پہلی مرتبہ کمیونسٹ مزدور کسان پارٹی اور مزدور کسان پارٹی نے مشترکہ طور پر منعقد کر کے بدخواہوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔ جو اتحاد و اشتراک کی طرف پہلا قدم ثابت ہوگا۔ اتنے خوشگوار ماحول میں کبھی کامریڈ غلام نبی کلّو کی قیادت میں منعقد ہونے والے اجتماعات کی یاد تازہ کر دی۔

اسٹیج کا ماحول بھی اتنا منظم اور منفرد تھا کہ طبقاتی شعور و یگانگت کا مظہر تھا۔ جس کا انتظام دونوں پارٹیوں کی ایک چار رکنی کمیٹی جو محفوظ خان شجاعت، کامریڈ ضیاء الحق، چوہدری ارشاد اور کامریڈ حبیب پر مشتمل تھی نے کیا تھا جبکہ صدارت ڈاکٹر مقبول اختر کے حصہ میں آئی

تھی اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض بہت ہی عمدگی سے نئے جوش ولولے کے ساتھ لیکن سادگی سے محمد بابر نے نبھائے۔

پریزائڈنگ کمیٹی نے طے شدہ اصول کے مطابق ڈاکٹر مقبول اختر کا نام افتتاحی خطاب کے لیے پکارا جنہوں نے صدارتی پینل کی طرف سے شرکا کو جی آیاں نوں کہا اور اعلان کیا کہ آئندہ کامریڈ میجر اسحاق کی برسی ۲ / اپریل، ۶۴۴ گ ب پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا ہر قیمت پہ ہر سال بلا تعطل منعقد ہوگی اور کوئی مقرر سٹیج پر آ کر اختلافی بات نہیں کرے گا، اشاروں کنایوں سے بھی کسی کی تضحیک و توہین کے پہلو کا اظہار نہیں کرے گا، صرف اور صرف حکمران طبقات، اشرافیہ، سامراج، جاگیرداری، سرمایہ داری اور عوام دشمن طبقات کے خلاف اور میجر اسحاق کی سیاست اور جدوجہد پر اظہار خیال کیا جا سکے گا۔ خلاف ورزی کرنے والے اور متعین اصول توڑنے والے مقرر کو تقریر سے روک دیا جائے گا اور کسی مقرر کو منفی گفتگو کی اجازت نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر مقبول اختر نے کہا کہ انقلاب فرانس سے قبل ایک فیصد لوگ حکمران تھے جاگیرداری نے حکمرانوں کی تعداد میں اضافہ کیا بھوکوں کی تعداد کم ہوگئی لیکن بھوک بڑھ گئی۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت نے محکوموں کی تعداد مزید کم کی اور حکمرانوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ بے شک بھوک مزید بڑھ گئی اس لیے میجر اسحاق محمد کی فکر کو مزید آگے بڑھانے کے لیے تسلسل سے جدوجہد کو آگے بڑھائیں ۴۴۳ گ ب میں ۱۲ اپریل کا سالانہ اجتماع بہت ہی موثر اور بے مثال عمل ہے۔

منافرت اور منافقت ذاتی عناد اجلاس سے باہر ایسے چھوڑ آیا کریں جیسے نمازی مسجد سے باہر جوتے اتار آتے ہیں۔

محفوظ خان شجاعت نے مزید کہا کہ جب افضل بنگش، شیر علی باچہ اور امتیاز عالم پارٹی کو داغ مفارقت دے گئے اور میجر اسحاق محمد ملتان میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے

تھے تو نوائے وقت کے صحافی نے پارٹی کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرنے والے صاحبان کے خلاف شعلہ بیانی کرانے کے لیے سوال کیا کہ آپ کے پرانے اور صف اول کے لیڈران کرام پارٹی میں کب واپس آ رہے ہیں تو جواب میں میجر اسحاق محمد نے صحافی کی توقعات کے برعکس فرمایا کہ جب عدت کی مدت پوری ہوگی تب ہم ایک ہو جائیں گے۔ ہم نے دیکھا کہ فرانس میں ایک بہت بڑی تعزیتی تقریب منعقد ہوئی جس میں میجر اسحاق محمد کی وفات کے صدمے سے سرشار سب مقررین سے زیادہ نڈھال افضل بنگش نے عقیدت کے اظہار کے وہ گوشے وا کیے کہ عقل دنگ رہ گئی جو میجر اسحاق محمد کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور بہت جلد دنیا فانی سے رحلت فرما گئے۔

ظہور مانسہروی نے اپنے خطاب میں کہا کہ کامریڈ میجر اسحاق کی جدوجہد کو تسلسل کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرنا قابلِ ستائش عمل ہے۔ آج جسمانی طور پر بے شک میجر اسحاق موجود نہیں لیکن ان کی فکر پر عمل کرتے ہوئے اس مشعل کو نئی نسل تک پہنچائیں گے۔ آج موقع ہے کہ درست فیصلہ کریں کہ استحصالی قوتیں متحد ہو رہی ہیں اور ہم متحد نہیں ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تاریخ کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ انہوں نے امام علی نازش کی جدوجہد کو بھی مشعل راہ قرار دیا۔

سی ایم لطیف ایڈووکیٹ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تنظیمیں فیل ہو چکی ہیں کیونکہ تنظیمیں معاملات میں الجھی ہوئی ہیں اور عوام بہت آگے جا چکے ہیں۔ خدارا میجر اسحاق کے راستے پر چلتے ہوئے آگے بڑھو اور قیادت فراہم کرو۔ تحریک آگے چلی گئی ہے اور ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب جمہوریت سے کام نہیں چلے گا عوام کو اقتدار دینا ہوگا۔

ممتاز علی ایڈووکیٹ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کارکن کو اپنی اناء کو قائم رکھنا چاہیے۔ گروہ بندی، گٹھ بندی اور فروعی اختلافات کا شکار ہونے کی بجائے نظریاتی شعور میں اضافہ کرنا چاہیے، مطالعہ پر توجہ دینی چاہیے، ظالم اور مظلوم کا فرق واضح کرنا چاہیے۔

عبدالستار گنہگار نے بلھے شاہ کے کلام سے آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ”بلھے شاہ اساں مرناں ناہیں گور پیا کوئی ہور“ تو آج میجر اسحاق اپنی فکر و عمل اور جدوجہد کے ناطے زندہ و جاوید ہیں۔

انوار البشیر ہنگی آف کاغان نے کہا کہ میجر اسحاق کا خلوص، اخوت، محبت، بھائی چارہ اور انتھک عملی جدوجہد سب یادگار ہیں اور ان کی تمام تصانیف فکر انگیز ہیں لیکن ڈرامہ مصلی اپنی مثال آپ ہے۔ ہر مرتبہ مطالعے سے ذہن کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور نئے گوشے وا ہوتے ہیں۔

عوامی شاعر طالب حسین بٹالوی نے اپنے کلام ”وقت کی دہلیز پر بھی کھڑی ہے زندگی“ پیش کر کے داد و تحسین وصول کی۔

مزدور رہنما عرفان علی (لاہور) نے کہا کہ جس دنیا کے لیے حسن ناصر، نذیر عباسی، ہوچی منہ اور چی گویرا نے قربانی دی یہی سوشلزم ہے اسے قائم کرنے کے لیے سائنٹیفک جدوجہد کرنی ہوگی اور جنرل شاہی کے خلاف سوچ پیدا کرنا ہوگی، کھیت اور کھلیان میں جدوجہد کر کے میجر اسحاق کی طرح شعور اجاگر کرنا ہوگا۔

کامریڈ رمضان میمن (کراچی) نے اپنے خطاب میں کہا کہ میجر اسحاق کی تصنیف ڈرامہ مصلی کے ٹائٹل پر نہ مارکس، نہ لینن اور نہ سٹالن کا نام لکھا ہے لیکن پورا متن (Script) مارکسی نظریات و افکار کا عکاس ہے جو پڑھنے والے کو ذہنی آسودگی اور نظریاتی رہنمائی فراہم کرنے میں اپنا ثانی آپ ہے۔ آج میجر اسحاق کے نظریات اور عملی جدوجہد یہی ہے۔

تقاریر کے اختتام پر پریزائڈنگ کمیٹی کے ممبران محفوظ خان شجاعت، ضیاء الحق، چوہدری ارشاد، کامریڈ حبیب اور صدر تقریب ڈاکٹر مقبول اختر نے کھڑے ہو کر برسی کی تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

○○○

محترم ڈاکٹر مقبول اختر کی نذر

—احمد شہباز خاور—

حسین، ہنس مکھ، کھلا کھلا
خوش مزاج چہرہ
کہ جس کی ضو سے
رہِ صفِ دوستاں منور رہی ہمیشہ
کہ جس کے لحنِ سحر اثر سے
جو پھول جھڑتے وہ بے خزاں تھے
ستارہ و ماہ و کہکشاں تھے
وہ زیبِ گلشن
ہر ایک گل کا جو بانکپن تھا

وقارِ تقدیسِ حرف و معنی تھا
جانِ فن تھا
وہ گلعذار اپنی ذات میں ایک انجمن تھا
وہ امن کا آشتی کا مظہر
کہ جس کی سوچوں میں
آدمیت سے پیار
اخلاص کے ہزاروں چراغ روشن تھے
جا چکا ہے
اگرچہ دوری اٹل حقیقت ہے
پھر بھی یونہی کبھی کبھی یہ گماں ہوا ہے
کہ جانے والا
گیا نہیں ہے
ہماری آنکھوں میں جھانکتا ہے
ہماری روحوں میں بس رہا ہے
یہیں کہیں ہے

○○○

طلوعِ صبحِ مفارقت

— محمود شام —

تو یوں ہوا پھر
اُداس لمحوں نے سب کی آنکھوں کو یرغمالی بنا لیا تھا
دُھند تھی کہ ہر ایک رستے کو اپنا بندی بنا رہی تھی
اِک قیامت تھی
دھیرے دھیرے اتر رہی تھی
تمام احباب مضطرب تھے
یہ کیا ہوا ہے؟
یہ زندگی موڑ مڑ گئی کیا؟
وہ پھول چہرہ کہ جس کی دوری سے سب بندھے تھے
بکھر گیا ہے
وہ چاہتوں کا چراغ جس سے

رفاقتوں کے تمام رستے ہوئے منور
وہ بجھ گیا ہے
کہ ہجرتوں کے گلاب پہنے
وہ موسموں کا سفیر میرا
نئے جزیروں کو چل دیا ہے
تمام احباب آنکھیں دریا کیے کھڑے ہیں
یہ کیا ہوا ہے؟
کہ فرشِ دل پر جدائیاں خیمہ زن ہوئی ہیں
ہر ایک منظر ہوا ہے پتھر
کہ میری صبح کا چہرہ ایسے ہوا ہے زخمی
کوئی بھی مرہم نہیں ہے شافی۔۔۔
راہ چلتے ہوئے اچانک
یہ زندگی موڑ مڑ گئی ہے
وہ دیکھو قبروں کے درمیاں جو،
روشنی کا حصار سا ہے
طلوعِ صبحِ مفارقت کا نشان ہے وہ

OOO

ڈاکٹر مقبول اختر کی نذر

-ڈاکٹر یونس ایاز-

فروغِ عظمتِ انسانیت تھا
وہ دھرتی پر کمالِ بندگی تھا

ہمیں غمِ آشنائی دے گیا ہے
وصالت میں جدائی دے گیا ہے

فشارِ ضبط کی تیرہ شبی میں
سدا جینے پر اُکساتا تھا ہم کو

ہمیشہ فرقتوں کی سرد رت میں
وہ سورج بن کے گرماتا تھا ہم کو

اسے اے کاش یہ احساس ہوتا
بچھڑ کر اس سے ہم اہلِ تمنا

رہین وقفِ غم خواری رہیں گے
شکارِ گریہ و زاری رہیں گے

حیاتِ معتبر میں ہم نے دیکھا
کوئی پیغمبری کردار تھا وہ

وہ ڈھارس تھا ہم ایسے دل جلوں کی
محبت کا بلند مینار تھا وہ

کمی اس کی قیامت تک رہے گی
ہمیں یہ زہر پینا ہی پڑے گا

OOO

فہرست

حصہ اُردو

انگریزی حصہ

حصہ دوم

ے ہر پکھودے پَر ہوندے نے
اُڈدا گاؤندا کوئی کوئی

ڈاکٹر مقبول اختر کے مضامین

یہ گُھنگی ہے

گرسنگی ہے
جسے ہے درکار اک سمندر
جو دودھ کا ہو
شہد کا دریا
یہ بھوکے ننگے ہزار بچے
چَراتے بھیڑیں
چُراتے بھیڑیں
مہیب صحرا میں گھومتے ہیں
یہ سوچتے ہیں
کہیں سے بادل جو گھر کے آئیں
ہو رحمتوں کی کبھی تو برکھا

کہ جاگ اُٹھے یہ مارو صحرا
یہاں وہاں ہر جگہ کھلیں پھر
یہ پھول صحرا کے جن کا کوئی
نہیں ہے ثانی
یہ خواب دن کے، ہے ان کا جیون
ہو گھاس کومل سی
پیٹ بھر دے جو بکریوں کے
یہ خواب دن کے
ہر ایک دن کے
انہیں پرو کر جو ایک ساحر
کہیں سے لائے
اُسی کے ہم ہو رہیں عمر بھر
اُسی کی مالا جپا کریں گے
نثار اپنی یہ جاں کریں گے
نثار ہم اس کے باپ ماں پر
نثار اس پر ہو میری اماں،
نثار اس پر ہو میرا بابا،
رہے وہ زندہ
رہے سلامت
سلام ہو اس کی آل پر بھی

OOO

ایک صحرائی دُعا

کہیں سے لاؤ
وہ سم کا دریا
جو مار ڈالے
مرے تمہارے مخالفوں کو
وہ چوبِ صحرا
جو ساڑ ڈالے
کدورتوں کو
وہ ریت، رگڑ، وہ تھوہر کانٹے
فرید بابا کے
'لائی لاون'
کہ جن سے گم ہوں

OOO

۔۔۔سب گدا ہیں

وہ رہ نورد جسے کوئی رہ نما نہ ملے
مایوسی کی بات نہیں ہے
عقل ہمارے ساتھ نہیں ہے
سَتھے خیراں
سَتے خیراں
پکیں جو فصلیں
تو باندھ پگڑ
فتوحین☆ لینے براجتے ہیں
کہ ہم گناہ گار،
ہم ہیں عاصی،
فصل میں حصہ نکالتے ہیں

کہ خرچ بھی تو

☆ حصہ بٹورنے آجاتے ہیں

بہت ہیں سائیں
حکومتوں کو وہ کتنا لوٹیں
اصل کمائی تو بس یہی ہے
یہی تو اقبال نے کہا تھا
کہ 'میر و سلطان' سب گدا ہیں

OOO

میں بھکشو
بھیک مانگنے نکلا پر آج بھاگ نے ساتھ نہ دیا
گاؤں گاؤں خود کو گھسیٹتا پھرا
سورج ڈوبا تو میرے اور میری کٹیا کے
بیچ میلوں تک پہاڑ ہے
ہوا کے تھپیڑے میرے لاغر بدن کو چیرتے ہیں
چھوٹا سا مرا پیالہ، خالی ہے
ہاں!
یہی راہ جو میں نے خود چنی ہے
مری راہبر ہے
مایوسی میں، تکلیف میں
سردی میں اور بھوک میں

○○○

اِک کُڑی پنجابن

سن او ربا میریا
میں ڈبدی ڈبدی جاں
مینوں ویر دے ربا میریا
کرے سر میرے تے چھاں

اوہ گھبرو ہووے پنجاب دا
اوہدے ہتھ ہووے تلوار
میں ویاہ کراں جے جی لگدا
کرے ٹوٹے میرے چار

ہووے دھون نیویں اوہدے ویریاں
اوہدے مچھاں وٹن یار
مینوں وڈھ کے ٹھانے ٹر جاوے
جاوے ٹھانے دار نوں

میں وڈھ لئی بھین اج اپنی
نالے وڈھیا اس دا یار
اوس میتھوں پچھیاں بنا ای
کھلوا لئی اپنی نتھ

مینوں پھاہے تاں لاناں دیریو
بس لایو ترے سو ست (۳۷)

ooo

برصغیر کے سب سے بڑے دماغ نے سوچنا بند کردیا

یہ کیسی اندھیری سہ پہر ہے۔ یہ سیاہ سہ پہر ہے۔ سورج کالا ہے اور روشنیاں گل۔ برصغیر کے آج تک کے سب سے بڑے دماغ نے سوچنا بند کر دیا ہے۔ یہ کوئی خلا سا خلا ہے۔ کون اس خلا کو، کب، پر کرے گا۔

وہ وسعت قلب ونظر جو اسحاق محمد کا حصہ تھی (ہے) گوتم بدھ کے بعد اس خطے کے کسی شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اسحاق محمد تین ہزار سال بعد پیدا ہوتا ہے اور جینئس بھی تو بقول اسحاق محمد اپنے زمانے کے مجموعی علم پر عبور حاصل کر کے اس کا ''تت'' (نچوڑ) نکالتا ہے اور یہ کام اسحاق محمد نے بطریق احسن کیا۔

''سب چیزوں کو ہار ہے بابا، بس اک فقیر کی ذات'' ایک جنازے پر ایک بزرگ کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا وہ کیوں کر، کہنے لگا جو بنا ہے ٹوٹے گا تمہارا یہ لوہے کا موٹر سائیکل۔ یہ بھی ایک دن ہار جائے گا۔ بس ایک فقیر کی ذات ہے کہ اس نے خود اپنی ذات کو چھوڑ دیا

ہے۔ وہ کیا ہارے گا؟

اسحٰق محمد نے بھی اپنی ذات کی مکمل نفی کی ہے۔ وہ پاکستانی عوام کا ایک حصہ تھا۔ وہ پاکستانی انقلاب کا ایک حصہ تھا۔ وہ زندہ ہے اُس کو شکست کہاں؟ ققنس ڈوب کر پھر ابھرتے سورج، موت کے بعد نئی حیات کا نشان ہے۔ اُداس شام کے بعد نئی صبح کا وعدہ اور ٹوٹی آسوں میں سے جذبوں۔۔۔ (سدھروں) کی لوک لہر کی پکار (کوک)۔ پنجاب کی اب تک کی تاریخ میں ققنسوں کی ایک مسلسل لڑی چلی آ رہی ہے۔'' (اسحاق محمد ققنس، ص۴)

اسحاق محمد کی فقیری ''کوئی درویش، صوفی، ملنگ، جوگی یا اور کوئی ایسی چیز نہیں۔'' (ص۹۷)

وہ انقلاب کا سپاہی تھا۔ انقلاب کا آگو اور راہبر۔ ایک کل وقتی سیاسی کارکن کہ آج کے زمانے میں ''کیمونسٹ ہی آج کے سمے کے صوفی، سادھو، جوگی، بھکشو، سنت اور سنیاسی ہیں۔'' (مصلّی)

''اگر دنیا میں سب درویش ہو جائیں تو دنیا بھوک اور دوسری ضرورتوں کی وجہ سے مر جائے، اجڑ جائے، اس میں جانوروں کے گروہ پھرنے لگیں۔ کھیتوں کھلیانوں کی بجائے اُجاڑ ہو جائے۔ خانقاہوں پر گنبد نہ ہوں اور شوالوں پر کلس نہ ہوں۔ ناچ نہ ہو، سنگیت نہ ہو، شاعری نہ اور مصوری نہ ہو، بت سازی نہ ہو۔ اگر دنیا کی بستی بس رہی ہے تو یہ رنگ برنگے پھول اور پھل اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔ دنیا سکھی ہے تو درویشی بھی اچھی لگتی ہے۔''

''درویش وہ جو دنیا کی خدمت کرے''

''دُلّے، سب سے بڑی درویشی وہ ہے جو عوام کو ظالموں سے بچائے اور دُلّے تو بہت بڑا درویش ہے۔''

تو بھی بہت بڑا درویش ہے، اسحاق محمد!!!

اسحاق محمد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں گوتم اور نانک، پورس اور پانی، دلّا

بھٹی اور شاہ حسین، خوشحال خٹک اور ہوشو، بھگت سنگھ اور حسن ناصر اور دوسرے ان گنت لوگ پروئے ہوئے ہیں۔ جن کو اس دھرتی نے جنم دیا ہے۔ جو اسی دھرتی کے بیٹے تھے اسی دھرتی کی مانگ سنوارنے کے لیے جئے۔ اسی دھن میں مرے اور اسی دھرتی میں مل گئے۔

یہیں ان کی سب تمنائیں اور کامنائیں تھیں۔ یہیں ان کے قبلے اور کعبے تھے۔ انہوں نے دوسری سرزمینوں کے خواب نہیں دیکھے اپنے عوام میں رہ کر، اپنے عوام کے لیے، اپنے وطن کے لیے، اپنی دھرتی کے لیے سوچا۔ اس پر عمل کیا۔

ایک فلاسفر، ایک تاریخ دان، ایک ادیب، ایک زبان دان، ایک شاعر، ایک ڈرامہ نگار، ایک سیاست دان، ایک سپاہی اور سب سے بڑھ کر ایک سچا اور باعمل انقلابی یہ تھے اسحاق محمد کے چند روپ۔ اس میں یہ سب صفات یک جا تھیں اور یہ چیز اس برصغیر کے کسی اور شخص کے حصے میں نہیں آئی۔ مگر کسرِ نفسی بلکہ تاریخی ادراک کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ یہی کہا۔ ''ہم تو انقلاب کی کھاد ہیں، آپ لوگ انقلاب دیکھیں گے۔''

کہتا تھا

ہم تو کھاد ہیں
اس انقلاب کی
جو بے اٹل جو آئے گا۔
ہم ہوں نہ ہوں
کھیتوں کو کھاد دے گیا
کب فصل آئے گی؟

آج بھی چند لٹیرے اس دھرتی کو گھیرے ہیں اور یہ دھرتی پکار رہی ہے

اُٹھو اب مائی سے اُٹھو
جاگو میرے لال
بیری براجے راج سنگھاسن

تم ماٹی میں لال
کب اٹھو گے کب جاگو گے دھرتی ماں یہ پوچھتی ہے کہ
کب آؤ گے
کب آؤ گے
''بھوکے بیٹوں کے لیے روٹی
اندھی آنکھوں کے لیے نور
اور بے آس لوگوں کے لیے
اچھے دنوں کی جھولی بھر کر
کب لاؤ گے
کب لاؤ گے''

(فضل احسن رندھاوا)

یہ دھرتی ماں تجھے پکارتی رہے گی۔ دھرتی اپنے بیٹے گوتم بدھ کو بلاتی ہے۔ دھرتی اپنے نانک کو آواز دے رہی ہے۔ ہوشو اور خنک کہاں گئے۔ وارث شاہ نہ رہا، شاہ حسین نہ رہا۔

کیا اس دھرتی نے انہیں بھلا دیا۔ اس دھرتی کی ہر سانس میں اپنے ان جیالے بیٹوں کا نام ہے۔ یہ دھرتی تو اپنے بیٹوں کی رکھوالی ہے۔ اسحاق محمد تیرا نام زندہ رہے گا۔ جب تک یہ دھرتی کسی سیارے سے ٹکرا کر تباہ نہیں ہو جاتی۔

تجھے نوید ہو اے دھرتی ماں۔ تیری جھوکیں پھر آباد ہوں گی۔ تیرے کھیتوں میں فصلیں لہرائیں گی۔ تیرے بیٹے خوشحال ہوں گے۔ تیرے بچوں کے چہروں پر رونق لوٹ آئے گی۔ اس لیے کہ تو نے اسحاق محمد جیسے بلوان کو جنم دیا۔ اس لیے کہ تیری گود میں اسحاق محمد چند دن جیا۔۔۔

اس پاک سرزمین نے وہ جیالے جنے ہیں جنہوں نے علم اور گیان کی روشنی ساری دنیا میں پھیلائی۔ اس دھرتی میں دنیا کا سب سے پہلا گرامیرین پیدا ہوا۔ اس دھرتی سے

بدھ مت دنیا کے کونے کونے میں پھیلا۔ اُس جاگیرداری دور میں خدا کے حوالے کے بغیر انسان کی بھلائی کا پرچار کرنے والا واحد ''مذہب''۔۔۔ اس دھرتی نے جیالوں کی نسلوں کی نسلیں پیدا کیں۔ جو دلی دربار سے مغلوں اور بہت سے غیر ملکی حکمرانوں سے مسلسل ٹکراتے رہے۔ اسی سرزمین نے وہ شیر پیدا کیے جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ برابر کی ٹکر لی حتی کہ وہ لمحہ بھی آیا جب انگریز سامراج پنجاب کی دھرتی سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے کے قریب آ پہنچا اس دھرتی نے ہمیشہ برہمن اور اس کے نظریے کا مقابلہ کیا ہے۔

اسحاق محمد اس علم و حکمت، اس دانائی، اس جیداری، اس بہادری، اس مزاحمت اور اس انقلابی عمل کا نقطۂ عروج تھا۔

''سوچ تیری مہران سے واسع
جذبے تیز تیرے راوی سے
ہٹ ہوشو کی
آن خنک کی
ڈٹے مردانگی تیری
(منظور نیازی)

''تو اس دھرتی کا حسین ترین پھول تھا۔ (احمد بشیر) تو نے جیلوں میں بھنگڑے ڈالے، تو نے شاہی قلعے کے عقوبت خانے کو لباس کی طرح پہنا'' (سلیم جہانگیر)

یار محنت کشاں
دست بے چارگاں
میجر اسحاق تھا
روشنی کا نشان
جبر ابہام کا ہو کہ اوہام کا
تو نے ہر جبریت سے چھڑایا ہمیں (حبیب جالب)

میجر اسحاق محمد وہ انقلابی تھا جس نے سٹیجوں پر کھڑے ہو کر نعرے نہیں مارے اور

بعد میں سرمایہ داروں، جاگیرداروں کے ڈرائنگ روموں اور غیر ملکی، سفارت خانوں کے چکر نہیں کاٹے اس نے جتنا کیا ٹھوس کیا۔ اس نے ہمیں ابہام اور اوہام کے چکر سے نکالا اس نے ہمیں دنیا کو کھلی آنکھوں دیکھنا سکھایا اس نے پاکستان کی انقلابی تحریک کو ایک مستقل جہت عطا کی۔ دشمن اور دوست طبقات کی تمیز سکھائی۔ صحیح خطوط پر انقلابی پارٹی استوار کی۔ انقلابی کارکنوں کی تربیت کی۔ ان کو اُنگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ برصغیر کے انقلاب کو فلسفیانہ موشگافیوں کی بھول بھلیوں اور غیر ملکی تجربے کی اندھا دُھند تقلید سے آزاد کیا۔ اس نے خود کہا ہم تو انقلاب کی کھاد ہیں۔ اتنا ضرور کیا ہے کہ نئے آنے والوں کا راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب یہ ان کی ہمت ہے کہ وہ اس راستے پر کتنا تیز چلتے ہیں۔

ے کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

ہے مکرر لب ساقی پہ صدا میرے بعد

میجر اسحاق عظیم ساتھی، عظیم رہنما اور عظیم استاد تھے۔ آج پاکستانی انقلاب کا روشن سورج غروب ہو چکا ہے۔ انسان کا جسم فانی ہے اور اس نے بالآخر فنا ہونا ہے مگر سوچ کا بھی ایک مادی وجود ہے۔ جو سائنسی سوچ تجربات کی کٹھالی میں سے گزر کر ایک دفعہ تخلیق ہو گئی اس کا بھی ایک مادی وجود ہوتا ہے۔ عظیم ساتھی اسحاق محمد، عظیم رہنما اسحاق محمد اور عظیم اُستاد اسحاق محمد اپنے نظریات اپنے عمل، اپنے کردار اور اپنی جدوجہد کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جب تک پاکستان اور پاکستان کے محنت کش باقی ہیں۔ ساتھی اسحاق محمد کا نام زندہ رہے گا۔

تاریخ کا پہیہ اشخاص کے چلے جانے سے نہیں رُکتا لیکن ساتھی اسحاق محمد جیسے عظیم رہنما اور عظیم استاد کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بھی آسانی سے پر نہیں ہو سکتا۔

ساتھی اسحاق محمد نے ساری عمر یہی سبق دیا ہے کہ مشعل کو بجھنے نہ دو، جھنڈے کو گرنے نہ دو۔ دیپ سے دیپ جلاؤ اور جیون کے اندھیارے رستے پر بڑھے چلو۔ ساتھی

اسحاق محمد کے ہم پر بہت سے احسانات ہیں۔ ان کا بدلہ ہم اسی طرح چکا سکتے ہیں کہ ان کی جلائی ہوئی مشعل کو بجھنے نہ دیں۔ ان کے جھنڈے کو گرنے نہ دیں۔ جس انقلاب کی وہ کھاد ہوئے اس کھیت کو بارآور کریں۔ ساتھی اسحاق محمد کی یاد ہم سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم نئے عزم اور نئے جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اپنے دل اور اپنے دماغ میں انقلاب کو جگہ دیں۔ اپنی زندگی کو اس طرح ڈھالیں کہ ہم پاکستان کے غریب عوام کی خدمت کر سکیں۔

سنو

پکارا ہے اس نے شاید
سنو یہ دھرتی ہے ماں تمہاری
نہ اس کی عزت کو بیچ کھانا
نہیں ہے دھرتی
تو کچھ نہیں ہے
اگر تمہارا ملک نہیں ہے
تو کس کی خدمت کرو گے بابا؟
"بغیر برتن پکیں نہ چاول"
تمہارا آگا
تمہارا پیچھا
تمہاری دھرتی
کہاں ہو بابا!

OOO

عالمی امن اور آزادی میں ترقی پسندوں کا کردار

(نیشنل سٹوڈنٹ فیڈریشن کے زیرِ اہتمام سیمینار 13 نومبر 2008)

سلام حسن ناصر پر۔۔۔ جس کے نام پر ہم آج اکٹھے ہوئے ہیں۔

ع شہیدِ عصر پھر اک اور سال بیت گیا

پرائمری جماعت کا سبق ابھی مجھے نہیں بھولا۔ آیئے پہلے یہ تعین کرلیں کہ ترقی پسند کون ہے؟ اس کے کردار کا تعین بعد میں کریں گے۔

حسن ناصر تو تب سندھ کی کمیونسٹ پارٹی کا جوائنٹ سیکرٹری تھا۔ ہم لوگ اب کمیونزم کے نام سے اس طرح شرماتے ہیں جس طرح ایک عورت اپنے نکاح شدہ مرد کا نام لیتے شرماتی ہے۔۔۔ باقی دنیا بھر کے مردوں کے نام دھڑتے سے لیتی ہے۔

ایک ترقی پسندی کی تحریک ادب میں تھی۔۔۔ بہت جاندار۔۔۔ بہت فعال۔ اگر یوں کہیں کہ اُردو ادب میں سے ترقی پسندی نکال دیں تو کچھ خاص باقی نہیں بچتا تو یہ غلط نہ ہوگا۔

یا پھر اس سے مراد سیاست میں بایاں بازو لیا جاتا تھا۔ بھارت میں کمیونسٹوں اور لبرل پارٹیوں کا محاذ پروگریسو یعنی ترقی پسند کہلاتا ہے۔ بائیں دائیں کی تفریق بھی اب کالعدم

ہوتی جارہی ہے کہ ایک اماں کے بچے اور ایک امہ کے مسئلے ایک ہی ہیں۔ ''میں اور شاہ عبداللہ بھائی بھائی، زرداری اور نواز شریف، اسامہ اور بش۔''

اساں شوہدے مراثی سانوں کیہ حسیناں پاکاں نال تے یزیداں پاکاں نال

اگر اقرار باللسان کو ہی کافی سمجھ لیں تو بھی پاکستان میں ترقی پسند کتنے ہیں اور کتنے فعال ہیں۔ بہت زیادہ تو کبھی بھی نہ تھے مگر فعال تھے اور دشمنوں کو ان کی بہت تکلیف تھی۔

میجر اسحاق محمد کہا کرتے تھے کہ کُتّے کی طاقت کا اندازہ دشمن کی چیخوں سے لگاتے ہیں۔

لائل پور میں ویت نام کے مسئلے پر امریکہ دشمن جلوس نکالتے تھے تو جماعت اسلامی کے لٹھ بردار عمل میں آجاتے تھے۔ میری عمر کے کچھ لوگوں کے کاندھوں پر شاید ان مجاہدین کی لاٹھیوں کے نشان ہیں۔

صابریہ اور شتیلہ کے مہاجر کیمپوں پر اسرائیلیوں کی بمباری کے خلاف، تمام دنیا کے ترقی پسندوں نے، انسانیت دوستوں نے بشمول اسرائیلی کمیونسٹوں کے، احتجاجی جلوس نکالے۔ امریکا اور اسرائیل کو دی جانے والی گالیوں کے اثرات کو کم کرانے کے لیے پاکستان کی جماعت اسلامی نے فحاشی کے خلاف جلوس نکالا۔۔۔ یا فحاشی تیرا آسرا۔ کس کس جگہ کام آتی ہے۔

اب تو یہ دن بھی خواب ہوئے۔ جماعت اسلامی بھی ہمیں لاٹھیاں نہیں مارتی، کوئی فِتّے منہ بھی نہیں کہتا۔ انگریزی میں کہتے ہیں۔

No body kicks a dead dog.

کیا وقت تھا! (ہر بڈھا یہ فقرہ دن میں کم از کم دس بار دہراتا ہے۔ سنا ہے ثواب ہوتا ہے) بہر حال یہ وہ وقت تھا کہ جب ہر کوئی جانتا تھا اور مانتا تھا کہ ترقی پسند کون ہے اور رجعت پسند کون۔ موخر الذکر بعد میں اپنے آپ کو اسلام پسند کہلانے لگے تھے تا کہ شناخت

گہری ہو جائے۔

ترقی پسند کمیونزم سے ایسے بھاگے کہ جعلی ڈگریوں کی بلھڑ یونیورسٹی قائم کر لی۔

فلاں جاگیردار ترقی پسند ہے، فلاں جاگیردار قوم پرست ہے، فلاں جاگیردار عوامی ہے، فلاں پیر، فلاں جاگیردار کا جانباز سپاہی ہے۔ غریب لوگوں کی بسوں پر بم پھینکنے والے، بچیوں کے سکول جلانے والے، سامراج دشمن جدوجہد میں مصروف ہیں اور بچیوں کے ادارے قائم کرنے والی NGOS، سامراج کی ایجنٹ ہیں۔ قربان اس عقل و دانش کے، مُلّا بھی یہی کہتا ہے۔

بات سکولوں کی آئی تو تعلیم کی بھی ہو جائے۔ نیشنل سٹوڈنٹ فیڈریشن مطالبہ کرتی ہے کہ ملک میں جاری طبقاتی نظامِ تعلیم کو فی الفور بند کیا جائے اور یکساں نظام لاگو کیا جائے۔ بہت معقول مطالبہ ہے۔ تیری آواز مکے اور مدینے! مگر کونسا نصاب یکساں طور پر لاگو کیا جائے۔

مدرسوں میں فرقہ وارانہ نصاب ہے۔ سرکاری سکولوں میں اردو، انگریزی، معاشرتی علوم کے نام پر اسلامیات پڑھائی جاتی ہے۔ یقین نہ ہو تو سکولوں کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں۔ چاروں مضامین میں ایک ہی مواد ہے۔ امیر امراء اپنی اولاد کو بین الاقوامی جدید علوم، جدید زبان میں معیاری تعلیم دلاتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ یہ تعلیم بھی بند کر دی جائے۔

پاکستانی ترقی پسندوں سے زیادہ ترقی پسند تو یوپی کے نچلی ذاتوں کے ان پڑھ لوگ ہیں جو یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہمارے بچوں کو بھی سرکاری سکولوں میں انگریزی سکولوں والی تعلیم دی جائے اور ہم اپنے محنت کشوں کے لیے مادری زبان کی تعلیم مانگ رہے ہیں تا کہ وہ گیت اور نعتیں گا سکیں۔ خدا لگتی کہیے ہماری کس مادری زبان میں مارکس، ڈارون، آئن سٹائن اور جدید سائنس اور ریاضی کی تعلیم ممکن ہے۔

ے مجھ کو انسان کی ضرورت ہے
رحم کھا کر خدا نہ دے جانا

دراصل ہم میں یہ پرانی بیماری ہے کہ ہر ہجوم کو عوام سمجھتے ہیں خواہ وہ اقلیتوں کے حقوق سلب کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں یا خواتین کی آزادی۔۔۔ اب تو کچھ برقعہ پوش خواتین یہ نعرے لگاتی پھر رہی ہیں کہ ہمارے حقوق غصب کرو۔ ہمارے ہمسایہ ممالک، جنہوں نے رواج اور مذہب کے نام پر عورت کو قید کر رکھا ہے ان کے آئیڈیل ہیں ویسے تو یہ رواج ہمارے بہت سے علاقوں میں موجود ہے باقی علاقوں میں عورتوں کے چہروں پر تیزاب پھینک کر یہ مقصد حاصل کر لیا جائے گا۔ ترقی پسند تالیاں بجاتے ہیں۔ پڑھی لکھی خواتین کے لطیفے سناتے ہیں۔ اس پر کوئی سیمینار نہیں ہوتا، کوئی جلوس نہیں نکلتا۔

میجر اسحاق محمد کہتے تھے کہ ہم نے بہت خوبصورتی سے انقلاب کو سویز کے مغرب اور بنگلہ دیش سے مشرق میں محدود رکھا ہے۔ درمیانی علاقہ تو بقول ایک مغربی مصنف کے Allah's Garden ہے۔ یہاں عورتوں اور اقلیتوں کے لیے جدوجہد کرنا ذرا مشکل ہے۔

کیوں نہ پہلے عالمی امن قائم کر لیں، کیوں نہ پہلے انگریز سے مردوں کے لیے آزادی حاصل کر لیں، کیوں نہ پہلے مرد مرد اور مسلمان مسلمان مل کر انقلاب کر لیں، پھر باقی لوگوں کے حقوق پر غور فرمائیں گے۔ (عورتیں اور اقلیتیں انتظار فرمائیں)

کیا ہم لوگ یہاں دنیا بھر کے ترقی پسندوں کا ایجنڈا طے کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں یا پاکستان کے ترقی پسندوں کا۔

تو دوستو! پاکستان کے ترقی پسندوں کو پاکستان میں ہی کرنے کے کام بہت ہیں۔

They have a world to win.

رہا عالمی امن اور آزادی میں ترقی پسندوں کا کردار تو بی زلیخا تو سوت کی ایک انٹی لے کر یوسف خریدنے نکلی تھی، ہمارا اثاثہ تو اتنا بھی نہیں۔

عالمی امن اور آزادی میں ہمارا کوئی کردار نہیں!

ooo

شہید کون؟

(شہید حسن ناصر کی برسی پر ۲۰۰۸ء۔۱۱۔۱۴ کو پڑھا گیا)

کل بھی اسی جگہ، اسی وقت، کچھ دوست حسن ناصر نامی ایک شہید کی برسی منانے اکٹھے ہوئے تھے۔ آج والے دوست موجود نہ تھے۔ آج بھی ہم شہید حسن ناصر کی یاد میں اکٹھے ہوئے ہیں، مگر کل والے دوست موجود نہیں۔ کیا ہم نے سوشلزم کو مذہب کی سطح پر گرادیا ہے اور سنی سوشلسٹ اور شیعہ سوشلسٹ وجود میں آ گئے ہیں جو دُنیا کے امن کو مزید پارہ پارہ کردیں گے کہ دُنیا بھر میں تمام لڑائیاں سوویت یونین کے انہدام کے بعد مذہب کے نام پر ہو رہی ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔۔۔ میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

ایسے ناداں بھی نہ تھے جان سے گزرنے والے
ناصحو ، پندگرو ، راہ گزر تو دیکھو

ایوب خان کے مارشل لاء میں سندھ کی کمیونسٹ پارٹی کے جوائنٹ سیکرٹری کو قلعہ لاہور میں، کہ سنا ہے کہ ہماری عظمت رفتہ کا نشان ہے، شہید کردیا گیا۔ ایک اور نوآموز کمیونسٹ وکیل، میجر اسحاق نامی، نے حسن ناصر کا مقدمہ لڑا تاکہ شہید کے ماتھے سے خودکشی کا داغ، وہ الزام جو اس کے قاتلوں نے لگایا تھا، دھل جائے کہ انقلابی اپنی جان جدوجہد

میں قربان کرتے ہیں، خودکشی نہیں کرتے۔ وہ اور ہیں جو پیسے لے کر بزعم خویش شہید ہوتے ہیں کہ شوقِ شہادت بہت ہی فراواں ہے۔

ہر بوالہوس نے جنس پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی

یا سادہ الفاظ میں۔۔۔ حبیب بینک میرا بینک، میرا بینک، 'میلا' بھی تو ہے!
ضیاءالحق بھی شہید، بھٹو بھی شہید، ہر دہشت گرد بھی شہید۔۔۔ حسن ناصر کو کس منہ سے شہید کہوں؟

دوستو! شہادت کا تعلق موت سے نہیں۔ مقصد سے ہے۔ میجر اسحاق نے مصلی میں لکھا ہے کہ آج کے شہید صرف کمیونسٹوں میں ہوتے ہیں۔۔۔ ماؤ نے بھی کہا ہے:

'عظیم انسان ڈھونڈنے ہوں
تو عصرِ حاضر سے لو لگاؤ'

اور عصرِ حاضر کا تعلق کیلنڈر سے نہیں مقاصد سے ہے، کہ جان سے گزرنے والے کس مقصد کے لیے موت کے گھاٹ اُترے۔

کیا قبائلی رسومات کی حفاظت کے لیے، عورتوں کو قید کرنے کے لیے، دوسرے مذاہب پر ظلم ڈھانے کے لیے، منشیات کی تجارت کے لیے، علم اور خرد کے دُشمن ہیں، سکول جلانے کے لیے، تہذیب اور ثقافت برباد کرنے کے لیے، مرنے والے شہید ہوا کرتے ہیں؟ انھیں ان کے شہید مبارک ہوں۔ اللہ ان میں اضافہ کرے۔۔۔ حسن ناصر کو شہید کہتے اسی لیے ہچکچاتا ہوں تاکہ کوئی ان پڑھ فرشتہ، انھیں بھی خودکش شہیدوں کی صف میں نہ کھڑا کر دے۔

ہم تو کسانوں اور مزدوروں کے ساتھی ہیں، ان میں سے ہیں، کسان تو اناج کا ایک دانہ بھی ہاتھ سے گر جائے تو اُٹھا کر، پھونک مار کر، منہ میں ڈال لیتا ہے کہ ضائع نہ ہو۔

انسان کی جان کیوں برباد کرے گا؟ عوام کے بیٹے، عوام کے لیے ہی قربان ہوتے ہیں، حوروں اور غلمانوں کے لیے نہیں۔ کسان اور مزدور زندگی کا خالق ہے۔ اس کا محافظ ہے، اس کو پالتا ہے، بڑھاتا ہے۔ تباہ نہیں کرتا۔

بموں، بندوقوں کا شغل سامراجی ایجنٹوں کا ہے۔ بڑھک، للکار، ایٹم بم، خون کی مہک، پیراگیروں کے صنم ہیں، وہ انھیں پوجتے ہیں اور حرام موت مرتے ہیں۔

کھیت کھلیان، زمین، لہلہاتی فصلیں، ہنستے کھیلتے بچے، ناچتے گاتے نوجوان، گدھا ڈالتی بچیاں سکول، کالج، یونیورسٹیاں، لیبارٹریاں، ملیں، فیکٹریاں، ادب، آرٹ، تھیٹر یہ ہیں انسانوں کے ڈیرے اور بسیرے۔۔۔ اُدھر حیوانوں کے نعرے ہیں ہم حیوانیت کرتے رہیں گے، انسانی تہذیب کی بربادی تک، جہالت کی فتح تک، اس وقت کہ جب تک کہ جہالت تمام دُنیا پر چھا نہ جائے۔

ان کا ہاتھ کون روکے گا۔۔۔ ظاہر ہے وہی جو عوام میں سے ہے، عوام کا ہے، طبقاتی طور پر باشعور ہے سیاست اور مذہب کے پیچھے چھپے طبقاتی مفادات کی سمجھ رکھتا ہے۔ حکمران طبقات کے ہذیان کو اہمیت نہیں دیتا بلکہ پسے ہوئے طبقات کے مفادات کا نگہبان ہے جو حسن ناصر کا پیروکار ہے۔

حکمرانوں کی سیاسی اور مذہبی جماعتیں عوام کو دھوکہ دیتی ہیں کبھی مذہب اور فرقے کے نام پر، کبھی علاقے اور وطن کے نام پر کبھی نسل اور برادری کے نام پر۔۔۔

وہ ایک بات جو عوام سے چھپاتے ہیں، وہ ہے طبقاتی تقسیم، طبقاتی مفادات، طبقاتی منافرت جو دوطرفہ ہے۔ حکمران طبقات عوام سے نفرت کرتے ہیں، عوام حکمران طبقات سے۔۔۔ اور طبقاتی جدوجہد۔

اس ایک جدوجہد سے عوام کو روکنے کے لیے، کیا کیا کھلونا جدوجہد عوام کی جھولی میں ڈالی جاتی ہے۔۔۔ اسلام اور کفر کی لڑائی، شیعہ سنی کی لڑائی، مرزائی، غیر مرزائی کی

لڑائی، غریب پاکستان کی غریب ہندوستان سے لڑائی (کس بات پر؟)

اسی طبقاتی نظریے کو راہ نما بنا کر، اسی نظریے پر قائم ایک ٹھکی جڑی پارٹی کی رہنمائی میں جدوجہد ہی عوام کی نجات کی واحد راہ ہے۔ اس نظریے کے لیے، اسی آدرش کے لیے، اسی جدوجہد میں شہید حسن ناصر نے اپنی جان قربان کی۔

اسی جدوجہد کے لیے اپنی اس مقابلتاً خوش حال زندگی کو چھوڑ کر، مزدور بستیوں میں بسیرا کیا، شاہی قلعے کے عقوبت خانے اس کو نگل گئے۔ مگر اس کے نام لیوا، آج بھی اسی لگن کے ساتھ، انقلاب کی راہ پر گامزن ہیں۔

عشق فقیراں دا قائم دائم
کدے نہ تھیسی بیہا۔۔۔

حسن ناصر اپنا آرام سکھ تج کر، اپنا وطن (وہی وطن جس کے لیے ترانے گائے جاتے ہیں۔) چھوڑ کر طبقاتی جدوجہد کے لیے پاکستان آ گیا۔ ان کی والدہ نے میجر اسحاق محمد کو خط لکھا۔

''آپ کی ہمت کی داد دیتی ہوں، میں تو سب سے کہتی ہوں، بچہ میرے نام کا تھا، لیکن وہ آپ لوگوں کا تھا۔''

''ہم پر قربان ہو گیا۔ ہم بھی اس کے نظریے پر کاربند ہونے اور اسی نظریے پر قربان ہونے کے خواہش مند ہیں۔۔۔

اللہ ہم جیسوں کا بھی حامی و ناصر ہو!

OOO

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست

(خالد محمود خاں کی کتاب ''یادِ یارِ مہرباں'' جو انھوں نے اپنے دوست جمیل قاسمی کی یاد میں لکھی ہے، پر ڈاکٹر مقبول اختر کا تبصرہ)

یوسفِ گم گشتہ کے لوٹ آنے کی خواہش انسان کو نہیں چھوڑتی۔ اس آس میں ناقابلِ برداشت غم، حرزِ جاں بن جاتا ہے اور مسلسل دکھ کی ایک دل پذیر کیفیت، وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ جانے والے لوٹ کر نہ آئیں گے۔ خصوصاً وہ جو جاں سے گزر گئے!

ازِ فراقِ بے وصالے الاماں

کوئی کیسے کہے کہ 'غم مخور' غم نہ کر۔ شاید اسی لیے خالد محمود خاں نے حافظ کے شعر سے غم مخور کو غائب کر دیا ہے اور یوسفِ گم گشتہ کے کنعان میں لوٹ آنے کی نوید صفحۂ اول پر دی ہے۔۔۔ دکھوں کی سیاہ کوٹھڑی گلستان بن جائے گی۔۔۔ (اے بسا آرزو کہ خاک شدہ)

خالد نے وہ گلستان اپنے دل میں اگا لیا ہے اور اس کی ایک خوبصورت جھلک ہمیں دکھلائی ہے۔ خالد محمود خاں کا قاسمی جمیل قاسمی۔

درست کہا ہے خالد نے، ہر کسی کا قاسمی ہوتا ہے مگر اسے یاد دلانے کا فریضہ اس نے پورا کیا ہے۔

Tread softly because you tread on my dreams (Meomories)?

یادِ یارِ مہرباں، جو حقیقت میں یادِ یارانِ مہرباں ہے، قصباتی زندگی کی ایک خوبصورت دستاویز ہے۔ قصبات جہاں ابھی تک نارمل پاکستانی بستے ہیں جبکہ دیہاتی مجبور و مقہور ہیں اور شہری بر خود غلط اور نظریاتی طور پر کج رو، نعرے باز۔

قصبات کی زندگی بھرپور ہے، رنگا رنگ ہے پیار، محبت، یار باشی ابھی زندہ ہے۔ اساتذہ، تعلّم میں جان مارتے ہیں، نمود و نمائش سے بے نیاز۔

خالد نے اپنے دوستوں کا ایک گل دستہ پیش کیا ہے، وہ جو قاسمی کے دوست تھے اور قاسمی ان کا دوست تھا۔ میں بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جسے زندگی بھر بہت پیارے پیارے دوست ملے، خالد کے بیان کردہ ایک واقعے کی تضمین ہو سکتی ہے۔ مگر میں یہ جسارت نہیں کروں گا۔ ہاں یہ ہے کہ اس حوالے سے زیرِ نظر تحریر کی حقانیت پر یقین آ جاتا ہے۔ 'کہانی کاری' بہت کم ہے۔ البتہ خالد محمود خاں کی تحریر کی دل کشی موجود ہے۔ جو اس کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔ سکول کے بعد یہ ترکیب اب استعمال کی ہے۔ شاید صحیح ہو، دراصل یہ کتاب اپنے ساتھ بہا کر لے گئی تھی۔ عمر جو بیت چکی

All that is beautiful drifts like the waters.

000

اہلِ صفا کا رستہ

محمود شاہ ایک شاعر کا حساس دِل رکھتا ہے۔ وہ ظلم کو دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا اُس کی رگِ جاں کا ریشہ ریشہ اس ظلم کے خلاف صورِ اسرافیل کی شدت سے چلا اُٹھتا ہے۔

27 دسمبر کے سانحہ عظیم نے اُس کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔۔۔ وہ ایک سوچنے والا شاعر ہے اس دُکھ کو سمجھنے کی ذہنی کوشش بھی کرتا ہے اُس کی طبقاتی سوچ جو کہ معاشرتی اور تاریخی حقائق کو سمجھنے کی اعلیٰ ترین کسوٹی ہے۔ وہ بھٹو باپ بیٹی کی عظیم ترین قربانیوں پر حیران ہے کہ ان کا طبقاتی کردار تو یہ نہیں۔

یہ سوچ جہاں معاشرے کی اُلجھنوں کو سلجھانے کے لیے تمام انسانی سوچوں کی معراج ہے، اشخاص کو سمجھنے میں بعض اوقات عاجز نظر آتی ہے۔ یہ تو ان کا طبقاتی کردار نہیں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر اپنی جان قربان کر دینا۔ یہ تو اس طبقے کا شیوہ نہیں۔ یہ تو اہلِ صفا کا شیوہ ہے جن کی مثالیں بیسویں صدی کے انقلابیوں میں ملتی ہیں۔ جذباتی طور پر اپنے جیسے مظلوموں کو مارنے اور خود مر جانے والے اشخاص تو اس بلندی کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو تاریخ کے حسن ناصروں کا حصہ ہے۔

دراصل ایک انسان کے ذاتی کردار کو سمجھنے کے لیے اس کے مقاصد، اس کی ذات، اس کی ذہنی سطح اور اُس کی نظریاتی سمت کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔۔۔ بے نظیر کے خون کے دھبوں کو فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے پانی سے دھونے والے شاید طبقاتی طور پر عوام کی صفوں سے آئے ہوں مگر ابدالآباد تک اپنے لیے لعنت کما گئے ہیں۔

میرے خیال میں جب تک ہم کسی کتاب کا آخری باب نہیں پڑھ لیتے ہماری رائے اُس کتاب کے بارے میں نہ صرف نامکمل، بلکہ ناقص بھی ہوتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر کی ذات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی جب اُن کی زندگی کے آخری سال کو مدِنظر نہ رکھا جائے۔

سقراط کی بڑائی صرف اُس کے فلسفے میں نہیں وہ بہت بڑا اُس استقامت کی بنا پر ہے جو اُس نے موت کی دہلیز پر دکھائی۔ ہنس کر موت کو قبول کیا مگر اپنی سوچ میں ترمیم و تنسیخ کا خیال بھی قریب سے نہیں گزرنے دیا، ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے آخری وقت ظالموں سے مصالحت کی بھیک نہیں مانگی، اُس نے داڑھی مونڈنے کا سامان مانگا تا کہ اُسی بانکپن سے موت کو گلے لگائے جس بہادری اور بانکپن سے وہ جیا۔

بے نظیر نے ظالموں کے قلعے میں انھیں للکارا، ہنس کر اور مسکرا کر قوم کو بھلے وقتوں کی نوید سنائی یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت اُس کی گھات میں ہے رجائیت کا دامن نہ چھوڑا۔ گرے ہوئے، پسے ہوئے لوگوں کی ہمت بڑھائی اور۔۔۔ اَمر ہو گئی۔

مثالِ سر چلا کر ہو گئی ہے سرخرو تو پھر
یہاں پہ جو بھی ہونا تھا
تجھے معلوم تھا بی بی
تجھے معلوم تھا بی بی
اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب

بے نظیر کی شہادت کی شام جس زندہ پاکستانی نے دیکھی وہ عمر بھر اسے نہ بھلا پائے گا۔

تو شام اُس شام ایسے اُتری کہ ایک محشر اُٹھا دیا ہے۔ وہ شام اور شام کے بعد کے تین چار روز سولہ کروڑ عوام کی کیفیت کا بیان کوئی کیسے کرے۔ ایک صدمہ جانکاہ سے مفلوج قوم۔

دماغ جل رہے تھے دِل جل رہے تھے۔ خاموشی اور سکوت ایسا کہ دِل دہل جائیں۔ صدمہ جاں کاہ تھا، غصے کو کوئی راہ نہ تھا، ورنہ یہ دھرتی اُس روز جل جاتی بھسم ہوتی

یہ کیسی رُت ہے
کوئی تو بولے
کوئی تو دھڑکے
کوئی تو بھڑکے

تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے، انقلاب سب سے پہلے اپنے بچوں کو کھاتا ہے۔ پاکستان ایک بہت تبدیلی کی دہلیز پر کھڑا ہے مگر بے نظیر کی قربانی لے گیا ہے۔

فیض صاحب نے میجر اسحاق کے لیے کہا تھا:

ہم سمجھے تھے صیاد کا ترکش ہوا خالی
باقی تھا مگر اس میں ابھی تیر قضا اور
ابھی طویل سفر باقی ہے

سورج ڈوب چلا ناصر
اور ابھی منزل ہے دُور

سوائے انقلابی رجائیت کے اور کوئی نسخہ بروئے کار نہیں آئے گا۔ وقت ہے کہ اپنے غم کی شدت کو انقلابی قوت میں ڈھالا جائے۔

کاروانِ حیات لے کر نکل پڑی وہ
وہ عشق منزل کا رستہ ہے
وہ راستہ جو وفا کا رستہ
وہ زندگی کی بقا کا رستہ
جو رستہ اہلِ صفا کا رستہ

میں بیمار تھا، مجھے اطلاع ملی کہ محمود شاہ ایک مسودہ چھوڑ گیا ہے اُس سے رابطے کی کوشش کی۔ پتہ چلا ہسپتال میں ہے دِل کے دورے کے ساتھ، مجھے حیرانی نہ ہوئی۔ ایسی نظمیں لکھ کر اور کہاں جاتا۔

محمود شاہ نے اپنی جاں نکال کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دی ہے۔۔۔

OOO

پاکستان میں قومی تشخص کا بحران

تشخص کے ضمن میں سب سے پہلی بات ہوگی نام کی اور نام تو ہمارا اچھا خاصا موجود ہے۔۔۔ پاکستان۔۔۔ مگر پاکستان ہے کیا ہم کون ہیں؟ ہمارا ماضی کیا تھا؟ ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟ ہم کیا تھے؟ کیا بن گئے ہیں؟ کیا بننا چاہتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر کسی کو پریشان کررہے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب ہمیں دینا ہی ہوگا کہ بقول ایلیٹ ''خاتمہ کہیں نہیں ہے، صرف اضافہ ہے، مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو۔'' پہچان کے اسی آزار کو بلھے شاہ نے یوں کہا ہے ''بلھیا کی جاناں میں کون؟'' اور بلھے شاہ کا یہ کرب جو ہمہ جہت ہے ہمارا بھی کرب ہے اس کا ایک ہمہ جہت جواب ہی ہمارا تشخص ہوسکتا ہے اور یہ تشخص تاریخی، جغرافیائی، سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی ہوگا۔ اس بارے میں بہت تحقیق، تلاش اور جانچ پڑتال کی ضرورت ہے اور یہ ہمیں خود ہی کرنا ہوگی کیوں کہ اب تو ہماری قومی اسمبلی بھی یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ آسمانوں سے ہدایات آنا بند ہو چکی ہیں۔۔۔ مگر ہم نے ابھی تک تحقیق کی عادت نہیں اپنائی۔۔۔ یعنی بجلی بند ہو چکی ہے اور ایمرجنسی جنریٹر بھی کام نہیں کرتا۔۔۔ یہ ہمارے تشخص کے بحران کا ایک بڑا سبب ہے!

اس بحران کے حل کے سلسلے میں تحقیق کے بارے میں ماؤ کہتا ہے:

> ''تحقیق حمل کے طویل دنوں کی طرح ہوتی ہے اور کسی مسئلے کا حل ولادت کے دن کی طرح ہوتا ہے۔ دراصل کسی مسئلے کی تحقیق کرنا اس کو حل کرنا ہوتا ہے۔''

ایک قوم کی تعمیر و ترقی میں تشخص کی اہمیت وہی ہے جو ایک عمارت کی تعمیر میں بلیو پرنٹ کی۔ تشخص چونکہ زندگی کے سبھی پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس لیے اس کے سبھی پہلوؤں پر تحقیق و جستجو کے بعد جو جواب مرتب ہوگا، وہ بہت پہلودار اور بسیط ہوگا۔ امرت دھارا قسم کے فلسفے کام نہیں آتے، اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ مسلمان کون سا کلمہ پڑھتے ہیں تو میرا جواب ہوگا لا الله الا اللّٰہ۔۔۔ اور شاید ہی کوئی اس سے اختلاف کرے، مگر جب میں یہ پوچھوں کہ پاکستان کا جغرافیہ کیا ہے؟ یا پاکستان کا حدود اربعہ کیا ہے؟ پاکستان کی تاریخ کیا ہے؟ پاکستانی ثقافت کیا ہے؟ پاکستان کی زبانیں کون سی ہیں؟ پاکستان میں کون سی نسلیں آباد ہیں؟ (اور یہ نسلیں اُداس کیوں ہیں؟) پاکستان کا معاشی ڈھانچہ اور معاشرتی نظام کون سا ہے؟ یعنی پاکستان کا مطلب کیا ہے؟۔۔۔ اور آپ جواب دیں لا الله الا اللّٰہ۔۔۔ تو اس سے ممکن ہے کہ آپ کو اُردو اخبار میں انگریزی لکھنے کی نوکری مل جائے مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملے گا! کیا میں اس سے یہ سمجھوں کہ جس ملک کے جھنڈے پر لا الله الا اللّٰہ لکھا ہے وہ پاکستان کا پانچواں صوبہ ہے یا یہ سمجھوں کہ ہر کلمہ گو کو پاکستانی پاسپورٹ کے لیے درخواست دینی چاہیے یا یہ سمجھوں کہ واہگہ کے اِس پار لا الله الا اللّٰہ پڑھنے والے پاکستانی ہیں اور واہگہ کے اِس پار رہنے والے غیر مسلم پاکستانی نہیں ہیں۔ کیا پاکستان کے شہری حقوق رکھنے والے یہ لوگ، جو دنیا کے کسی بھی قانون اور ضابطۂ اخلاق کے مطابق پاکستانی شہری ہیں صرف اس لیے پاکستانی نہیں کہ وہ لا الله الا اللّٰہ نہیں پڑھتے۔۔۔ یہ غیر منطقی سوچ اور عصبیت بھی سبب ہے، تشخص کے بحران کا۔ کیا یہ لوگ قائداعظم کے سبھی ارشادات بھول گئے ہیں میں

ان میں سے چند ایک دہراتا ہوں۔

"تم میں سے ہر ایک، خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔
خواہ کوئی سا رنگ، ذات یا عقیدہ رکھتا ہو، اولاً ثانیاً اور بدرجہ آخر اس مملکت
کا شہری ہے۔ برابر حقوق اور برابر مراعات کے ساتھ۔"

(محمد علی جناح کی تقریریں اور تحریریں حصہ دوم، ص ۴۰۲)

"آپ کسی مذہب، ذات یا عقیدے سے تعلق رکھیں۔ اس کا
کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ
ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلم مسلم نہیں رہیں گے۔۔۔ سیاسی معنی میں
"مملکت کے شہریوں کے طور پر۔"

قائداعظم کے رد میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی فرماتے ہیں:

"اگر عرب، ترک اور ایرانی خدانخواستہ اسلام چھوڑ دیں تو
عرب عرب رہیں گے، ترک ترک رہیں گے، ایرانی ایرانی رہیں گے مگر
ہم کچھ نہ رہیں گے۔"

(محمد علی جناح کی تقریریں اور تحریریں حصہ دوم، ص ۴۰۳)

مائی ڈیئر ڈاکٹر قریشی! ہم وہی رہیں گے جو ہم ہیں، اس سلسلے میں چند اسناد پیش کرتا ہوں کہ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر! ڈاکٹر بی اے امید کرنے کہا ہے:

"پاکستان کے خیال میں کوئی نئی یا اچانک چیز نہیں ہے۔
صرف یہی ہوا ہے کہ جواب تک بالواسطہ تھا، اب بیّن ہے۔ پوری چمک
کے ساتھ اور جواب تک بے نام تھا۔ ایک نام اختیار کر چکا ہے۔"

احمد عبداللہ کہتا ہے:

"قراقرم سے بحیرہ عرب اور ستلج سے کوہ ہندوکش تک ایک
قطعۂ زمین، اپنی تاریخ، اپنا کلچر، ایک سی آبادی بلا چھوت چھات، سماجی
نظام، بہت سی تہذیبوں کا دیس، آمری نال، ہڑپہ، گندھارا، ٹیکسلا وغیرہ۔۔۔

ہندوستان کی اس علاقے پر حکومت استثناء ہے۔ پاکستان کا قیام کوئی نئی
بات نہیں بلکہ اصل کی طرف رجوع ہے۔"

اور اسی سلسلے میں وہیلر نے اپنی کتاب "پاکستان کے پانچ ہزار سال" میں لکھا ہے:

"اس کتاب کے عنوان میں جان بوجھ کر تضاد پیدا کیا گیا ہے،
مگر اس میں ایک بنیادی سچائی موجود ہے۔ پاکستان ایک نئی اسلامی مملکت
ہے مگر اپنے قدیم ہمسایوں کی طرح یہ بھی تاریخی عوامل کی پیداوار ہے جن
میں سے اسلام سب سے بعد کا عمل ہے۔"

قوم کا تصور ایک سیاسی تصور ہے اور سرمایہ داری دور کی پیداوار ہے۔ جب کہ ایک مشترکہ منڈی کو دوسروں کے مقابلے میں تحفظ دینے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس معنی میں ایشیاء اور افریقہ کی کئی مملکتوں میں ابھی تک قوموں کا ظہور نہیں ہوا (روپرٹ ایمرسن) محض امید پیدا ہوئی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ امید قوم ہے۔ پاکستان میں یہ عمل بہت تیزی سے جاری ہے۔ پاکستان بننے کے بعد شہروں کا پھیلاؤ، نئے شہروں کا قیام، آبادی کا رزق کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا، معیشت، صنعت اور ثقافت کی ترقی، یہ سبھی عوامل مل کر ایک قوم کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ٹرانسسٹر ریڈیو اور قومی سطح پر چھپنے والے اخبارات ورسائل نہ چاہتے ہوئے بھی اس عمل کو اور تیز کر رہے ہیں۔ ایک جیسی مصنوعات بھی علاقائی فرق کو کم سے کم کرتی ہیں۔ خیبر سے کراچی تک آپ کی تنہائی کی ساتھی، آپ کی سگریٹ کے ٹو ہے اور جب آپ کو چائے کی ضرورت ہو تو لپٹن عمدہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سرمایہ دار طبقے کی اپنی ایک مشترکہ تہذیب، بمقابلہ عوام وجود میں آ رہی ہے۔ جو پی آئی اے، انٹر کانٹیننٹل ہوٹلوں، ریل کے ایئر کنڈیشنڈ ڈبوں، اُن کی ہاؤسنگ سوسائٹیوں اور اُن کی سیاسی جماعت میں نظر آتی ہے۔ ہے وہ بھی خیبر سے کراچی تک ایک ہی تہذیب، خیر! یہ دوسرا مسئلہ ہے۔ ہر طبقاتی سماج میں دو تہذیبیں ساتھ ہی ساتھ چلتی ہیں۔ ایک حکمرانوں کی تہذیب وثقافت، دوسری عوام کی۔ اس فرق سے آنکھیں چرانا بھی تشخص کے بحران کا ایک سبب ہے۔

اس سرمایہ دارانہ دور کے تصورِ قوم سے قدیم تر تصور اس اجتماع کا ہے جس کو آج کی اصطلاح میں قومیت کہتے ہیں۔ یہ اجتماع اس وقت وجود میں آیا جب ایک یا ایک سے زیادہ قبیلے ایک قطع زمین سے متعلق ہوئے اور مشترکہ حکومت کے تحت آ گئے، یا یوں کہیں کہ جاگیرداری دور میں۔ اس سے بھی پچھلے دور یعنی غلام داری سماج میں جب ذرائع پیداوار اس قدر ترقی کر گئے کہ شہروں کا قیام ممکن ہوا تو لوگوں کی خانہ بدوشی ختم ہوئی۔ اب وہ ایک علاقے سے متعلق ہو گئے جس کے نتیجے میں تہذیب پیدا ہوئی۔ Civis شہر کو کہتے ہیں اور Civilization اسی سے متعلق ہے۔ ایک جگہ رہائش سے مشترکہ زبان اور مشترکہ تہذیب پیدا ہوئی اور لوگوں کا طریقِ حیات ایک سا ہو گیا۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد اسی دور میں پڑ گئی تھی۔ خواہ وہ چینی تہذیب ہو، یونانی تہذیب ہو، مصری تہذیب ہو یا ہڑپائی تہذیب۔ موخر الذکر Proto-indus یا دریائے سندھ سے متعلق تہذیب اور قومیت بھی کہتے ہیں۔

آج کی عرب تہذیب و ثقافت کی بنیادیں اسلام کے آنے سے پہلے ہی استوار ہو چکی تھیں۔ بعد میں ہونے والی سیاسی اور مذہبی تبدیلیوں کے باوجود کوئی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ آج کی عرب تہذیب تو عرب تہذیب ہے مگر اسلام سے قبل کی تہذیب عرب تہذیب نہ تھی۔ یہ تہذیبی تسلسل دنیا بھر کے عالموں کو نظر آتا ہے، مگر ہمارے عالم اس تسلسل سے انکاری ہیں۔ یہ شپرہ چشمی بھی تشخص کے بحران کا ایک سبب ہے۔ ظاہر ہے اس میں چشمۂ آفتاب کا کیا گناہ۔

گذشتہ دنوں زرعی یونیورسٹی لائل پور میں ایک سائنس کانفرنس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں آثارِ قدیمہ کے ایک ممتاز ماہر فضل احمد صاحب نے ایک نہایت عمدہ مضمون ہڑپہ تہذیب پر پڑھا۔ تاریخی شواہد پیش کیے، سلائیڈیں دکھائیں اور یہ ثابت کیا کہ ہماری آج کی تہذیب کی بنیادیں ہڑپہ اور موہنجوڈارو میں رکھی جا چکی تھیں۔ تمام ثقافتی مظاہر یعنی عمارات، لباس، سامانِ آرائش وغیرہ میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں جو آج سے ملتی جلتی شکل میں اس وقت موجود نہ تھی۔ سرمہ، کاجل، سرمے دانی، ہار کنگن، سبھی کچھ تو تھا حتیٰ کہ پیپل کا پتہ بھی کیونکہ پیپل

کی دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ آج کل ٹرکوں اور موٹروں کی پیشانی پر پیپل کا پتہ بنا کر اس پر یا اللہ، محمد لکھا ہوتا ہے۔ ہمارے ایک مرحوم فاضل اس مضمون پر تبصرہ کرنے اُٹھے، فرمایا: اچھا مضمون ہے، بہت اچھی ریسرچ ہے اور بہت ہی زیادہ عرق ریزی کی ہے مگر۔۔۔ مگر یہ تہذیب ہماری تہذیب نہیں ہے۔ زندہ باد سائنس کانفرنس اور زندہ باد سائنس، سائنس یونہی شواہد سے نتائج اخذ کرتی ہے! یہ اُلٹ بازی اس لیے تھی کہ وہ صاحب بدقسمتی (ہماری) سے اُردو بولنے والے علاقے سے مہاجر تھے اور اُس دھرتی سے، جس نے انہیں پناہ دی تھی، گھر دیا تھا، اپنا رشتہ جوڑنے کو تیار نہ تھے۔

جب حقیقت روایات میں کھو جائے تو اُمتیں ایسے ہی خرافات میں کھو جاتی ہیں۔ انہیں خرافات میں سے ایک برصغیر کا آریائی تشخص ہے۔ جو انگریز کی حکمرانی کا جواز مہیا کرنے کے لیے گھڑا گیا تھا کہ یہ وحشی قبائل کا ملک تھا دھات اور پتھر کے زمانے کے فوراً بعد آریا تشریف لے آئے اور اپنے جلو میں تہذیب ثقافت زبان خدا جانے کیا کچھ لائے اور اصل بات تو یہ کہ ایک ہندوستان کا تصور لائے۔ ان خدا کے بندوں سے کون پوچھے کہ بھائی! تاریخ کے کس دور میں ہندوستان ایک وحدت رہا ہے۔ مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان ایک ملک ہے۔ آریائی اس میں برتر تہذیب سمیت آئے تھے اور ہم انگریز بھی پانچوں سواروں میں ہیں یعنی آریائی ہیں۔ اگر ہم تم پر حکومت کر رہے ہیں تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ہونا چاہیے۔ یہ وہی سامراجی منطق تھی جو آج کل بابا غفور وف کو تنگ کر رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ آریاؤں نے ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی عظیم تہذیب کو تاراج نہیں کیا تھا۔ وہ تو پُرامن آبادکار تھے جو یہاں آباد ہو کر انسانیت پر احسان کر رہے تھے اور آج اُن کے پڑپوتے وسط ایشیائی یہی احسان دہرانے کی فکر میں دُبلے ہو رہے ہیں کہ یہ گرم پانی کی بندرگاہیں آدمی کو انسانیت کی خدمت پر اُکساتی ہیں۔

انہی خرافات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی ہندوستان میں

حکمران رہے ہیں اور یہ کہ ہم اُن حکمرانوں کی اولاد ہیں۔ P.Herdy نے اپنی کتاب برطانوی ہند کے مسلمان The Muslims of British India میں لکھا ہے۔

''گنگا جمنا دوآب میں مسلمانوں کی آبادی کی تعداد اور تقسیم۔۔۔
اس علاقے میں مسلمانوں کے اقتدار کے عرصے اور طاقت سے نسبت معکوس رکھتی ہے۔۔۔ دِلّی پر قبضے کے سات سو سال بعد۔۔۔ مسلمان صرف ۱۳ فیصد تھے۔۔۔ مسلمانوں کی صرف ایک حقیر اقلیت اپنے لیے یا اپنے آباء کے لیے ''حکمران قوم'' کے فرد ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔۔۔
اس علاقے کے پڑھے لکھے لوگوں کے بیرونی آباء اور حکمرانی کے دعوے کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت کسانوں، دست کاروں اور درباروں کے خدمت گزاروں مثلاً سازندوں، بھانڈوں، عطر فروشوں اور طوائفوں پر مشتمل ہے۔۔۔ راجپوت نسل کے کاشت کار مثلاً ملکانے، خانزادے اور لال خانے اور ماہر دستکار مثلاً جلاہے، کپڑا چھاپنے والے اور انگریز تعداد میں اُن لوگوں سے بہت زیادہ ہیں جو اپنے آپ کو سید، پٹھان، مغل یا شیخ کہہ کر بیرونی نسل کا یا حکمرانی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔۔۔ پنجاب میں ایسے بہروپ اور بھی کم ہیں۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہزار میں سے صرف مسلمان باہر والے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

یہ رہی حکمران قوم کے دعوے کی حقیقت اور یہ بھی ایک سبب ہے تشخص کے بحران کا۔ یار لوگ حکمران کہلانے کے شوق میں اپنے آباؤ اجداد سے منکر ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں کی ایک جماعت تو باقاعدہ بیرونی یا بدیسی نظریات اور دیسی اجداد کے خلاف جہاد کرتی رہتی ہے۔ یہ اور بات کہ اس کے اپنے ممبران بھی اپنے باپ کا نام لیتے ہیں اور اپنے امیر کو اپنا باپ نہیں کہتے کہ ہر شخص کا اپنا باپ ہوتا ہے۔۔۔ یا ہونا چاہیے۔ اپنے باپ کو باپ کہنا تنگ نظری صوبائی عصبیت یا شاؤنزم نہیں ہے۔ باپ سانجھے ہونے سے تو رہے۔ پنجابی

باپ، دادا، پردادا اور لکڑ دادا رکھنے والا اپنے آپ کو پنجابی کیوں نہ کہے۔ ایک سندھی سندھی کیوں نہ کہلائے اور ایک پشتون اپنے پشتون ہونے پر فخر کیوں نہ کرے؟ ایک بلوچ بلوچی ہونے پر کیوں گردن تان کر نہ چلے؟ ہم جو آج اس خطۂ زمین پاکستان میں رہتے ہیں ان لوگوں کو اپنے آباؤ اجداد کیوں نہ کہیں جو درحقیقت ہمارے آباؤ اجداد ہیں، وہ جو لاکھوں سال اس دھرتی میں آباد رہے اور یہیں دفن ہوئے۔ ہم بھی اسی دھرتی سے اُگے ہیں اور ہم سے میری مراد اس ملک کی ننانوے فیصد آبادی ہے۔ ہم کسی طوس یا گیلان، دِلّی یا لکھنؤ، حجاز یا شام میں پیدا نہیں ہوئے۔ ہم عربوں یا ہندوستانیوں کو اپنا باپ کیوں بنائیں یا بتائیں۔

یہ بھی ہمارا تشخص ہے!

پہچان کا ایک منفی طریقہ بھی ہے۔ جس کی مثال یوں ہے کہ مشہور تاریخ دان الاستخاری نے خوریا زبان کے بارے میں کہا لیس عبرانی ولا سریانی ولا فارسی یعنی یہ زبان نہ عبرانی ہے، نہ سریانی اور نہ فارسی، اسی طرز پر ہمارا تشخص یوں ہوگا۔

ہم نہ تو ہندی ہیں، نہ عربی ہیں اور نہ وسط ایشیائی

اس سلسلے میں پروفیسر احمد حسن دانی کا کہنا یہ ہے کہ یہ سوال ہی غلط ہے کہ ہمارا تعلق گنگا کی تہذیب سے ہے یا وسط ایشیائی تہذیب سے، ہماری اپنی تہذیب ہے جو اُن دونوں تہذیبوں سے مختلف ہے۔

ہم پاکستانی ہیں مگر پاکستان ہے کیا، لوگ خصوصاً نئی نسل کے نئے لوگ یہ جاننا چاہیں گے۔ دنیا میں ہر چیز زبان و مکان کے حوالے سے ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ پاکستان کا جغرافیہ اس سلسلے میں پہلی چیز ہے جس پر ہمیں توجہ کرنی ہوگی۔ ہمارا جغرافیہ وہ کیوں ہے جو آج ہے۔ اس سے مختلف کیوں نہیں؟ ہماری مشرقی سرحد لاہور سے سولہ میل پر کیوں رُک جاتی ہے۔ دِلّی اس میں شامل کیوں نہیں کہ ہم بلاواسطہ ''دِلّی دربار دیکھو'' کا لطف اٹھا سکیں۔ وہیلر

اس سلسلے میں یہ کہتا ہے:

''اس کی قدرتی سرحدیں ہیں۔ جنوب مغرب میں بحیرہ عرب۔ کوہ ہمالیہ اور بلوچستان کے پہاڑ شمال مغرب میں۔ جنوب مشرق میں تھریا صحرا۔ صرف مشرق میں ہمالیہ اور صحرا کے درمیان ایک دو سو میل کی زرخیز پٹی ہے جہاں بھارت کے میدان مغربی پاکستان کے ساتھ بغیر رکاوٹ کے ملتے ہیں۔ صرف یہیں حدیں متعین نہیں ہیں۔ جغرافیائی معنی میں اور صرف یہیں آدمی اپنی تقدیر کا مالک ہے ورنہ مغربی پاکستان کو ایک مکمل وحدت کے رُوپ میں نہ صرف انسان نے بلکہ قدرت نے ڈھالا ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی سندھ کا دریائی نظام ہے۔''

اپنا جغرافیہ جاننا بہت اہم ہے کہ کبرال کا کہنا یہ ہے کہ ''تم چاول کو ہنڈیا سے باہر نہیں پکا سکتے'' اس لیے ہم اپنے تمام دعویٰ ہائے حب الوطنی کے باوجود محبِّ وطن نہیں ہو سکتے جب تک ہمیں اس دھرتی سے اس زمین سے پیار نہ ہو شاہ ولی اللہ نے کہا تھا ''آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے محبت کرتا ہے'' اور جس چیز کو آپ جانتے ہی نہیں اس سے محبت کیا معنی؟

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی کا یہ کہنا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں گنگا کی وادی اس کا قلب یا Heartland ہے اور باقی علاقے Rimland یا اردگرد کے علاقے اور ہارٹ لینڈ اور رم لینڈ کا تو ہمیشہ سے جھگڑا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ تقسیم طبعی اور جغرافیائی ہے۔

''جہاں تھر ختم ہوتا ہے براعظمی تقسیم شروع ہو جاتی ہے جو مشتمل ہے دو موسمی نظاموں کی حدود پر اور مغربی پاکستان کے شمالاً جنوباً بہنے والے دریائی نظام کو بھارت کے غرباً شرقاً دریائی نظام سے جدا کرتی ہے۔''

پروفیسر فاطمی کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ نئی دریافت نہیں ہے بلکہ ویدوں کے بعد کی مذہبی کتابوں میں موجود ہے۔ وشنو پران میں بھارت کی حدود یوں بیان کی گئی ہیں۔

''وہ ملک جو سمندر کے شمال اور برفیلے پہاڑوں کے جنوب میں ہے بھارت کہلاتا ہے'' اور سیاسی جغرافیائی حدود کا بیان یوں ہے۔

''بھارت کے مشرق میں کراتا یعنی جنگلی رہتے ہیں مغرب میں یوانا (یعنی باہر کے یونانی) مرکز میں رہتے ہیں۔ برہمن کشتری ویش اور شودر''

جغرافیے کے مطالعے سے جو چیز کھل کر سامنے آتی ہے وہ پاکستان کی قدرتی وحدت ہے کہ یہ دریائے سندھ کا طاس ہے۔ دریائی آمد و رفت قدیم زمانہ سے ہو رہی ہے۔ جب آبادی بھی زیادہ تر دریاؤں کے کنارے ہوتی تھی۔ اسی طرح سبھی علاقائی زبانوں کا تانا بانا اس زبان سے بنا ہے جس کو ہم دریائے سندھ کی زبان کہہ سکتے ہیں اور جس نے مختلف روپ ہیں۔ جٹکی سرائیکی ملتانی سندھی وغیرہ۔ یہ زبان شمال سے جنوب تک ایک ہزار میل میں بہت حد تک مشترک ہے۔ یہ خطہ زمین نیم صحرائی ہے۔ نہروں کے بغیر کاشت ممکن نہیں۔ بند ایک علاقے میں بندھ سکتے ہیں پانی کا استعمال دوسرے علاقے میں ہوتا ہے۔ تعاون ہماری مجبوری ہے۔ اجتماعی کام نہ ہوگا تو اجتماعی بے گار لازمی ہوگی۔

سرحد کشمیر اور شمالی بلوچستان کی وادیاں پنجاب میں کھلتی ہیں۔ جنوبی بلوچستان اور سندھ میں گہرا تعلق ہے۔ پنجاب اور سندھ کا رابطہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا دریائے سندھ سڑکوں اور ریلوں کا جال ہے۔ ایک علاقے کی معیشت کا انحصار دوسرے پر ہے۔ غرض ایک مشترکہ تہذیب ایک مشترکہ علاقے میں پروان چڑھتی ہے۔ مغرب سے بے شمار لوگ یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ دراوڑ، آریا، ایرانی، یونانی، ساکا، کشان، ہن، ترک، تاتار، مغل، درانی وغیرہ جن کی وجہ سے ذاتوں کا ایسا امتزاج ہوا ہے کہ شکلوں کا امتیاز مشکل ہے۔ آپ شکل دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سندھی ہے یا پنجابی یا پشتون، ذاتوں کے نام بھی ملتے جلتے ہیں مثلاً وڑائچ بھروچ، باجوہ باجوات، جٹ اور زط وغیرہ لوگوں کے لباس اور خوراک ملتے جلتے ہیں۔ شمال مغرب کے تو درّے سال بسال نئے لوگ لا کر شامل کرتے رہے ہیں کہ پندرھویں صدی سے قبل ساری دنیا کی تاریخ میں یہ ہوا ہے کہ بے آباد علاقوں کے لوگ

آباد علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ خصوصاً وسط ایشیا اور جزیرہ نمائے عرب کے لوگ، یہ اُن کی اقتصادی مجبوری تھی اور تاریخی جبر تھا۔ اُن کے پاس اُس زمانہ کا بہترین جنگی ہتھیار گھوڑا بھی موجود تھا پندرھویں صدی کے بعد جب انسانی علم اور تکنیک میں ترقی ہوئی تو انسان نے غیر آباد علاقوں کو آباد کرنا شروع کیا اور گھوڑے کا توڑ بھی بندوق کی شکل میں دریافت کر لیا تو ہمارے ملک پر حملہ آوروں کی یہ شمال مغربی بارش رُکی۔ اب یورپی قومیں سمندر کی راہ آ کر ہندوستان پر قابض ہونا شروع ہو گئیں جس کا انجام ۱۸۴۹ء میں ہوا جب انگریزوں نے اپنی بنگال آرمی کی مدد سے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اس فوج میں زیادہ تر لوربیے شامل تھے۔ جس کا بدلہ پنجابیوں نے آٹھ سال بعد لیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجابیوں، سندھیوں یا پشتونوں نے انگریز کے لیے ہندوستان کا کوئی علاقہ فتح نہیں کیا۔ ہاں انگریز نے ہندوستان سے فوج بھرتی کر کے پاکستان کو فتح کیا تھا۔ تاریخ کا بہاؤ انگریز کے حق میں تھا اس لیے وہ کامیاب ہوا ورنہ اس علاقے میں انگریز کی شدید مزاحمت ہوئی۔ یہ بھی ہمارا تشخص ہے اور تشخص کا بحران اس لیے ہے کہ ہماری تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔ ہم نے تو ہمیشہ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ہے وہ سندھ کا بانکا جرنیل ہوشو تھا جس نے کہا تھا مرمر دیسوں سندھ نہ ڈیسوں۔ ہماری روزی دِلّی دربار سے بندھی ہوئی نہ تھی اس لیے ہمیں شمال سے آنے والے شاہانِ اسلام کا انتظار نہیں رہا۔ دلی کے سلطانوں کے خلاف بھی اس علاقے میں بغاوتیں ہوتی رہی ہیں۔ بابر آیا تو بابا نانک نے کہا ''پاپ دی جنج لے کابلو دھایا جوری منگے دان دے لالو'' اکبر نے فرید کی کھال کھچوائی تو اس کا بیٹا دُلا بھٹی للکارا ''میں ڈھاواں دلی دے کنگرے۔ دیوان شکر دانگوں بھور'' اورنگ زیب کا مقابلہ ہوا تو پنجاب میں کھوپڑیوں کے مینار بنے اور خوشحال خاں خٹک نے کہا:

آؤ دیکھو اس زمانے میں
میں ہی تو ہوں وہ اک جواں ہمت
جس نے اورنگزیب کے دل کو
زخم آلود و داغدار کیا

اورنگ زیب کے دل کو زخم آلود و داغدار کرنے کی اس مسرت کے خاصے کی چیز وہ

سندھی کہاوت ہے جو دِلّی کے تعلق بادشاہوں کے متعلق ہے۔ جب انہوں نے سندھ پر حملہ کیا۔ ایک تو مارا گیا دوسرا بھاگ گیا۔ سندھیوں نے کہا:

اک مویا اک نٹھا برکت شیخ پٹھا

بلوچستان کے عوام کے بارے میں ایک عرب لکھاری نے لکھا تھا ''جان الکثیر بہا جائع وان قلیل بہا عبود'' کہ ان میں اکثر بھوکے تو ہیں غلام فطرت نہیں۔ غرض ہندوستان پر حکمرانی کے قصے سنانے والوں میں ہم شامل نہیں۔ ہم تو تب بھی لٹتے رہے ہیں مگر لڑتے رہے ہیں۔ نادر شاہ نے حملہ کیا یا بقول وارث شاہ نادر شاہ پنجاب فتور پائے تو اس کا مقابلہ کیا۔

آیا نادر ڈھے پئی چادر
بابل نیویں دھون کرے
گلیاں دے ککھ رون کرے

بابل کی نیچی گردن کا تصور کرنے کے لیے پنجابی ہونا ضروری نہیں۔ اس کے بعد احمد شاہ دُرانی عرف ابدالی عرف شاہ اسلام نے پنجاب کو بار بار لوٹا اور اتنا لوٹا کہ بلھے شاہ نے کہا:

کھلا در حشر عذاب دا
برا حال ہو یا پنجاب دا

اور وارث شاہ نے کہا:

احمد شاہ وانگوں میرے مگر پے کے
لُٹ پُٹ کے چک دا تال کیتا

اس کو لوٹ مار کی وجہ سے پنجابی میں یہ کہاوت مشہور ہو گئی کہ:

کھادا پیتا لاہے دا
باقی احمد شاہے دا

یعنی جو کچھ ہے کھا پی لو ورنہ احمد شاہ لوٹ کر لے جائے گا۔

یہ سب کیسا ہے؟ جو لٹتے ہیں وہ مقابلہ بھی کرتے ہیں اور جو محفوظ فاصلے پر دِلّی میں بیٹھے ہیں اُن کو مغرب سے اُٹھنے والا غبار بھی کسی شاہ اسلام کا لشکر معلوم ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے Bias کا جس کا ترجمہ میرے ذہن میں جانب داری ہے۔ دربار سے متعلق میراثیوں، بھانڈوں کرائے کے سپاہیوں اور طوائفوں کے کوٹھوں پر تہذیب سیکھنے والوں کا مفاد اور عوام کا مفاد ایک نہیں ہوسکتا اور تاریخ کے خالق تو عوام ہیں مگر ہمیں جو بکواس تاریخ کہہ کر پڑھائی جاتی رہی ہے۔ وہ شہنشاہوں کے قصوں اور قصیدوں پر مشتمل ہے۔ جو چیز دلی میں بیٹھ کر شمالی علاقوں میں شورش و بے چینی نظر آتی تھی وہ پاکستانی عوام کی خود اختیاری کی جنگ تھی اسی کو انگریزی محاورے میں کہتے ہیں۔ آپ باڑ کے کس جانب ہیں؟ دوسری چیز Perspective ہے۔ آپ کس بلندی سے جائزہ لیتے ہیں۔ آپ شاہی مسجد کے مینار پر کھڑے ہیں یا جی حضوری باغ میں؟ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء لاہور، حیدرآباد، پشاور، کوئٹہ والوں کے لیے آزادی کا دن ہے اور دِلّی والوں کے لیے بھارت ماتا کے ٹکڑے ہونے کا دن۔ یہی چیز پوری تاریخ میں نظر آتی ہے۔ ان دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بھی ہمارے ہاں تشخص کا بحران ہے!

کچھ لوگ اس حد تک تو آتے ہیں کہ ہم بھارتی نہیں مگر وہ ہمیں بھارت کا عکس یا سایہ بنا کر پیش کرتے ہیں، یہ ہیں دو قومی نظریے والے جو اُلفت نہ سہی نفرت ہی سہی کے مصداق ہمیں دِلّی سے نتھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ہے تشخص کا بحران!

یہ صحیح ہے کہ بھارت اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ ملک ہیں مگر پاکستان تو ایران اور افغانستان سے بھی علیحدہ ملک ہے۔ مُلکی تقسیم کو خواہ مخواہ مذہبی تقسیم کا رنگ دیا جاتا ہے۔ ہندو پانی مسلم پانی قسم کی تقسیم نئی نسل کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی کہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ دسہرہ دیوالی کیا ہے اور دو قومی نظریے کی ''نصف بہتر'' ہندو قوم پاکستان میں موجود نہیں ہے پھر اس نظریے کی بدولت آپ واہگہ بارڈر کا جواز تو ڈھونڈھ لیں گے طورخم اور نوشکی کی

سرحدوں کا کیا جواز ہے۔ طورخم کے دونوں جانب مسلمان پٹھان اور نوشکی کی دونوں جانب مسلمان بلوچ رہتے ہیں۔

یادش بخیر۔ اس نظریے کے علاوہ اُردو اور اسلام کو بھی ہمارا تشخص بتایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ بات ۱۹۷۰-۷۱ء کے بعد بھی کوئی سنجیدگی سے کہتا ہو کہ ان تینوں کی وہ دُرگت بنائی گئی ہے کہ خدا پناہ تشخص کے ضمن میں یہ نکات اب اس قابل نہیں کہ ان کو کسی علمی اور سنجیدہ بحث کا موضوع بنایا جائے۔ بقول اسحٰق محمد:

''قیامِ پاکستان کے لیے یہ موزوں نعرہ تھا اور اب۔۔۔ رات گئی بات گئی'' اُردو کے سلسلے میں یہ غرض ہے کہ ہر زبان کا ایک استعمال ہوتا ہے، ایک ضرورت ہوتی ہے جس طرح پاکستان میں رہ کر امریکی اور برطانوی سامراج کی دلالی کے لیے انگریزی زبان ضروری ہے اور آکسفورڈ اور سینڈ ہرسٹ سے تعلق قابلِ فخر اسی طرح دِلّی اور دربار سے منسلکہ لوگوں کے لیے اُردو زبان ضروری تھی۔ پنجاب میں یہ زبان انگریزوں کی بنگال آرمی کے ہمراہ وارد ہوئی اور حاکموں کی زبان ٹھہری، آج بھی چھوٹے افسروں اور ہوٹل کے بیروں سے بات کرنے کے کام آتی ہے۔ اس کو یہاں کے لوگوں کی مادری زبان بنانے کی کوشش عبث ہے کہ مادری زبان کا مطلب ماں بولی ہوتا ہے۔ قوم تو عوام پر مشتمل ہوتی ہے اور ہمارے عوام کی غالب اکثریت کسان ہے۔ کسان اپنی ماں بولی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتا۔ اپنی مادری زبان کا استعمال سُنتِ رسول ﷺ بھی ہے۔ ایک اور قسم کی زبان البتہ پاکستان میں پروان چڑھی ہے کہ جب بھی دو پاکستانی آپس میں ملتے ہیں تو ایک نئی طرح کی زبان تخلیق کرتے ہیں مثلاً ٹرک ڈرائیوروں کی زبان، اس کو آپ چاہیں تو اُردو کہہ لیں۔ اس زبان کا مزاج زیادہ عوامی ہے، درباری نہیں۔ یہ نئی اُردو پاکستان میں رابطے کی زبان بن سکتی ہے اور بن رہی ہے۔ اس بارے میں اسحٰق محمد نے کہا ہے:

''اُردو کو پاکستان کے لوگوں کی مادری زبان بنانے کی کوشش

سراسر جہالت ہے۔۔۔ یہ سالمیت (Integration) کی زبان بن سکتی ہے۔۔۔اس کا تخیل لکھنؤ اور دلّی کے خاص خاص محلوں سے اٹھتا ہے اور ایران اور توران سے اس طرف کہیں Land نہیں کرتا۔ اس کے برعکس یہاں کی مقامی زبانوں کا ادبی اثاثہ اس دھرتی اور یہاں کے عوام کی محبت سے رچا بسا ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی، سندھڑی، مہران اور یہاں کے محنت کشوں کی محبت میں سرشار ہے۔ یہی حال وارث شاہ، بُلھے شاہ اور خواجہ فرید کا ہے۔ خوشحال خاں خٹک نے بھی خٹکی کے سوکھے پہاڑوں سے دیوانہ وار محبت کی ہے اور اس وطن کے گیت گائے ہیں، راوی، چناب اور مہران کا ذکر خود پاکستانی علاقے کے اُردو شعرا بہت کم کرتے ہیں، نہ ان کے ہاں سرسوں پھولتی ہے نہ چڑیاں چہچہاتی ہیں اور نہ پیلو کی محبت ہے۔ وہ گل و بلبل سے نیچے ہی نہیں اُترتے۔۔۔ قوم کی نشاۃِ ثانیہ عوام کے خمیر سے اُٹھے گی اور اس خمیر میں انگریزی کا کوئی جزو شامل نہیں اُردو کا البتہ ہے کیونکہ اُردو اور یہاں کی مقامی زبانیں، سب آپس میں بہنیں ہیں۔''

مجھے یقین ہے یہاں اُسی اُردو کی بات کی گئی ہے جس کا ذکر اوپر میں نے کیا ہے۔ پاکستانی اور عوامی اُردو۔

بات زبان کی شروع ہوئی ہے تو کچھ ذکر ثقافت کا ہو جائے۔ زبان لباس عمارات ادب وغیرہ ثقافتی مظاہرے کے پسِ منظر میں گہرے تاریخی اور سماجی عوامل ہوتے ہیں ناخن بڑھانا بظاہر ایک بے ضرر سا شوق ہے مگر اس کی تہہ میں یہ اعلان ہے میں برتن نہیں دھوتی اور سوئمبر میں شرکت کے متمنی شہزادگان کے لیے یہ وارننگ کہ مشتری ہوشیار باش۔ بہت تنگ یا بہت کھلے کپڑے بھی یہی ظاہر کرنے کے لیے ہیں کہ ان کپڑوں کے پہننے والے کو کام نہیں کرنا پڑتا۔ خضر حیات اور ہوٹل کے بیرے کی ایک جیسی پگڑیاں بلاوجہ نہیں ہیں اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بھی قسم کے دلّال ایک خاص قسم کی ٹوپی کیوں پہنتے ہیں۔ بُرقعے کا

استعمال غریب طبقے سے نچلے درمیانے طبقے کی طرف ترقی کا سمبل ہے۔ زبان کے استعمال میں بھی بہت سے معانی پنہاں ہیں۔ اپنے سے برتر کے ساتھ انگریزی، کمتر کے ساتھ اُردو اور برابر والے کے ساتھ پنجابی بولی جاتی ہے! ایمکار کبرال کہتا ہے۔

''ایک قوم ثقافتی طور پر آزاد صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ۔۔۔ وہ قوم خود اپنی ثقافت کو اُونچا لے جانے والے رستوں پر واپس پلٹ آئے اور جان لے کہ قومی ثقافت کی پرورش خود اپنے ماحول کی زندہ حقیقتوں کے تحت اور طفیل ہی ہو سکتی ہے اور غیر ملکی ثقافت کے غلبے اور نقصان دہ اثرات سے انکار قومی ثقافت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔۔۔ یہ صلاحیت ہونی چاہیے۔۔۔ کہ مثبت ثقافتی اقدار کا تحفظ کر سکے ایک ایسا سنگم بنا سکے جہاں یہ تمام خود مختار دھارے مل کر ایک نئی سمت کا تعین کر سکیں۔۔۔ ثقافت بھی ہمہ وقت پھیلتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔۔۔ ثقافت کو تاریخ کا پھل سمجھنا چاہیے۔۔۔ ہر ثقافت میں ہزار خوبیاں ہوتی ہیں، ہزار کمزوریاں، کچھ حسرتیں ہوتی ہیں، کچھ کامرانیاں، مثبت پہلو بھی ہوتے ہیں، منفی پہلو بھی۔۔۔ کچھ ترقی کے عناصر ہوتے ہیں، کچھ ٹھہراؤ اور تنزل کے۔۔۔ ترقی کی بنیادیں تعمیر کرتے ہیں۔ ثقافت کی منفی قدریں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔'' ہم منفی پہلوؤں سے آنکھ نہیں چرا سکتے اُن کی نشاندہی لازمی ہے تاکہ اُن سے جان چھڑائی جا سکے۔ لال قلعہ تو ہم اپنے ساتھ لا نہیں سکے اور بہ امر مجبوری بھارت کو الاٹ کر دیا ہے مگر کچھ لوگ ابھی تک اس پر جھنڈا لہرانے کو تیار رہتے ہیں۔ کچھ چیزیں ہم ساتھ لے آئے ہیں جن میں سے منفی چیزیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینی چاہئیں ان سے چمٹے رہنا بھی بحران کا سبب ہے!

مثلاً ہیجڑوں کا ناچ ہے جس کو ہم اسلامی ہند کا تحفہ سمجھ کر قبول کر سکتے اور نہ ہی ہمیں اُردو شاعری کے قصیدوں کو گلے سے لگانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس صنف کو جس میں خطِ رُخسارِ دوست یا عطار کے لونڈے کی باتیں ہیں یا ہندی بچہ ای ہیں چہ حسن دھرے چھے کا ذکر ہے یعنی عاقل و بالغ شعرا اساتذہ کا نابالغ لڑکوں سے عشق۔

رہے ثقافت کے مثبت پہلو تو وہ برقرار رہتے ہیں اور مختلف تہذیبیں ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسلام کی آمد سے پہلے بھی ان علاقوں میں بدھ مت کے زیرِ اثر احرام باندھنے اور سر منڈانے کا رواج تھا۔ تسبیح اور اعتکاف، مدرسے اور حجرے موجود تھے۔ ذات پات نہ تھی۔ اس لیے ان علاقوں میں اسلام کو بہت قبولیت حاصل ہوئی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش ہی وہ علاقے ہیں جہاں ہندوستان سے دیس بدر ہونے کے بعد بدھ مت ٹکا رہا۔ ان علاقوں پر بار بار کے بیرونی حملے بھی اس کی ایک وجہ ہیں کہ تلوار سے بڑی تو کوئی ذات نہیں ہوتی اس لیے برہمن کی ذات پات یہاں نہ چلتی تھی۔ اسی لیے برہمن کا دھرم ان علاقوں میں آنے سے بھرشٹ ہوتا تھا۔ آج کا پاکستان یا پاک ملک برہمن کی نظر میں ناپاک ملیچھ ملک تھا۔ جب داہر کے باپ نے جو برہمن تھا یہ ملک فتح کیا تو مقامی آبادی اس پر خوش نہ تھی۔ اسی لیے محمد بن قاسم کے حملے کے وقت اس کا ساتھ دیا۔ ویسے بھی اس علاقے کے لوگوں نے ہمیشہ ترقی پسند سوچ کا ساتھ دیا۔ برہمن کے مقابلے میں بدھ مت کا اور بعد میں اسلام کا ملائیت کے مقابلے میں صوفی ازم کا اور پھر ۱۹۷۰ء میں سوشلزم کا مشترک نفسیاتی پس منظر بھی تشخص کے معاملے میں بہت اہم کام ہے۔ پاکستان کے علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت کا اس حقیر سی مسلمان اقلیت سے مقابلہ کریں جو دلّی کے اردگرد کے علاقے میں سات سو سال کی مسلمان حکومت کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ:

"سماج کا اندرونی معاشی اور سماجی ارتقاہی دراصل تاریخی عمل کی رُوح ہے۔ یہ ارتقاہی یہ تعین کرتا ہے کہ کسی اور تہذیب کا کون سا رُخ شامل ہو سکتا ہے یا کس طرح کا اثر ڈال سکتا ہے۔ ایسے اندرونی ارتقاء کے بغیر کسی قسم کے ثقافتی اثرات کو جذب کرنا ممکن نہیں ہوتا"

(پیپلز آف پاکستان گنکونسکی، ص ۳۱)

کھدائیوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہڑپہ تہذیب کے دور میں یہاں مختلف نسلیں آباد

تھیں جو بنیادی طور پر دراوڑ نسل سے متعلق تھیں۔ مختلف نسلوں کا بیک وقت ایک تہذیب کے دائرے میں رہنا اس علاقے کی ایک صفت معلوم ہوتی ہے۔ آریاؤں کے آنے اور چلے جانے کے بعد گندھارا تہذیب کے دور میں جو مختلف نسلی گروہ یہاں آباد تھے وہ بنیادی طور پر وہی تھے جو ہڑپہ تہذیب کے دور میں۔ یہ نسلی، رنگا رنگی، بنیادی وحدت کے ساتھ آج بھی برقرار ہے۔

سائنسی مطالعے کا ایک بنیادی طریقہ یہ ہے کہ موضوع زیرِ بحث کا صحیح تعین کرتے ہیں اس کو Definition یا تعریف کہتے ہیں۔ قوم کی بہترین تعریف میری نظر میں سٹالن نے کی ہے۔ ترمیم پسند سوشلسٹوں سے معذرت کے ساتھ سٹالن کہتا ہے۔

"قوم انسانوں کے ایسے پائیدار مضبوط گروہ کا نام ہے جس کے ارتقاء عروج میں تاریخ نے ہاتھ بٹایا ہو اور جس کے اندر (الف) اشتراکِ زبان (ب) اشتراکِ ارض (ج) اشتراکِ معاش اور (د) مشترک نفسیاتی ساخت ہو جس کا اظہار تہذیبی اتحاد و اشتراک میں ہوتا ہے۔" اس نے ان اجزاء کے لیے اجزائے لاینفک کا لفظ استعمال کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں نے جو معروضات پیش کی ہیں اُن کی رُو سے ہم ایک قوم کی تعریف پر پورے اُترتے ہیں۔ اشتراکِ ارض کی شرط ۱۹۷۱ء میں پوری ہوگئی ہے۔ ویسے بھی چوہدری رحمت علی کے تصور میں جو پاکستان تھا اس میں بنگال شامل نہ تھا۔ ایران اور افغانستان البتہ شامل تھے۔ علامہ اقبال نے بھی انہی علاقوں پر مشتمل پاکستان کا مطالبہ کیا تھا جو آج ہمارے ملک میں شامل ہیں (عمالستان وغیرہ کا ذکرِ خیر نہ تھا۔) پاکستان ریزولیشن میں بھی ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ریاستوں کا مطالبہ تھا جو ۱۹۷۱ء میں پورا ہو گیا۔ اب ہم پاکستان کا تشخص ماہ و سال کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

آج سے ۵ لاکھ سال قبل مسیح

پوٹھوہار کے علاقے میں، ضلع راولپنڈی میں، سوان وادی میں اور دریائے جہلم

اور دریائے چناب کے کنارے انسان کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں۔ جدید پتھر کے زمانے میں سائنس دانوں کے کہنے کے مطابق مقامی قسم کی انسانی تہذیبوں کا ظہور ہوا اور گین کوفسکی کا کہنا یہ ہے کہ اس زمانے کے جو آثار پنجاب میں ملے ہیں وہ باقی ہندوستان سے مختلف ہیں۔

۶۰۰۰ سال قبل مسیح

برصغیر کے پتھر کے زمانے کی معراج کہا جا سکتا ہے۔ وہ خطے جہاں قدرت مہربان تھی۔ وہاں کاشت شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں نے برتن بنانے شروع کر دیے تھے اور بھیڑیں، بکریاں اور کتے پالنے شروع کر دیے تھے۔ اس کو منقش ظروف سازی کی تہذیب بھی کہتے ہیں اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں یعنی آج کے پاکستان میں یہ تہذیب پورے عروج پر تھی۔ گن کوفسکی کے کہنے کے مطابق یہ سارا علاقہ ایک تہذیبی اور تاریخی وحدت تھا۔ کوٹ دیجی میں اس تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ اس زمانے میں وادیوں میں کاشت ہوتی تھی۔ پتھر کے بنے ہوئے بند بھی ملے ہیں۔ کاشت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی یہاں تک کہ فاضل پیداوار ہونے لگی جس نے شہروں کے قیام کو ممکن بنایا۔ اسی علاقے میں کوئٹہ، امری نال اور کلّو کی چھوٹی چھوٹی تہذیبیں وجود میں آئیں جن کے ماحول میں ایک وسیع تر تہذیب پروان چڑھی۔

۲۵۰۰۰ سے ۱۵۰۰ ق م

ہڑپہ تہذیب، شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً تقریباً ۱۱۰۰ کلومیٹر، دجلہ وفرات اور نیل کی تہذیبوں سے زیادہ وسیع۔ باقاعدہ نقشے کے مطابق بنے ہوئے دُنیا کے پہلے شہر، پورے علاقے میں ایک سی تہذیب ایک حکومت اور اس کے باقیات تقریباً سارے کے سارے آج کے پاکستان کے علاقے میں ملے ہیں۔ یہ ہے پاکستان آج سے ۵۰۰۰ سال پہلے اس علاقے کا نام پست سندھو ہے یا سات دریاؤں کی سرزمین، رزق کی فراوانی، اتھر وید میں لکھا ہے ''سلام اس دھرتی کو جہاں غلہ اور چاول اور جو میسر ہیں جہاں پانچ قومیں آباد ہیں''

یہ وہ دن ہیں جب دنیا میں پہلی بار اس علاقے میں سوتی کپڑا بُنا گیا جس نے سندھو نام پایا۔ موہنجوڈرو کی آبادی ایک لاکھ تھی۔ یہ سندھو کا شہر جہاں کہنیوں تک کپڑے پہننے، ماتھے پر تلک لگانے، گلے میں سیاہ پوتھ پہنے، کندن کے رنگ والی سہاگنیں شیو درگا دیپ لکشمی اور پیپل کی دیوی کی آرتی اتارتیں۔

۱۵۰۰ ق م

''سندھو کے کنارے بسے ہوئے شہروں پر اللہ کا قہر ٹوٹا'' آریاؤں کا حملہ شروع ہو گیا۔ علاقہ تو آریاؤں نے فتح کر لیا مگر ہڑپہ کی برتر تہذیب نے آریاؤں کو فتح کر لیا۔ ۵۰۰ ق م تک یہ حملے جاری رہے مقابلہ بھی ہوا اور اس قدر رہا کہ آریا گنگا جمنا کی وادی کی طرف جانے لگے اور وہاں جا کر اپنا ذات پات کا نظام بنایا۔ ہمارے علاقے نے یہ نظام نہ اپنایا۔ اس لیے یہ علاقہ بعد میں بھرشٹ قرار پایا۔ ہندوؤں کا کوئی تیرتھ اس علاقے میں نہیں ہے حالانکہ یہیں پہلا وید جو دنیا کی پہلی مذہبی کتاب ہے، لکھا گیا یہیں دنیا کا پہلا گرامرین پانِنی ہوا۔ آریائی آ کر چلے گئے مگر علاقے کی تہذیبی بنیادیں برقرار رہیں۔ زبان بھی بنیادی طور وہی رہی اور نسلی گروہ بھی وہی ویدوں میں ۱۰۰۰ ق م سے ۵۰۰ ق م کے زمانے میں اس علاقے میں غیر آریائی قبیلوں کے وجود کے شواہد ملے ہیں۔ مثلاً دوآبہ رچنا میں مدرا قبیلہ۔

۵۰۰ ق م

شمال مغربی پراکرت یا گندھارا زبان بولنے والے قبیلوں اور قومیتوں کا ایک گروہ ہندوستان کے شمال مغرب یعنی پاکستان میں وجود میں آ رہا تھا۔ مدھیا دیشی میں ایک علیحدہ زبان وجود میں آ رہی تھی۔ جو شمال مشرقی علاقوں کے درمیان حدِ فاصل کی طرح ہے۔ یہ ہے تشخص پاکستان بھارت اور بنگلہ دیش کا۔ یہ علاقہ ایران کی کیانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اس سلطنت کے ہندوستانی صوبے کے بارے میں جو تحریریں ملی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صوبہ آج کے پاکستان پر محیط تھا۔ اساٹری اسے سندھا کہتے تھے۔

۴۰۰ ق م

پاکستان نے کیانی سلطنت سے آزادی حاصل کر لی۔ بیرونی اثر مقامی تہذیب کو ختم نہ کر سکا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسی ماحول میں پانی نے دنیا کی پہلی گرامر لکھی اور اس علاقے میں پہلی یونیورسٹی پروان چڑھی۔

۳۲۶ ق م

سکندر یونانی کا حملہ۔ اس نے اس کو علیحدہ ملک تصور کیا۔ شمال مغرب میں سوات سے داخل ہوا اور اس کی مشرقی سرحد یعنی بیاس تک گیا پھر ملتان کے رستے کراچی کے قریب تک گیا اور بلوچستان کے رستے واپس چلا گیا۔ بقول وہیلر "یہ تھا پاکستان سکندر کے دنوں کا اور یہی ہے پاکستان آج کا" سکندر کے جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی چندر گپت موریہ نے یونانیوں کا اقتدار ختم کر دیا۔ چندر گپت راول پنڈی کا رہنے والا تھا مگر حکومت کا مرکز بھارت میں لے گیا۔ ۲۷۳ سے ۲۳۶ ق م تک اشوک کا دور آیا جس نے بدھ مت قبول کر لیا اور یہ بدھ دور تھا جس کا مرکز یہی علاقہ تھا۔ اشوک کے مرنے کے بعد یہ علاقہ آزاد ہو گیا۔ تیسری صدی ق م کے اختتام پر اس علاقے میں ایک آزاد حاکم سہاگ سین کی حکومت تھی اور اس کا دارالحکومت گندھارا تھا۔

۱۰۰ تا ۵۰۰ عیسوی

ساکا اور کشان حکومت قائم ہوئی۔ یہ آزاد علاقہ ہندوستان کے ماتحت نہ تھا بلکہ اس کے برعکس بہت سے علاقوں پر اس کی حکومت تھی۔ حکومت کا مرکز پرش پورہ یا پشاور تھا جے سوال کی تاریخ ہند میں لکھا ہے "پھر ملیچھوں کی حکومت آئی جو کشانوں کی حکومت تھی سندھ کے کنارے" یہ گندھارا تہذیب کا دور ہے۔

۵۰۰ تا ۶۰۰ء

پشاور ہند میں شامل نہ تھا۔ ہندوستان کی گرمارا پرتی ہارا سلطنت کا حصہ نہ تھا۔ نہ

ہی گپت کی اور نہ ہی ہرش کی حکومت کا حصہ تھا۔ چندر گپت کی حکومت جو اشوک کے بعد سب سے بڑی تھی، میں کشمیر شامل نہ تھا، نہ ہی ستلج کے پار اس نے جانے کی کوشش کی"

۷۱۲ سے ۱۰۱۰ء

پہلے اُمیہ سلطنت کا حصہ رہا پھر عباسی سلطنت کا۔ پھر آزاد یہ بالکل علیحدہ ملک تھا۔ سکندر کی طرح محمد بن قاسم اور اس کے جرنیلوں کی فتوحات بھی پاکستان تک محدود تھیں۔ بقول عبداللہ یوسف علی "دریائے سندھ کے دہانے سے کشمیر تک" بعد میں عرب راج، سندھ، بلوچستان، بہاولپور تک محدود ہو گیا۔ شمالی پنجاب اور سرحد آزاد راجاؤں کے تحت تھے۔ بھارت کے ماتحت نہ تھے۔ "دو یا کی قدیم ہندوستان کی تاریخ" میں لکھا ہے:

> "عرب لکھاریوں کے نزدیک ہندوستان ہمیشہ ہند اور سندھ میں تقسیم رہا ہے۔ سندھ جہاں محمد نوں نے فتح کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی۔ ہندوستان سے علیحدہ ہے۔"

البیرونی نے لکھا ہے:

"اگر ہند جانا ہو تو براہ کابل جائیں اور اگر سندھ جانا ہو تو براستہ بجستان" وہ لاہور کو ہندوستان کی شمالی حد، کہتا ہے۔ کراچی کی بندرگاہ کو ابنِ بطوطہ نے لاہورانی لکھا ہے۔ جو پنجاب اور سندھ کی بندرگاہ ہے۔ محمد علی کوفی نے تاریخ ہندوسندھ لکھی۔ البیرونی بحیرہ عرب کو سندھ ساگر کہتا ہے۔

۱۰۱۰ تا ۱۱۸۷ء

کو غزنوی دور کہہ سکتے ہیں۔ سلطنت کا مرکز غزنی تھا۔

۱۲۱۰ء

قطب الدین کی موت۔ پاکستان نصیر الدین قباچہ کے تحت بیس سال سے زیادہ آزاد رہا۔ حکومت کا مرکز بہاولپور میں اُچ تھا۔

مسلمان اور برطانوی سلطنت کا حصہ۔ جس میں جنوبی ایشیا کے بہت سے ملک شامل تھے۔ اس دوران پاکستان کے بہت سے حصے بار بار آزاد ہوتے رہے۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ علاقے آزاد تھے۔ بدقسمتی سے ہماری محکومی کی صدیاں ہی وہ تاریخی دور ہے جس میں دنیا کی قوموں کی جدید سیاسی معنی میں تشکیل ہوئی، مگر ہم اس عمل سے نہ گذر سکے۔ کبرال کہتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام میں محکوم عوام کی تاریخی نشوونما ملیا میٹ ہو جاتی ہے اور یہ ہمارے تشخص کے بحران کا سب سے بڑا سبب ہے۔ مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں پاکستان کے قومی تشخص کے بحران کا حل یہ ہے کہ ہم اشتراک ارض کے عنصر کو دھیان میں رکھیں۔ اپنی دھرتی کو جانیں، پہچانیں، خلاؤں سے اُتر کر اس پر اپنے پیر جمائیں، اس سے پیار کریں یا ئے نسبتی کو چھوڑ کر اسی دھرتی کے باسی بننے کی کوشش کریں۔

اشتراکِ زبان کو ذہن میں رکھیں اور علاقائی زبانوں کے ملاپ سے بننے والی زبان کو فروغ دیں اور انگریزی وغیرہ سے جان چھڑائیں۔ اشتراکِ معاش کو ذہن میں رکھیں اور اپنی قومی معیشت کی تعمیر کریں جو کبھی افراد قوم کو باعزت روزگار مہیا کر سکے اور ہمیں ساری دنیا سے بھیک مانگنے کے عذاب سے بچا سکے اور یہ کہ ہم مشترک نفسیاتی ساخت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک قومی عوامی جمہوری اور سائنسی ثقافت کی تلاش کریں۔

جو قومی ہو یعنی سامراج دشمن ہو
جو جمہوری ہو یعنی جاگیردار دشمن ہو
جو عوامی ہو یعنی سرمایہ دار دشمن ہو

اس ثقافت کی ترویج کی جائے اور اس کو ترقی دی جائے۔ پاکستانی قوم کی اس نئی ثقافت کی ترویج و ترقی ہمارا مقدس فریضہ بھی ہے۔ تاریخی جبر بھی ہے۔ ہماری بقا کا جواز بھی ہے اور ہمارے جملہ مسائل کا حل بھی ہے۔

ooo

بھگت سنگھ

اج تریوی مارچ اے۔ بھگت سنگھ نوں یاد کرن دا دن
اسیں لائل پور والے جنھوں ہن فیصل آباد کہندے نیں
خوش قسمت ہاں جو بھگت سنگھ ساڈے ضلعے چ جمیا سی۔ میجر اسحاق محمد تے بھگت سنگھ دے گھر نوں جان والی جڑانوالہ روڈ اکوای اے۔

ایہو جہے بندے، ایہو جہی دھرتی وچ ای جمدے نیں۔ اج انجم سلیمی تے گرمیت سنگھ دے سدے تے میں حاضر ہویاں تے دوگلاں وی کرساں۔ میں ہن تک بھگت سنگھ دے ناں دے کُجھ وی جاندار ہیاہاں۔ وجہ میں اَج تہانوں دسداہاں۔

انگریز سرکار نے بھگت سنگھ نوں دہشت گرد کہیا سی تے اسیں انگریز دے آکھے نوں حدیث سمجھدے ہاں۔ ساڈے انقلابی۔۔۔ جیہڑے ہڈوں رومانی لوک نیں۔۔۔ انجم سلیمی نیں، انجم رومانی نیں۔۔۔ بھگت سنگھ نوں انقلابی دی تھاں دہشت گرد کہہ کے اوس نوں وڈیاندے ہن۔

میں یاراں، دوستاں نال سنگ پھسان دی تھاں ایس بحث نوں ٹال جانداہاں۔

بھگت سنگھ انقلابی پارٹی دا بند اسی تے انقلاب دے راہ تے چل رہیا سی۔ ایہہ وکھری گل اے کہ انقلاب، ماؤ دے اکھان موجب کشیدہ کاری نئیں۔ میل گھول۔۔۔ طبقاتی جنگ۔۔۔ وچ ہتھیار بند جدوجہد دی ضروری ہندی اے۔ کیونجہ، ظالم حکمران طبقہ، صلح صفائی نال چوری دا مال نئیں پرتاندے۔

دہشت گردی جے کوئی کرداوی ہے تے ایہہ حکمران طبقیاں دے فیدے لئی ہندی اے۔ اوہناں نوں جواز مل جاندا اے، طبقاتی ظلم ودھان دا۔

لینن نے اپنے بھراواں ورگے وڈے بھرادی نندیا کیتی سی کیونجہ اوس زار تے حملہ کیتا سی۔ نتیجے دے طور مورے کئے انقلابیاں نوں پھانسی ہوئی تے کئے سائبیریا گھلے گئے۔

آپوں بھگت سنگھ آکھیا اے۔

''مینوں پورے زور نال ایہہ اعلان کرن دیو کہ میں Terrorist نئیں تے نہ کدی ساں، میرے شروع دے انقلابی کیرئیر توں کجھ لوکاں نوں ایہہ شک ہے سی۔

میں پورے یقین نال کہناں ہاں جو اوہناں طریقیاں دا سانوں کجھ فیدہ نہیں لبھ سکدا۔ تسیں ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوی ایشن دی تاریخ توں ایہہ اندازہ لا سکدے او۔

ساڈی ساری جدوجہد دا اکو ای مقصد سی جو اسیں عظیم انقلابی تحریک نال اوہدی مسلح ونگ دے طور رجڑ جائیے۔

جے کسے مینوں غلط سمجھیا ہے تے ہن اوہ اپنا خیال بدل لوے۔ میں ایہہ تے نہیں کہندا کہ پستولاں تے بمب بے فیدہ ہوندے نیں۔ اُلٹا ایہہ ڈھیر فیدہ مند ہندے نیں۔ میں ایہہ کہنا چاہندا ہاں کہ نرا بمب سٹنا بے کار ہے بلکہ کدی کدائیں نقصان دیندا اے۔ پارٹی دے ملٹری ونگ نوں ہمیشہ جناں اسلحہ مل سکے، ایمرجنسی لئی تیار رکھنا چاہی دا ہے تے ایہناں نوں پارٹی دے سیاسی کم وچ ہتھ پونا چاہیدا اے۔ ایہہ پارٹی توں وکھ اپنا کم نئیں کرسکدا تے ناں

ای اینوں کرناں چاہی دا ہے۔"

اِک دُوجا اکھان اج ادیباں، شاعراں تے انقلابیاں دے کوٹھ وچ پڑھن جوگ ہے۔

''میں زور دے کے ایہہ گل آکھناں کہ میں اُمید تے اُمنگ نال بھریا ہویا ہاں، زندگی دے حسن دا موہ مینوں بہت ہے پر لوڑ پین تے میں ایہہ سب کجھ چھڈ سکداں۔۔۔ ایہوای قربانی ہے۔"

تشدد ہمیشہ ریاست ولوں ہندا ہے۔ عوام اوس دا مقابلہ کردے کردے جت جاندے ہن تے ویریاں نوں مار بھجاندے ہن۔

آؤ اج اپنے شہیداں نوں یاد کرنے ہاں تے آپو اپنے گریبان وچ جھاکیے۔

آؤ ایہہ وی ویکھیے شہید کون ہے۔

شاہ حسین آکھیا:

شاہ حسین شہادت پائیں
جو مرن متراں دے اگے

ooo

حسن ناصر کا راستہ

ے ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گذر تو دیکھو

ایوب خاں کے مارشل لاء میں سندھ کی کمیونسٹ پارٹی کے جوائنٹ سیکرٹری کو قلعۂ لاہور میں شہید کر دیا گیا۔ ایک اور نو آموز کمیونسٹ وکیل، میجر اسحاق محمد نے حسن ناصر کا مقدمہ لڑا، تا کہ شہید کے ماتھے سے خودکشی کا داغ، وہ الزام جو اس کے قاتلوں نے لگایا تھا، دھل جائے۔

اس مقدمے کے دوران، ریاست کے مختلف بازوؤں، انتظامیہ اور عدلیہ کا کردار جیسا نظر آیا اسے میجر اسحاق محمد نے 'حسن ناصر کی شہادت' نامی کتاب میں بے کم و کاست بیان کر دیا۔

آج کا دور ہوتا تو میجر صاحب کو یہ تردّد نہ کرنا پڑتا۔ اب تو عوامی جگہوں پر بم پھینکنے والے، سربازار، بچیوں کے سکولوں میں، بسوں میں ۔۔۔ یعنی ان جگہوں پر جہاں حکمران طبقات کے کسی فرد کی موجودگی کا امکان نہ ہو۔۔۔ ایسی جگہوں پر بم سے خودکشی کرنے والے

بھی شہید کہلاتے ہیں۔

صحیح نظریے کی اہمیت، آج سے زیادہ کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ شاعر سوال کرتا ہے۔

ناف کو چھوتی جہاد پیشہ زبانیں
اسلحہ پرستوں کی نمائندگی پر کمربستہ ہیں
زندگی
محبت
اور آزادی کا نمائندہ کون ہے؟

ظاہر ہے کہ وہی جو عوام میں سے ہے، عوام کا ہے، طبقاتی طور پر باشعور ہے، سیاست اور مذہب کے پیچھے طبقاتی مفادات کی سمجھ رکھتا ہے۔ حکمران طبقات کے ہذیان کو اہمیت نہیں دیتا بلکہ پسے ہوئے طبقات کے مفادات کا نگہبان ہے اور انہی میں کام کرتا ہے۔ عوام میں ملنے کے نام پر نظریاتی دھندلاہٹ (کنفیوژن) کا شکار نہیں ہوتا۔

1917ء کے عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد سے انسانی سماج اور تاریخ، مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ مظلوم طبقات کے جبلی غصے کی جگہ باشعور انقلابی جدوجہد نے لے لی ہے۔ حکمران طبقات بھی، جدلیاتی طور پر اتنے ہی چالاک ہو گئے ہیں اور محکوم طبقات کو مذہب اور ملک کے نام پر لڑانے میں زیادہ ماہر۔

جب روس میں 1917ء کا دھرتی دہلا دینے والا انقلاب ہوا تو لینن کے پاس کسی خدا کا کوئی پروانہ نہ تھا، وہ تمام عمر حقائق سے صداقت کی تلاش کرتا رہا جو اس کی مادی جدلیاتی نظریے کا مغز ہے۔ اس کے ساتھی بھی اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس نظریے کی روشنی میں حالات کی توجیح کرتے رہے اور علاج تجویز کرتے رہے۔ ان سبھی کی آپس میں بہت بحثیں ہوئیں۔ شدید اور اکثر اوقات تلخ مگر کسی نے کبھی کوئی آسمانی حوالہ نہ دیا۔ انسانی زندگی، انسانی سماج، انسانی سوچ، مفادات اور جذبات کے حوالے سے بات کی۔ اسی سے تمام مسائل کو

سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ تمام مباحث میں کوئی دور از کار دلیل استعمال نہ کی گئی۔ کسی جگہ کسی معجزے کا ذکر نہیں۔ معجزہ جو جاگیرداری سماج سے مخصوص ہے۔ اسی لیے مارکس نے جاگیرداری دور کو انسان کا حیوانی دور کہا ہے۔ (Zoology کا لفظ استعمال کیا ہے)

آج کہ پاکستانی سوشلزم ایک ویرانے کا منظر پیش کرتا ہے بعض لوگ حسن ناصر کا راستہ چھوڑ کر عوام میں گھلنے ملنے کے نام پر دہشت گردوں کے انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں۔ قبائلی اور بلوچ سرداروں کی حمایت کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ انہیں سامراج دشمنی کا میڈل عطا کرنے پر تلے ہیں۔

پرولتاری پارٹیاں لاکھ کمزور سہی، پرولتاری نظریے کے بغیر آج کے دکھوں کا دارو ممکن نہیں۔ حسن ناصر نے تمام عمر اسی نظریے سے وفا کی۔ اسی کی راہ نمائی میں جدوجہد کی، اپنے طبقے سے غداری کی، اس کی سوچ سے بغاوت کی۔۔۔ انقلابی سوچ اور انقلابی عمل پر کاربند رہا۔

اس میں بہت سے اسباق ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔۔۔ کوئی جہالت محترم نہیں ہوتی، حتیٰ کہ عوامی جہالت بھی۔ عوام کی جہالت کے احترام میں عوام دشمن رواج اور تہذیبی رویے اور مذہبی شعائر مقدس نہیں ہو جاتے۔ ان سب کو رد کرنا ہی انقلاب اور انقلابی سوچ ہے۔ سرداروں کی سرداری عورتوں کا کمتر مقام، مذہبی برتری، علاقائی تفاخر، قومی عصبیت، ملکی منافرت۔۔۔ کوئی بھی تو محترم اور مقدس نہیں۔ سب کو رد کرنا ضروری ہے۔ عوام کی غلط سوچ کی حد تک گرنا، انقلابی رویہ نہیں ہے۔ عوامی سوچ کی تعلیم و تہذیب مسلسل انتھک کام کے ذریعے، عوام میں گھل مل کر یہی انقلابی کام اور انقلابی جدوجہد ہے۔ اس نہج پر کام کرتے ہوئے، اس راہ میں 'جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری' کے مصداق جان لٹانا ہی شہادت ہے۔ مانگے کے بموں سے نہ شہادت ملتی ہے، نہ انقلاب۔ انقلاب ڈرامہ اور شعبدہ بازی نہیں۔ طبقاتی مفاد، طبقاتی منافرت، طبقاتی جدوجہد بنیادی اجزا ہیں انقلابی جدوجہد کے۔ مگر

بقول قیوم ناصر:

'نفرت کا جواز میری اور تمہاری مٹھیوں میں ہونا چاہیے'

اس جواز کے بغیر، اس نظریے کے بغیر، ہزاروں سال کی غلام بغاوتیں اور کسان بغاوتیں کس کام آئیں، لاکھوں مارے گئے، ظالموں کے ہاتھ مزید مضبوط ہوئے، غلام داری کی جاگیرداری میں تبدیلی نے ہزاروں سال لیے اور جب جاگیرداری آئی تو اس نے اس طرح پیر جمائے کہ ابھی تک جانے کا نام نہیں لیتی، اس کا نظریہ اتنا مضبوط ہوا کہ محکوموں کے دل میں اس کا تقدس اور دبدبہ گھر کر گیا۔ ظالموں کے ظلم کو قدرت کا قانون کہا اور مانا گیا۔ صحیح نظریے کی رہ نمائی کے بغیر، عراق جیسے ملکوں میں بہنے والا غریب کا خون رائیگاں، خون کے آنسو رلاتا ہے۔

یورپ کے مزدور نے چار سو سال کی جدوجہد میں سرمایہ دار سے مل کر جاگیرداروں اور اس کے خداؤں کو شکست دی۔ ان کے کچھ خدا، کونوں کھدروں میں دبکے رہے۔ باقی ماندہ، جاگیرداری ساجوں میں ابھی تک دندناتے پھر رہے ہیں۔

اور پھر جدلیات کے قوانین کے تحت، سرمایہ داری سے متاثر پرولتاریہ نے سرمایہ داری سے نجات کی جدوجہد شروع کی جس کو مارکس اینگلز جیسے نظریات دان مل گئے۔ لینن جیسے رہنما اور ایک نئی دنیا وجود میں آئی۔

اب سوشلزم کی وقتی پسپائی نے رجعت پسندوں کو یہ موقعہ دیا ہے کہ اپنی اپنی جہالت کی نشاۃِ ثانیہ کا ڈھونڈورا پیٹیں مگر

ع زمانوں کے قدم واپس پلٹنے کو نہیں اُٹھتے

(غلام حسین ساجد)

یہ ہے وہ ایمان جس کی ضرورت ہے، جو انقلابی جدوجہد کا راہ نما ہے، جو علم اور سائنس کی روشنی سے منور ہے۔ جس میں لحہ بہ لحہ ترقی کی گنجائش اور ضرورت ہے۔ جس کی

مقدس ضیا میں حسن ناصر چلا، اس کے قدم نہ ڈگمگائے، اس کا ایمان نہ ڈولا، اس کا ایقان متزلزل نہ ہوا حتیٰ کہ شہادت کو چھولیا۔

انقلابی جدوجہد اور شہادت کارِ طفلاں نہیں۔ انسانیت کی معراج ہے۔ اور اب

نئی رت آگئی ہے
روشنی کی فصل پکنے دو
یہی روشنی ہماری رہنمائی کرے گی

رجعت کے شیاطین اندھیروں سے پکارتے ہیں۔ انہیں نظر انداز کرنے میں ہی ایمان کی سلامتی ہے۔ ڈھنڈورچی تو بس ڈھنڈورچی ہوتے ہیں۔ علم اور انقلاب، سنجیدہ ذہن اور ایمان کی پختگی مانگتے ہیں۔ مسلسل اور طویل جدوجہد۔۔۔ شام سے پہلے کیش کروانے کی خواہش، انقلابی جدوجہد نہیں، حکمران طبقات کی دہاڑی داری ہے۔

ہمارے لیے تو جدلیاتی مادیت کا علم، میجر اسحاق محمد کا انقلابی عمل اور حسن ناصر کی استقامت اور شہادت راہ نما ہیں۔

حسن ناصر زندہ باد

○○○

فیضؔ اور عصرِ حاضر

عصرِ حاضر کیا ہے؟ تخلیق کاروں سے کیا مطالبہ کرتا ہے؟ فیض ان سے کیسے عہدہ برآ ہوا۔۔۔ (عصرِ نو، عصرِ حاضر، عصرِ جدید اور عہدِ جدید کو میں نے مترادفات کے طور پر استعمال کیا ہے)

ماؤ کا ایک مصرع ہے:

"عظیم انسان ڈھونڈنے ہوں تو عصرِ حاضر سے لو لگاؤ"

اس کی تفسیر یہ ہے۔

متقدمین کا تمام علم اور تجربہ متاخرین کی دسترس میں ہوتا ہے۔ جس سے وہ مستفید ہوتے ہیں۔ بچہ، باپ کے کندھے پر کھڑا ہو کر باپ سے لمبا ہو جاتا ہے۔ فیض کی عظمت کے اجزائے ترکیبی میں یہ عنصر شامل ہے۔

عصرِ حاضر بیسویں صدی سے عبارت ہے۔ 9 سال اور جمع کرلیں۔ یہی زمانہ ہے سرمایہ داری کے عروج کا سامراج کے قیام کا اور یہی زمانہ ہے سرمایہ داری کی شکست کا۔ عوام نے اپنی خام قوت اور جدید خیالات اور نظریات کے بل بوتے پر ظالمانِ جہاں کو شکست

دی ہے۔

اقبال نے 'کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ' کی حسرت کا اظہار کیا۔ فیض کہ سدا کار جائی ہے۔ کہا:

اجنبی ہاتھوں کا بے نام، گراں بار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

عصرِ حاضر یا عصرِ نو یا عصرِ جدید، ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی روایت کا دور ہے۔ اس روایت کا مغز ہے۔

Subject یعنی موضوع پر زور، راوی کے روایت کرنے کے اسلوب سے احتراز، جنسی تفریق سے حذر کیا نظر آتا ہے کی بجائے، نظر کیسے آتا پر زور موخر الذکر کے بطن سے ساختیت اور مابعد ساختیت وجود میں آئیں۔

قدیم یونانیوں کی طرح فلسفیانہ سطح پر دنیا کو سمجھنے کی تڑپ، بنے بنائے گھڑے گھڑائے نظریات سے انکار۔ الغرض یہ ہیں 20ویں صدی کے خیالات بالخصوص مغربی دنیا کے۔ ان میں وکٹورین محاکمات کا انکار ہے۔ آرٹ ایسا ہونا چاہیے، ویسا ہونا چاہیے کا انکار ہے۔ اس چاہیے کو دیس نکالا ملا۔ اس لہر کی ابتدا کے بڑے نام ہیں۔ ورجینیا وولف، جیمز جوائس، ٹی ایس ایلیٹ، عذرا پاؤنڈ، ملارما، کافکار، رلکے۔ یہی لوگ ہمارے ہاں کے ادبی مباحث کا بھی خام مال ہیں۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ ان کے نظریات کا اقرار کرو یا ان سے انکار۔ بات انہی سے چل کر انہی پر ختم ہوتی ہے۔

ادب میں عوام کی زبانیں در آئیں۔ Kings English اور اردوئے معلّٰی کی اصطلاحات، باطل ٹھہریں۔ موضوعات بھی بدلے۔ آرٹسٹ بذاتِ خود موضوع بنا۔ خود کلامی، خود شناسی کا چلن آیا۔ ادب کا مواد عام لوگوں کی زندگی ٹھہری۔ جنوں، پریوں، نوابوں، بادشاہوں کے قصے متروک ہوئے۔ برصغیر میں اس کے ساتھ ترقی پسندی اور انقلابی اور

مزاحمتی ادب کا پیوند لگا۔ غرضیکہ عصرِ جدید وہی ہے جس میں ہم آپ سانس لے رہے ہیں، جس میں فیض نے اپنی حیاتِ ارضی بسر کی۔

سماجی طور پر یہ طبقاتی جدوجہد کا دور ہے اس لیے مارکس کا دور ہے۔ وہی مارکس جس کے بارے میں علامہ نے کہا تھا کہ

"پیغمبر تو نہیں مگر اس پر کتاب اتری ہے"

لفظی ترجمے کے شوقین اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ نیست پیغمبر ولیکن در بغل کتاب دارد۔۔۔ اور کتاب تو ہر طالب علم کی بغل میں ہے۔۔۔ ہوتی ہوگی۔ ہم نے تو موبائل فون اور کلاشنکوف والے طالبانِ علم ہی دیکھے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ ملکوں اور قوموں کی آزادی کا دور ہے۔ یکے بعد دیگرے، محکوم اقوام آزاد ہوتی چلی گئیں۔ سامراجی اور نوآبادیاتی ممالک معذرت خواہانہ رویہ اپنا رہے ہیں۔ جاپان نے چین سے معافی مانگ لی۔ ایران امریکہ سے معافی منگوانا چاہتا ہے۔ ہر ملک ملکِ ماست کا فخریہ نعرہ متروک ہوا۔

علمی طور پر عصرِ جدید، سائنس کا دور ہے۔ زمین اب گائے کے سینگوں پر ٹکی ہوئی نہیں، قدرتی آفات امیروں کے گناہوں کی سزا دینے کے لیے غریبوں پر نازل نہیں ہوتیں۔ ان کے کچھ طبعی، قدرتی اسباب ہیں۔ سورج اور ستارے، اب زمین کے گرد چکر نہیں لگاتے، کائنات کا یہ تماشہ حضرتِ انسان کی تفریحِ طبع کے لیے برپا نہیں کیا گیا۔

حیاتیاتی طور پر Natural Selection ہی توضیح ہے۔ لاکھوں اقسام کی نباتاتی اور حیوانی حیات کا تنوع تبھی سمجھ آتا ہے جب نظریۂ ارتقا پر مغز ماری کی جائے۔ عصرِ جدید ڈارون کا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی پر اب ہنسی بھی نہیں آتی۔ اب شاعر کا مقام اور ہے۔

طبع شاعر ہے جنگاہِ عدل و ستم
منصفِ خیر و شر حق و باطل ہیں ہم

شخصی طور پر یہ دور ہے Humanism کا۔ انسان ہی انسانی اعمال کا متروک ہے اور ذمہ دار بھی، کوئی غیر انسانی چیز نہیں۔ انسان کے بطور انسان کے حقوق ہیں۔ جنسی اور نسلی اعتبار سے کوئی برتری نہیں۔

انسانی حوالے سے یہ آزادی کا دور ہے۔ یوں نہیں کہ آزادی سب کو مل گئی ہے۔ گو سب کو بہم بادہ و ساغر تو نہیں ہیں، مگر آزادی سب کے ایجنڈے میں شامل ہے اور ایجنڈے میں وہی بات شامل ہوتی ہے جو ممکنات میں ہوتی ہے۔ اب بادشاہ ظلِ الٰہی نہیں ہیں یہ سایۂ ناپید ہو چکا ہے۔ یہ تصور ہی مضحکہ خیز ہے اور مضحکہ خیز نظریات اور ادارے آج نہیں تو کل معدوم ہو جاتے ہیں۔

انسانی تعلقات کا رخ بھی بدل گیا ہے۔ یہ بات ہر کہ و مہ کی سمجھ میں آ گئی کہ پیار و محبت صرف برابری کی سطح پر ہو سکتا ہے۔ ایک لونڈی اور 'کدموں کی کھاک' اپنے آقا کی چاکری تو کر سکتی ہے، پیار نہیں۔ نوکر تو مالک سے صرف نفرت کر سکتا ہے۔۔۔ رہا قدموں کی خاک چاٹنے والا آقا۔۔۔ غلام دار تو ہو سکتا ہے۔ عاشق زار نہیں۔

عصرِ جدید، انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھانے کا دور بھی ہے۔ فرائیڈ کی کتاب 'خوابوں کی تعبیر' 1900ء میں چھپی اور خوابوں کو انسانی نفسیات کا حصہ بنا گئی۔ خواب الوہی وائرلیس نہیں خوابوں کی بنیاد پر قائم مفروضے باطل ہوئے۔

قدرتی سائنسوں میں عصرِ جدید آئن سٹائن کا ہے۔ جس نے بقول علامہ ذرے کا جگر چیرا۔

یہ تھا مختصراً عصرِ حاضر کا بیان، جس کا ایک مغنی ہے فیض احمد فیض۔۔۔ کھرج میں، دھیمے سروں میں انقلاب کی للکار۔

فیض اپنے عہدے سے کیسے عہدہ برآ ہوا۔ نوجوانی میں اسے احساس ہوا کہ

ے موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

مگر اس کا احساس بیدار تھا ہمت بلند تھی۔ سوچا انسان کے بس میں اتنا تو ہے۔

ع گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا۔۔۔

فیض کہ تمام عصری علوم کا شناور تھا، تمام تر ادبی روایت کا شناسا تھا۔ اپنے اردگرد پر گہری نظر رکھتا تھا اور حالات نے اسے سمجھایا کہ

ے ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول

بے نیاز دعا ہے ربِ کریم۔ انسان اگر انسان ہے تو اپنے حالات سے، اردگرد کے حالات و واقعات سے سیکھتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فیض نے کیا سیکھا کیا سمجھا۔

ے عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
زیردستوں کے مسائل کو سمجھنا سیکھا

اور ان زیردستوں کے بارے میں یہ سیکھا۔

ے یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

مگر خواب تو نرے پرے خواب ہیں۔ عملاں باجھوں گلاں کوڑیاں۔

ے دیکھ کہ آہن گر کی دکان میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

ایک لوہار بھی اپنے عمل سے اپنی قوم کو آزادی دلا سکتا ہے۔ ایران کا لوہار۔۔۔ آہن گر۔۔۔ کاوہ غلاموں کی زنجیریں کاٹ دیتا تھا کہ انہیں آمر ضحاک سے نجات ملے۔ ضحاک جو اپنے باپ کا قاتل تھا۔ اس عملِ نیک کے اجر کے طور پر شیطان نے اس کے کاندھوں

پر بوسہ دیا اور اس جگہ سے سانپ اگے۔ شیطان نے مشورہ دیا کہ سانپوں کو نوجوانوں کا خون پلاؤ۔ دنیا بھر کے آمر آج تک ضحاک کی اس حدیث پر عمل پیرا ہیں اور کاوہ آہن گر کے پیرو عوام کو نجات دلانے میں مصروف اور

ے ان دونوں میں رن پڑتا ہے
بنت بستی بستی نگر نگر

کاوہ نے اپنی چمڑے کی جیکٹ سے جھنڈا بنالیا۔ جسے درفش کاویانی کہتے ہیں۔ بعد میں آنے والے بادشاہوں نے اس جھنڈے کو اپنا لیا۔ اس پر ہیرے ٹانکنے لگے۔

حکمران ہمیشہ سے یہی کرتے آئے ہیں۔ انقلابیوں کا ڈنک نکال کر انہیں اپنا لو۔ ان کے مزاروں پر قوالیاں کراؤ۔ اشفاق احمد کہ 'خلط مبحث' کا بادشاہ ہے (King of Confusion) انقلابی فیض کو 'ملامتی صوفی' کہتا ہے کیونکہ انقلابی کی بجائے صوفی حکمرانوں کو قبول ہیں۔ ان کے مزاروں پر ننگے پاؤں جاتے ہیں۔ صوفی ازم کے فروغ کے لیے بورڈ بناتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے درفش کاویانی کا انجام کیا ہوا؟ عرب فاتحین نے کہ غیر جذباتی اور عملی لوگ تھے، وہ جھنڈا جلا دیا۔ جلانے سے پہلے احتیاطاً ہیرے اتار لیے۔

ایران کا ایک اور سوشلسٹ پیغمبر مزدک تھا۔ اسے بھی عوام کی جانب داری کے سنگین جرم پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔۔۔

اس تمام روایت پر فیض کی گہری نظر ہے۔ اس نے دورِ جدید کے فلسفہ۔۔۔ دنیا کو بدلنے کا فلسفہ۔۔۔ کا علم بھی سبقاً سبقاً فضل الٰہی قربان کے سٹڈی سرکل میں پڑھا۔

پنجابی، اردو، انگریزی، فارسی ادب کو اچھی طرح کھنگالا۔ اگر وہ حافظ اور سعدی اور مغرب کے دانش کے سوتوں سے فیض یاب ہوا تو میر اور غالب اور دوسرے اساتذہ سے بھی مستفیض ہوا۔ (غالب اور میر البتہ بدقسمت ہیں کہ اقبال اور فیض کو نہ پڑھ سکے)

جدید اور قدیم علوم میں شناوری کر کے اس نے عالم پیر کی کہاوت کی ثنا خوانی نہیں کی۔ آس میں، زندگی بھرنے کی جہد کی جیسا کہ حافظ نے کہا ہے۔

ع عالم پیر دگر بارہ جوان خواہد شد

یا خواجہ فرید کا ارشاد ہے۔

ع جھوکاں تھیسن آباد ول

وہ عمل کا آدمی تھا اور ن۔ م راشد کی طرح سوچتا تھا۔

ے میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی

یہ سوچنے والے انسان کا مجموعہ خیال، اک عملِ پیہم ہے۔ اس کا ذہن سوال کرتا ہے۔

ے کیا تیرے اذن سے کا ئیل کی خو قائم ہے
کیا یہ خو تا ابد میرا مقدر ہو گی

(ضیا جالندھری)

راشد کہتا ہے۔

خدا سے بھی علاج دردِ انساں ہو نہیں سکتا

اور پنجاب کا ان پڑھ کسان بھی کہتا ہے۔

بندہ ای بندے دا دارو ہندا اے

اگر انسانوں نے ہی انسانوں کے مسئلے حل کرنے ہیں تو Humanism بھی سمجھ میں آتا ہے، مارکسزم بھی، فیض احمد فیض میں

ے اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رَن سے بلاوے آتے ہیں

جب اس کا ذہن صاف ہو گیا تو پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گومگو کا شکار نہیں

ہوا۔ اس کا ذہن صاف تھا، اس کا مقصد واضح تھا، روشن تھا۔ کہتے ہیں اندھیرا تو برا ہے ہی، جھٹ پٹا اندھیرے سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ ہمیں آہستہ آہستہ اندھیرے کا عادی کر دیتا ہے۔ یہی سرکاری ادیبوں کا فرضِ منصبی یا Nature of Job ہے۔ معاملات کو دھندلا دینا، الجھا دینا۔ کسی میراثی سے کسی نے کربلا کے معرکہ حق و باطل کی نسبت سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔

''اساں شوہدے میراثی، سانوں کی حسیناں پاکاں نال یاں
یزیداں پاکاں نال''

عصرِ جدید کے ساتھ ساتھ لوگ روحِ عصر یا Zietgeist کی بات بھی کرتے ہیں۔ میں رُوح پر زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس ایک کہانی سنانی مطلوب ہے۔

ایک تھے پروفیسر قیوم نظرؔ۔ مل ملا کر کسی وفد کے ساتھ پیرس پہنچ گئے۔ دوستوں کی ہدایت کے مطابق ایفل ٹاور اور نائیٹ کلب تو ایک ہی دن میں بھگتا دیے اور پھر سفارت خانے کے پیچھے پڑ گئے کہ سارتر سے ملاقات کراؤ، اچھا C.V بن جائے گا۔ ان لوگوں نے بصد مشکل پندرہ منٹ کی ملاقات کرا دی۔ پروفیسر صاحب کو عزت سے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ سارتر سے اردو کے قاری ناواقف نہیں۔

وجودیت کے فلسفے کا ایک بڑا نام ہے۔ الجزائر کی جنگِ آزادی کی بہت شدّ ومدّ سے حمایت کی۔ فرانس کے عمّال حکومت اسے قید کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جنرل ڈیگال سے اجازت طلب کی کہ وہ اس وقت فرانس کا صدر تھا اس نے منع کر دیا اور وہ تاریخی جملہ کہا:

''میں فرانس کو کیسے قید کر سکتا ہوں؟ سارتر فرانس ہے۔''

سارتر، پروفیسر صاحب سے ملنے اندر آیا، ہاتھ ملایا، خیریت دریافت کی اور کہا:

''پروفیسر صاحب، جنگِ ویت نام کے بارے میں آپ کی
کیا رائے ہے؟''

جواب ملا: ''ہم ادیب لوگ ہیں، ہمیں ویت نام سے کیا لینا دینا۔''

سارتر نے احتراماً کھڑے ہو کر پروفیسر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ خدا حافظ کہا، Sorry یہ میٹنگ جاری نہیں رہ سکتی۔

سارتر واپس اندر چلا گیا۔ لاہور پہنچ کر پروفیسر صاحب بہت کلپے۔ فرانسیسیوں، بالخصوص سارتر کی بدتمیزی کا ذکر ہر ملنے والے سے کرتے رہے تا آنکہ دوستوں نے سمجھایا کہ حقیقت اس میں تنقیص آپ کی ہوتی ہے۔ چپکے ہو رہے دل ہی دل میں مغرب کو گالیاں دیتے رہے۔

مشہور ادیب، براڈ کاسٹر حمید نسیم نے ذکر کیا ہے کہ میں نے فیضؔ صاحب کو ایک شعر سنایا:

؎ وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی نفرت خود سے
اک نظر تم مرا قیوم نظر دیکھ تو لو

فیضؔ صاحب ہلکا سا مسکرائے۔ فرمایا کسی کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔ جدیدیت کا ایک جزو Playfullness بھی ہے۔ اس لیے یہ قصہ آپ کے گوش گذار کر دیا۔۔۔ روحِ عصر کی بات بھی اس میں آ گئی ہے۔

ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کا یہ حق ہے کہ پرانے ادب اور تاریخی واقعات کو، آج کی نظر سے، آج کی بصیرت سے پرکھے۔۔۔ میرؔ جب کہتا ہے:

ع مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

تو کیا یہ وہی رویہ نہیں جو سارتر نے اپنایا۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپانا، ادب کا منصب نہیں۔ اپنی نئی بصیرت سے شاعر۔۔۔ مروجہ Form میں نئے رنگ نئے آہنگ بھرتا ہے۔ فیضؔ کی نعت کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

؎ باید کہ ظالمان جہاں را صدا کند
روزے بسوئے عدل و عنایت تو

اسی حوالے سے فیض کا مرثیہ امام غور طلب ہے:

اک گوشے میں ان سوختہ سامانوں کے سالار
ان خاک بسر، خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار
اس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار
مسند تھی نہ خلعت تھی نہ خدام کھڑے تھے

جیشِ باطل آئی۔

پر باندھے ہوئے حملے کو آئی صفِ اعداء
تھا سامنے اک بندۂ حق یکہ و تنہا

ان حالات میں خطبہ کیا ارشاد امامِ شہدا نے توجہ طلب:

فرمایا کہ کیوں درپئے آزار ہو لوگو
حق والوں سے کیوں برسرِ پیکار ہو لوگو
واللہ کہ مجرم ہو گنہ گار ہو لوگو
معلوم ہے کچھ کس کے طرف دار ہو لوگو

کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے طلبگار

انصاف کے، نیکی کے، مروّت کے طلبگار
ظالم کے مخالف ہیں تو بے کس کے مددگار

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں، منکرِ دیں ہے

یہی وہ سوال ہے، جو تاریخ ہر شاعر سے، ہر ادیب سے، ہر انسان سے پوچھتی رہتی ہے۔۔۔اے اہلِ قلم تم کس کے ساتھ ہو؟

ع معلوم ہے کچھ کس کے طرف دار ہو لوگو

فیض نے اپنی طرف داری اس تقریب میں واضح کی ہے جو اس نے ماسکو میں منعقدہ لینن امن انعام کی تقریب میں بزبانِ اردو کی تھی۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنون اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہیں۔

اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق، ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے۔۔۔لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔

انسانیت کی ابتدا سے اب تک، ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کش مکش آج بھی جاری ہے۔

دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں امنِ آدم کی بقا اور فنا۔

اب سے پہلے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز موجود تھا۔۔۔

اب انسانی عقل، سائنس اور معذرت کی بدولت۔۔۔ سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔۔۔ بشرطیکہ قدرت کے بے بہا ذخائر۔۔۔ جملہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لائے جائیں۔

ایک طرف سامراجی قوتیں ہیں۔۔۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنہیں۔۔۔ انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہے۔

غرض کئی محاذوں پر، کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب، انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔۔۔

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت، جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی مار نہیں کھائی ہے، اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔''

یہ ہے فیضؔ کا مقصدِ حیات، اسی دھن میں عمر گزار دی۔

شاعر کا کام کیا ہے؟ یہ بھی فیضؔ کی زبانی سن لیجیے۔

''غالبؔ نے لکھا تھا جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی، دیدۂ بینا نہیں ہے، بچوں کا کھیل ہے۔'' (مگر) شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ شاعر یا ادیب کو دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔

ادیب خود بھی اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رخ، اس کے بہاؤ، اس کی ہیئت اور س کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑی ہے۔

فیضؔ تمام عمر اسی فلسفے پر عمل پیرا رہا، آخری سانس تک ریلوے یونین، پوسٹ مین یونین، پرورش لوح وقلم، پاکستان کے بہترین اخبارات۔۔۔ پاکستان ٹائمز امروز، لیل ونہار کی چیف ایڈیٹری، نام نہاد راولپنڈی سازش کیس، قید و بند، تنہائی، بازار میں پا بجولاں، دنیا بھر کے غم اپنانے کا عزم، ایرانی طلبہ کا نوحہ، روزن برگ جوڑے کا مرثیہ، انسانی بھائی چارہ،

سانجھا انقلاب، فلسطینی پرچے کی ادارت اور اس دور میں بھی خیال سوئے وطن رواں، سمندروں کی ایال تھامے، افریقی جدو جہد کی دھمال نے اس کے لہجے کو گھن گرج دی۔ میجر اسحاق کی یاد میں بھی وطن کے لیے تڑپ۔۔۔ ہر خار رہِ دشت وطن کا ہے سوالی۔۔۔ کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور۔

فیضؔ نے کہا تھا:

ع کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں

جہاں نے بھی فیضؔ کو اپنا لیا۔ ملکوں ملکوں فیضؔ کا نام زندہ ہے۔ تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لینن پیس پرائز کا حق دار ٹھہرا۔ یاسر عرفات نے لکھا

''سلام انقلابی کے بعد۔۔۔

فلسطینی عوام نے آپ کی ذات میں ایک ترقی پسند اور اس کے لیے جدو جہد کرنے والا شاعر پایا ہے۔ آپ ایک عوام دوست انسان ہیں۔

آپ کی مخلصانہ اور صداقت پر مبنی شاعری جس میں فلسطینی عوام کا ذکر ہے اور خاص طور پر ان کے بچوں اور انقلابیوں کا تذکرہ ہے۔ عدم آباد تک ایک ایسا نمونہ پیش کرتی رہے گی جس سے برادرانہ صداقت اور مخلصانہ محبت اُجاگر ہوتی ہے۔

بہترین تمناؤں اور احترام کے ساتھ اور اس نعرے کے ساتھ

''انقلاب فتح تک''۔۔۔ آپ کا مخلص یاسر عرفات۔

جس راہ پر فیض چلا، وہی دیس دیس کے انقلابیوں کی راہ ہے۔ اس کی زبان ہی سب کی زبان ہے۔

ے یہی قصہ ملکوں ملکوں دہرایا جاتا ہے
ہر زباں باچنگ ونے بر سرِ بازار دگر

فیضؔ نے وطن سے ٹوٹ کر پیار کیا۔

ے چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

اس نے حبِ وطن کے بھی تقاضے پورے کیے۔

ے واپس نہیں پھرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی

اور ایک اچھی اور بھرپور زندگی گزارنے کے بعد وہ اطمینان سے کہہ سکتا ہے۔

ع ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

ooo

فیضؔ کا فلسفۂ انقلاب

بعض اوقات جرنیل بھی عقل کی بات کر جاتے ہیں۔ ڈی۔ گال فلاسفر نہ تھا۔ عمل کا آدمی تھا۔ اس نے کہا ہے:

''غور و خوض بہت سے لوگ مل کر کرتے ہیں۔ عمل فردِ واحد کرتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اس انتظار میں عمل نہیں کرتے کہ پہلے اپنا فلسفہ تشکیل دے لیں پھر دیکھیں گے یا اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اب کی بار من و سلویٰ آسمان سے گرے تو ساتھ فلسفے کی ایک کتاب بھی ہو۔۔۔خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔

فردِ واحد فلسفے کی تخلیق نہیں کرتا۔ مارکس نے اپنے سے پہلے آنے والے ہر بڑے فلسفی کو پڑھا۔ سبقاً سبقاً۔۔۔ طالب علم کی طرح۔ پھر اپنے اردگرد کے مشاہدات اور اپنے زمانے کے عمل کی تلخیص، موجود فلسفے میں شامل کی۔ نتیجتاً جو ملغوبہ سامنے آیا۔ مارکس کا فلسفہ کہلایا جو رایا دوناافسکا یا کے بقول ہیگل کی جدلیات کی مادیت ہے۔

اب جو فیضؔ کے فلسفے کی ڈھنڈیا پڑی ہے تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ اردو کے عظیم ترین شاعر اقبالؔ کو بھی ہم نے فلسفی اور علامہ بنا دیا ہے۔ اقبالؔ نثر لکھنا بھی جانتا تھا، فلسفی

بننے کا شوق ہوتا تو نثر میں طبع آزمائی کرتا، وہ تو شاعر تھا اور اس طرح کے خوبصورت شعر کہتا تھا:

ے نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشین مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

کہ طبع شاعر کا وطن اس کے سوا اور نہیں۔ اقبالؔ کی غزلیں پڑھیے، اگر اللہ توفیق دے۔ ہم نے اسے پہاڑوں کی چٹانوں سے باندھ دیا ہے۔ کیا فیضؔ کا حشر بھی اقبالؔ جیسا ہونے والا ہے کہ ہر مقرر اور مُلّا کے ہاتھ چڑھ جائے۔

کیا فیضؔ نے الگ سے کوئی اپنا فلسفہ گھڑ لیا ہے۔ ویسے تو ہر شخص فلسفی ہے۔ ان پڑھ ساس، نئی بیاہی دلہن سے کہتی ہے 'اے کڑیے، تو کیوں روز منہ دھونے بیٹھ جاتی ہے، ہمارے ہاں یہ رواج نہیں' یہ اس خاتون کا فلسفۂ حیات ہے۔ جس طرح عورتوں کو زندہ دفن کرنا اور کتوں سے پھڑوانا، ہمارے وفاقی وزراء کا فلسفۂ حیات ہے۔۔۔ مگر ہم شاید زیادہ انسانی سطح پر گفتگو کر رہے ہیں؟

فلسفہ تو زندگی کے مجموعی ادراک کا نام ہے۔ نسل در نسل، انسانی تجربات، انسان کے شعور میں داخل ہوتے جاتے ہیں تا آنکہ کوئی نابغہ اس تجربے کو پہلے سے موجود عقل کے بھنڈار میں شامل کر دیتا ہے اور ایک نئی تشکیل کو اپنی سوچ کا حصہ بنا کر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ نئے تجربات نئی تشکیل کے طالب ہوں۔

فیضؔ تو جوانی سے ہی، ہر ایمان دار نوجوان کی طرح اپنے عہد کے فلسفے سے۔۔۔ جو تھا بھی انقلاب کا فلسفہ۔۔۔ متاثر تھا۔ اس نے اس کو سیکھا، اس کی تعلیم حاصل کی، کہ کوئی علم سیکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور فلسفہ تو سب سے اعلیٰ علم ہے۔ اس کی تعلیم ان مدرسوں میں ہوئی جو Study Circle کہلاتے تھے۔ اس کے استاد فضل الٰہی قربان اور دوسرے انقلابی لوگ تھے۔ اسی تعلیم کو اس نے حرزِ جاں بنایا اور تمام عمر اس پر عمل کیا تا کہ انقلاب کی منزل قریب آ جائے۔ یہ وہی فلسفہ ہے جس سے 20ویں صدی عبارت ہے۔

فیضؔ کا فلسفہ یا وہ فلسفہ جس پر فیضؔ عمل پیرا رہا، اس کی شاعری اور اس کی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ وہ فلسطینی مجاہدوں کا پرچہ بھی ایڈٹ کرتا ہے اور پوسٹ مین یونین اور ریلوے مزدوروں کی یونین میں بھی کام کرتا ہے۔ فیضؔ کا فلسفہ، فیضؔ کی زندگی اور فیضؔ کی شاعری میں ڈھونڈنا پڑے گا۔۔۔ خوش قسمتی سے فیضؔ کا کلام، زمانی ترتیب سے نسخہ ہائے وفا میں ملتا ہے۔ تو آیئے فیضؔ کا جائزہ لیں۔۔۔ وہ جسے اختیاری زبان میں کہتے ہیں۔۔۔ مہ و سال کے آئینے میں۔

اوائل جوانی میں، کچھ الجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے۔۔۔ اور جب کٹھور دنیا کا ادراک ہوا تو پتہ چلا کہ

ے موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

لیکن جوانی کا جوش قائم تھا۔۔۔

ع گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

پھر راستے کی مشکلات اور مایوسی، جس میں سے ہر سالک گزرتا ہے۔

ے ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم

یہ ہے فلسفے کا پہلا سین کہ انسان ہی انسان کا راہ نما ہے۔ یہ دنیا کیوں ہے؟ کیا ہے؟ اس میں اتنے بہت سے دکھ کیوں ہیں؟ یہ سوالات اور دل و نظر کی وہ پاکیزگی جو دنیا داری میں الجھنے سے پہلے ہر نوجوان دل میں ہوتی ہے۔ مل کر اس جذبے کو جنم دیتے ہیں۔

ے کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں

اور پھر وہ سبق فلسفے کا، جو پڑھا تھا اپنے استادوں سے

ے بے فکرے دھن دولت والے

یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں

ان کا سکھ آپس میں بانٹیں

پھر اپنی دھرتی سے عشق ہوا۔ اپنی دھرتی کے باسیوں کی طرف نظر لوٹی۔

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی۔ جب وطن کی درگاہ میں حاضری دی تو پتا چلا کہ کیسے فردِ واحد کو اجتماع کے سامنے بیس نوانا ہے، ذات کی نفی ہوئی۔

ے سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی

ربِ کریم ہے تو تری راہ گزر میں ہے

ساتھ ساتھ انقلابی رجائیت، جو اسے اس فلسفے نے عطا کی جس کا وہ تلمیذ تھا۔

ع چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز

دنیا پر نظر ڈالی، ہر ملک میں، ہر براعظم میں عظیم جدوجہد میں جاری تھیں، دیکھا تو حوصلہ بڑھا۔ وسیع تر انسانیت پر نظر ڈالی تو جابروں کا خوف ختم ہوا۔

ے کھلنے لگے قفلوں کے دہانے

پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

اور پھر فیض۔۔۔ فیض بن گیا اور اب فیض نے بولنا شروع کیا تو انگریزی محاورے کے مطابق The rest is history

ع بول کہ سچ زندہ ہے اب تک

جدوجہد میں شریک ہوا تو سفر کی مشکلات کا ادراک ہوا۔

ع پھر نورِ سحر، دست و گریباں ہے سحر سے

فیض نے کہا: ''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔''

''ادیب خود بھی اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے، اس کے معنی یہ ہے کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رخ، اس کے بہاؤ، اس کی ہیئت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑی ہے۔''

یہ ہے Humanism کا نعرہ جو Maxxism سے پہلے کا فلسفہ ہے۔ انسان ہی انسانی دکھوں کا مداوا ہے کوئی غیر انسانی چیز نہیں۔

اور پھر ع خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

کی سٹیج آ گئی۔

وقت گذرا۔۔۔ پاکستان بن گیا۔۔۔ آج کا موضوع مطالبہ کرتا ہے کہ فیض کے فلسفۂ انقلاب کو پاکستان کے ساتھ جوڑا جائے، فیض کا آدرش اور فیض کے سپنے وہی تھے جو غیر ملکی غلامی میں تڑپنے والے انسان کے تھے۔ ایک بہتر زندگی کے خواب، ایک بہتر مستقبل کے خواب، مگر اس کے خواب چرا لیے گئے۔ ہر حساس انسان کی طرح اس نے بھی دیکھا کہ پاکستان جو کروڑوں مظلوموں کی حسرتوں اور تمناؤں اور خوابوں کی تعبیر تھا، زرداروں اور زرداریوں کی شکارگاہ بن گیا۔

ع یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے۔۔۔ اور یہ کہ ابھی گرانئ شب میں کمی نہیں آئی۔

چلو، چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔۔۔ اور پھر چلا چل ایک جاندار فلسفہ تو اس کے پاس موجود تھا، اسی کے مطابق عملِ پیہم کرتا رہا آخری سانس تک۔۔۔ ریلوے یونین، پوسٹ مین یونین، پرورشِ لوح و قلم، پاکستان کے بہترین اخبارات کی چیف ایڈیٹری، جھوٹا راولپنڈی سازش کیس، قید و بند، تنہائی، پابجولاں بازار میں، دنیا بھر کا غم اپنانے کا عزم، ایرانی طلبہ کا نوحہ، روزن برگ جوڑے کا مرثیہ، انسانی بھائی چارہ سانجھا انقلاب، فلسطینی پرچے کی ادارت،

جلاوطنی میں بھی قیامِ بیروت میں بھی، خیال سوئے وطن رواں تھا، سمندروں کی ایال
تھامے۔۔۔ دوست دشمن کی پہچان ہوئی کہ مارکسزم کا مغز ہے۔ لینن امن انعام۔۔۔ افریقی
جدوجہد کی دھمال نے اس کے لہجے کو گھن گرج دی۔

انہی چند پہلوؤں میں فیض کا فلسفۂ انقلاب پاکستان کے حوالے سے، پوشیدہ
ہے۔ جدوجہد کا عزم ہے۔۔۔ یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک۔۔۔ قربانی کا جذبہ ہے۔
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے۔ فروغِ گلشن وصوتِ ہزار کا موسم اور یہ کہ ہمیں
سے سنّتِ منصور وقیس زندہ ہے۔

اور۔۔۔ اور۔۔۔ حوصلہ

ہم بھی دیکھیں گے

یہ حوصلہ، وہ حوصلہ ہے جو نظریاتی ساتھ سے اور فلسفے کی سانجھ سے ملتا ہے۔۔۔
اور عمل سے۔ جس کسی نے مزدوروں کا بپھرا ہوا جلوس نہیں دیکھا یا اس میں شامل نہیں ہوا وہ
اس جذبے کو نہیں سمجھ سکتا۔

ع ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے۔۔۔ بشرطیکہ وہ طبقاتی دوست ہو، دشمن نہ
ہو، یہ امتیاز، یہ تقسیم ہر جدوجہد کا بنیادی عنصر ہے۔

ے جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

فیض نے وہ diction ایجاد کی جو اسی کا حصہ ہے اور پھر عشقِ مجازی سے گزر کر
عشقِ حقیقی کا کشف۔۔۔ ذات سے بڑھ کر وہ معاشرہ ہے، وہ وطن ہے جس کے آپ
باسی ہیں۔

ے چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

اور پھر

ے اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

مگر اس کا بدلہ معصوم جانوں سے نہیں لیا۔ اپنی جان پر ہونے والے ظلم کے
بدلے میں بچیوں کے سکول نہیں جلائے۔ اس لیے وہ کہہ سکتا ہے۔

ع ہر داغ ہے اس دل میں، بجز داغِ ندامت

انقلابی رجائیت کبھی بھی، کسی موڑ پر بھی فیض کا دامن نہیں چھوڑتی۔

ے یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہیں ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

روز روز کے بے دردی اور باوردی فرعونوں کے باوجود

ع نثار میں تری گلیوں کے

ایملکار کرال کے بقول آپ چاول بغیر دیگچی کے نہیں پکا سکتے، انقلاب کرنا ہے تو
انقلاب کے لیے ایک وطن بھی چاہیے اور شدید حبِ وطن، جس کے لیے کسی منافق سے سند
لینے کی ضرورت نہیں۔ ہر زماں، انسان دوستوں اور انسان دشمنوں میں رن پڑتا ہے۔۔۔
نت بستی بستی، نگر نگر۔ اپنے طبقاتی دوست اور دشمن پہچانو اور مظلوموں کی نجات کے لیے جان
لگا دو۔

یہ ہے فیض کا فلسفۂ انقلاب، پاکستان کے لیے۔

ooo

دہشت کی سیاست

دہشت گرد آسمان سے نہیں ٹپکتے۔ نہ ہی ان کے لیے ہدایات آسمان سے برستی ہیں، مگر ہدایات بہر حال آتی ہیں۔ خود سے تو کوئی گھر سے خود کش جیکٹ پہن کر نہیں نکلتا۔

کسی نہ کسی نے اسے اپنی جان کے ضیاع پر آمادہ کیا ہے، دوسروں کی جان کو بے قیمت سمجھنے کی تعلیم دی ہے۔ خود کش حملے کے تکنیکی مراحل سکھلائے ہیں۔ لوگوں کو دھوکہ دے کر ان میں گھس جانے کے طریقے پڑھائے ہیں۔

ان کے انسٹرکٹروں اور اُستادوں کو کون نوکری دیتا ہے؟ کون ان کے لیے فنڈ اکٹھے کرتا ہے؟ کون ان کے لیے، معاشرے کے پڑھے لکھے اَن پڑھوں کے دِل میں نرم گوشہ پیدا کرتا ہے۔ کون عام لوگوں کو یہ اُمید دِلاتا ہے کہ اسلام کے نام پر بدمعاشی اور جرم کرنے سے اسلام کا بول بالا ہوگا اور اسلام دُنیا پر چھا جائے گا؟ کون انھیں بے تحاشہ بچے پیدا کرنے پر اُکساتا ہے کہ اس طرح غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ مکھیوں اور مچھروں کی طرح؟

اس سارے عمل میں کن لوگوں کا، کس طبقے کا مفاد ہے؟ ان کے شکار طبقات کون سے ہیں؟ ان کے ہمدرد اور پشت پناہ کون ہیں، ہمارے اپنے معاشرے میں دُنیا میں؟

پاکستان میں امن و امان خراب کر کے، خوف کی فضا پیدا کرنے میں، عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے خلاف، جہاد میں کیا مصلحت ہے، کس کا مفاد ہے؟ مذہبی، سیاسی جماعتوں کا اور دہشت گرد تنظیموں کا مفاد ایک کیوں ہے؟ ایجنڈا ایک کیوں ہے؟ ہمارے بکروں کی کھالوں کا پیسہ، ہماری کھالیں اُتارنے کے لیے تو استعمال نہیں ہو رہا؟

؎ زید کا کام خوب چلتا ہے
اے خدا تیرا نام چلتا ہے

؎ ہر مُلک، مُلکِ ماست
کہ مُلکِ خدائے ماست

سے اقبال نے ابتدا کی، اس سے بہتر الفاظ میں مُلک گیری کا فلسفہ آج تک کسی نے بیان نہیں کیا۔

''ہر مُلک خدا کا مُلک ہے۔ خدا ہمارا ہے، اِس لیے بھی مُلک ہمارے ہیں۔''

جب اس فلسفیانہ خیال کو، عام لوگوں، اَن پڑھ لوگوں کی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔۔۔اور مسلمانوں کی اکثریت اَن پڑھ ہے۔۔۔ تو خدا کی خدائی اور ہوسِ مُلک گیری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔۔ یہ ہوس تو وہ کرے، جس کے پلّے دام ہو، جس کو مال و دولت میں، اسلحے میں، علم میں، سائنس میں برتری حاصل ہو۔ جو قوم ہمہ وقت، اپنی غربت اور مظلومیت کا رونا روتی ہو وہ کس برتے پر، دُنیا فتح کرنے نکلی ہے۔ ذاتی سطح پر تو بدمعاشی، بعض اوقات، منفعت بخش ہوتی ہے۔ معاشرتی سطح پر، ملکی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر بدمعاشی اتنی آسان نہیں۔ ہٹلر کی نہ چل سکی حالانکہ وہ اپنے زمانے کی مہلک ترین جنگی مشین کا مالک تھا۔

غریب ممالک کی ایجنسیوں کی خیرات سے تو سلطنتیں وجود میں نہیں آتیں۔ ہاں اس شوق میں اپنے ہاتھ جل جاتے ہیں۔ اپنی قوم، اپنے مُلک کا ستیاناس ضرور ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک بدمعاش گالی دے کر، بڑھک لگا کر خود کو بہت طاقتور سمجھتا ہے مگر پولیس کے

ایک سپاہی کے سامنے اس کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے اور وہ محکمہ پولیس میں ہی اپنا کوئی سرپرست ڈھونڈ لیتا ہے۔ اسی طرح دہشت گرد بھی۔ ناجائز حکمرانوں کی جھولی میں جاگرتے ہیں اور محنتی اور غریب لوگوں کی جان عذاب میں ڈالتے ہیں۔

دہشت گرد گروہ دراصل کمزور ہوتے ہیں اور طاقت کے زُعم میں حماقتوں پر حماقتیں کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مارکس اور لینن نے کہا:

> "یہ ان پڑھ، جاہل غریب لوگوں کا جذبہ برتری (کہ جذبہ کمتری کی بڑھی ہوئی شکل ہے) ہے۔ سارے زمانے کے جوتے کھاتے ہیں، اپنی مرضی کا کپڑا پہن نہیں سکتے، کتاب پڑھ نہیں سکتے، لوگوں کے کہنے پر اپنی ماؤں بہنوں کو قید کرتے ہیں، امیروں کے حرم بھرنے کو اپنی شان سمجھتے ہیں اور خود کو فاتحِ عالم تصور کرتے ہیں۔"

پاکستان میں ان کے سرپرست کون ہیں:

i۔ مذہبی جماعتیں۔

ii۔ خفیہ ایجنسیاں، جو اپنے غیر قانونی کام، ان 'پرائیوٹ' جتھوں سے نکلواتے ہیں۔

iii۔ ہمسایہ دُشمن ممالک۔۔۔۔ وہ بھی اپنے غیر قانونی کام انھی پرائیویٹ جتھوں سے نکلواتے ہیں۔

iv۔ نااہل حکومتیں، جو اپنے عوام کو تحفظ فراہم کرنے سے قاصر ہیں اور ان نااہلوں سے غماز کرتے ہیں اور بہانہ مذہب کی پاسداری کا بناتے ہیں۔

v۔ بھٹکے ہوئے بائیں بازو کے لوگ۔

جو اس غریب کشی میں طبقاتی جدوجہد ڈھونڈتے ہیں، جو حکومت وقت کی مخالفت میں شیطان سے متحدہ محاذ بنانے کے فلسفے کے پیرو کار ہیں۔

vi۔ بزدل دانشور۔ جو دہشت گردوں کی مخالفت کی ہمت نہ پا کر ان کی موجودگی کا جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ مثلاً فلسطین میں ظلم، بارش کی کمی، لوڈ شیڈنگ کی زیادتی وغیرہ۔

The Birth of a Nation

کوئی چوتھائی صدی پرانی بات ہے۔ چین کے وزیراعظم نے البانیہ کا دورہ کیا۔ دونوں کیمونسٹ ممالک تھے۔ آپس میں گہری دوستی تھی، انور خواجہ نے چواین لائی سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے اور چینی البانوی بھائی بھائی کے جذبے کے اظہار کے لیے جو نعرے لکھوائے وہ بہت دلچسپ تھے۔ ان میں سے ایک تھا "ہم اور چینی 70 کروڑ ہیں" یاد رہے کہ البانیہ کی آبادی لاکھوں میں تھی۔

انداز بیان میں تھوڑا غلو انسانی کمزوری ہے، عاشق اور معشوق، تیری میری اک جندڑی اور یک جان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، فارسی محاورے میں البتہ یہ احتیاط برتی گئی ہے کہ یک جان کے ساتھ دو قالب کا ذکر ہے۔ ویسے پنجابی محاورے میں بھی اپنے مخصوص انداز میں یہ اضافہ ہے "تینوں تاپ چڑھے، میں ہونگاں۔" یعنی بخار تجھے چڑھے، کراہوں میں! جیسے شہر کے مشہور ڈنٹسٹ ڈاکٹر سلیم دانت نکالتے ہوئے کہتے ہیں "اگر تکلیف محسوس ہو تو انگلی کھڑی کر دینا، چیخ میں ماروں گا۔"

یک جان ہونا اور دو قالب ہونا دونوں ہی زندگی کی حقیقتیں ہیں علیحدگی اور ادغام۔ دن اور رات، دونوں ہیں تو وقت ہے۔ روشنی اور اندھیرا دونوں ہیں تو اشکال ہیں، نیکی اور

بدی دونوں ہیں تو اخلاق کا تصور ہے، غیر ملکی فاتح اور ملکی جاں نثار ہیں تو حبِ وطن کا تصور ہے، انسان کی الگ ذات اور اجتماع (قبیلہ، قوم وغیرہ) ہے تو معاشرتی زندگی ہے۔

یہ بات ہے اجتماع کی، معاشرے کی قوم کی۔۔۔ مگر ایسے معاشرے بھی گزرے ہیں جن کے سر پر کوئی فرعون، کوئی شہنشاہ، کوئی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بیٹھا تھا۔ ایسے معاشرے میں رہنے والے انسان، انسان سے کچھ کم تھے۔ پاکستانیوں سے بہتر کون جانتا ہے کہ فوجی آمریتوں کی وجہ سے قوم کی کیا حالت ہوتی ہے، افراد کی کیا حالت ہوتی ہے، اخلاق کس قدر گر جاتے ہیں، ایمان داری اور سچ غائب ہو جاتا ہے، منافقت پرورش پاتی ہے، مجرم اخلاقی درس دیتے ہیں، قاتل وعظ نصیحت کرتے ہیں، رشوت خور ایمان داری کے فوائد بتاتے ہیں غرضیکہ انسانی مواد (Human Stuff) دو نمبر ہو جاتا ہے۔ وجہ وہی 'Individual' (کوئی ڈھنگ کی اردو اصطلاح بھی اسی لیے اس لفظ کے لیے نہیں ہے کہ صدیوں کی غلامی رہی، آزادی ملی تو جاہ پرستوں نے چھین لی۔ ''شخص'' کو اس معنی میں استعمال کریں تو بات اس طرح بنتی ہے) ''شخص'' اجتماع میں گم ہو گیا، بے نشاں ہو گیا، بے وقار ہو گیا، کسی نے انسان کی ذات کی تعمیر پر زور نہ دیا تعمیر تو بڑا لفظ ہے یہاں تو بنیادی تعلیم تک نہ دی گئی۔ (یہاں ذات کا لفظ چوہڑے، فقیر، سید، ارائیں، راجپوت اور جاٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے ہماری عقل نے ''اتنی ترقی کی ہے'') جزو بہتر ہو گا تو کل بہتر ہو گا، گلی سڑی سبزیوں سے دنیا کا سب سے اعلیٰ باورچی بھی اچھا سالن نہیں بنا سکتا۔

''قطرے کا اعزاز بڑا ہے''

اے قطرے طوفان نہ ہونا

ہمیں اجتماع میں غرق ہونے کا اتنا (شوق) ہے کہ کبھی اپنے آپ کو آریائی بتاتے ہیں، کبھی عظیم ہندوستانی تہذیب کے گن گاتے ہیں، کپڑے کے ٹکڑوں سے بنی رضائی (رلی) کی طرح ہمارے درسی کتابوں کے ہیرو بالترتیب عرب، بھارت، افغانستان، عراق، ترکی،

ایران، سوڈان وغیرہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سنا ہے ایٹمی دھماکے کے بعد ہم عالمِ اسلام کے لیڈر بن گئے ہیں۔ عالمِ اسلام کو پوچھے بغیر۔ ''مان نہ مان، میں تیرا رہبر''۔ خوشی کی بات ہے کہ اس طرح کی احمقانہ باتیں صرف دو چار لوگوں نے کی ہیں۔ ننانوے فی صد لوگ اس ایٹم بم کو نواز شریف کی طرح پاکستانی بم تصور کرتے ہیں، جو پاکستانی سائنس دانوں، ماہرین اور فوجیوں کی شب و روز محنت کا نتیجہ ہے۔ جس میں مسلسل کئی حکومتوں کا ملکی دفاع کے بارے میں مثبت رویہ شامل ہے۔ جس میں پوری قوم کی محنت کی کمائی شامل ہے اور جو ہماری قوم، ہمارے ملک کے دفاع کے لیے بنایا گیا ہے، جس کی مخالفت معدودے چند لوگوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے کی ہے، منطق سے نہیں، ملکی فائدے کے لیے نہیں، مستقبل کی نسلوں کے لیے نہیں (اچھے برے مل کر ہی اکائی بناتے ہیں۔) سوائے خرچے کے کسی نے کوئی ڈھنگ کا اعتراض نہیں کیا۔

دنیا کی کوئی بھی ایسی چیز جو اس قابل ہے کہ اس کے حصول کے لیے کوشش کی جائے اپنی ایک قیمت رکھتی ہے، اس کا ایک مول ہے، یوں نہیں ہوتا کہ انگریزی محاورے کے مطابق کیک کھا بھی لو اور بچا بھی لو۔

پاکستان کے لیے پاکستانی قوم کے لیے، عزت کے لیے، وقار کے لیے، شان کے لیے، مستقبل کے لیے، بچوں کے لیے۔۔۔ کوئی بھی قیمت زیادہ قیمت نہیں، اس قیمت کو روپوں اور ڈالروں میں نہیں، اپنی جانوں سے چکانا ہو گا۔ ملک بچے گا تو قوم بچے گی۔ قوم ہو گی تو ملک کو بچائے گی۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور یہ حقیقت اسی ایٹمی شعلے نے روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی ہے، جو پاکستان کے سب سے بڑے صوبے بلوچستان میں 28 مئی 98ء کو بھڑکا۔

اگر ملک نہ ہو تو کوئی قوم نہیں ہوتی، آپ چاولوں کی بوری کاندھے پر اٹھا کر پھرتے رہیں، چاول کسی پتیلی میں ہی پکیں گے۔

کوئی فرد کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک اس کا کوئی حوالہ نہ ہو۔ اس کی کوئی قوم نہ ہو، اس کا کوئی ملک نہ ہو۔

جنگل کی آگ تباہی پھیلاتی ہے مگر وہ آگ چولہے میں جلے تو سو طرح کے مفید کام کرتی ہے۔

جنگ بری ہے، تباہی پھیلاتی ہے۔ ایٹم بم بہت زیادہ تباہی پھیلاتا ہے (کیا سنی ہیں پہلے کسی نے اتنی عقل کی باتیں؟) مگر جب بقا خطرے میں ہوں، بچوں کی زندگی اور مستقبل خطرے میں ہوں تو جنگ سے بڑی خیر و خوبی کوئی نہیں اور آج کے پاکستان میں، پاکستانی ایٹم بم ریڈ انڈین محاورے کے بموجب ''اچھی دوائی'' ہے۔

تاریخ کی زبان اور محاورہ روزمرہ سے مختلف ہوتا ہے۔ ہم صنعتی انقلاب کی بات کرتے ہیں جیسے یہ واقعہ ایک دن یا ایک سال میں ہو گیا، ایسا نہیں ہے۔ صنعتی انقلاب تین چار صدیوں پر محیط ہے۔ پاکستانی قوم ان افراد پر مشتمل ہے جو 14 اگست 1947ء کو تخلیق پانے والے ملک 'پاکستان' کی جغرافیائی حدوں کے اندر رہتے ہیں۔ آدھے 1971ء میں چھوڑ کر چلے گئے، باقی حیران و پریشان رہے۔

دنیا بھر کی زندہ چیزوں کی سب سے مضبوط جبلت اپنی جان کی حفاظت ہے۔

جب بھارت کے ایٹمی دھماکے نے پاکستانی قوم کو اپنے سر پر منڈلاتے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ کسی کے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہ رہا، تو اس قوم کے سبھی افراد، ایک فرد واحد کی طرح، ایک قوم کی طرح بیدار ہوئے، اپنی جان کی حفاظت کے لیے، اپنی بقا کے لیے، اپنے مستقبل کے لیے، ایک زندہ توانا قوم 28 مئی 1998ء کو تولد ہوئی، ہر پاکستانی کو احساس ہو گیا ہے کہ وہ پاکستان کا باشندہ ہے کوئی ٹوٹا ہوا تارہ نہیں۔

گا رہے ہیں چمن میں پرندے
تان تو بھی خوشی کی اڑا چل

○○○

درزی، نائی، قصائی

ہنر مند لوگ ہیں۔ جاگیردارانہ سماج میں عزت، مربعوں، ایکڑوں، کنالوں میں ماپی جاتی ہے۔ جتنی زیادہ کسی کی زمین ہے اتنا ہی وہ معتبر ہے خاندانی ہے۔ ہنر مند لوگوں کو کمیں کہتے تھے، اور اس بات پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ یہ کم تر ذات کے لوگ ہیں۔

زمانہ بدلا، زمینداروں کی زمینیں تقسیم ہونا شروع ہوئیں۔ پچاس سال میں کوئی فاتح گھوڑ سوار نہ آیا جو نئے پانچ ہزاری دس ہزاری جنتا۔ بیراجوں کی زمینیں ہتھیا کر پاکستان کی حکمران جماعتوں نے اپنی ملکیتیں بڑھائیں، مگر الاٹ منٹوں سے تو کوئی نواب اور وڈیرہ نہیں بنتا۔ چند سرکاری حکام کو ان زمینوں کے ذریعے خریدا گیا مگر اس سے جاگیردار طبقہ مضبوط نہ ہو سکا۔

نیا زمانہ ہنر مندوں کا زمانہ ہے۔ جاگیردارانہ دور میں پڑھے لکھے لوگ چند ٹکے کے ''منشی'' تھے۔ اور ہنر مند زمین پر بیٹھنے والی کمتر مخلوق۔ نئے دور نے پڑھے لکھوں کے لیے ہنر مندوں کے لیے نئی نئی راہیں کھول دیں۔ یورپ، امریکہ، مڈل ایسٹ۔

دیہاتی سماج بدلنا شروع ہوا، چوہدری صاحبان ''راجے'' کی بیٹھک میں رنگین ٹی وی دیکھنے کے لیے آنے لگے، کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے ''میں نے کہا بچوں کا پتہ کر لوں۔''

ان بچوں کا پچھلے دو ہزار سال کسی نے پتہ نہ کیا تھا۔

اب ہنرمندوں کے گھروں میں ٹی وی، وی سی آر، فرج آ گئے۔ ان کی کوٹھی میں دانے آنے سے ان کے کملے سیانے ہو گئے۔ کوئٹے کے قصائی اور سانگلے کے نائی ملک کے نظریاتی رہنما بن گئے۔ غلط اور صحیح کے حکم لگانے لگے۔ فلاں نظریہ درست، فلاں غلط، فلاں آدمی اور لیڈر ہمارے موافق اور فلاں، چوں کہ ہمارا دُشمن ہے، اس لیے بلکہ اسی لیے ملک دُشمن ہے۔

گھٹنوں سے نیچا کرتا پہننے والا بدمعاش ہے، سمارٹ کپڑے پہننے والی خاتون اخلاق باختہ ہے۔ ڈیڑھ تھان کپڑے اپنے اردگرد لپیٹنے والا عالم اور رُوحانی رہنما ہے۔ سوٹ پہننے والا مغرب زدہ ہے۔ یو پی کا لباس پہننے والا محبِ وطن پاکستانی ہے۔ سب کو یہی تلقین کرتا ہے اگر پاکستانی ہو تو میرے جیسی اچکن پہنو۔ واسکٹ پہننے والا سی ایس پی ہے شرط یہ ہے کہ سیاہ ہو اور چمکیلی ہو۔ جینز پہن کر ذہن میں سنجیدہ خیالات نہیں آ سکتے اور نیکر تو ویسے ہی غیر پاکستانی ہے، یہ تو خوب صورت جسم والوں کا لباس ہے۔ یہ سب فتوے درزی کے دارالفتاوہ سے جاری ہوتے ہیں۔ لباس کے سلسلے میں ایک دلچسپ مشاہدہ آپ کے غور کے لیے۔ جتنا کپڑا ایک پاکستانی خاتون کو ڈھانپنے میں لگتا ہے اتنے کپڑے سے سنگاپور، کوالالمپور، بنکاک کی ایک محلے کی لڑکیاں اپنا اپنا کام کا لباس Working Dress بنا لیتی ہیں اور دفتروں، دُکانوں اور کارخانوں میں کام کرتی ہیں اور سر اُٹھا کر چلتی ہیں۔ برابری، شاید، مانگے سے نہیں ملتی۔

درزی کے بعد نائی کا بیان۔ یہ بھی آپ کے اخلاق کا رکھوالا ہے بلکہ وہ ریفری ہے جو آپ کے مذہب، مذہبی رجحانات اور فرقے کے مسائل طے کرتا ہے۔

اوپری ہونٹ نہ منڈانے والا بدمعاش یا مرد ہوتا ہے پورا چہرہ منڈانے والا مغرب زدہ کمزور انسان ہے۔ چہرے یا بغل یا سر کے بال منڈانے سے یا نہ منڈانے سے

انسان کے مذہب کا پتہ چلتا ہے، داڑھی کے سٹائل سے فرقے کا تعین ہوتا ہے۔ مسلمان اور یہودی بنانے کا کام اب نائیوں کی بجائے ڈاکٹروں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ درزی کی طرح قصائی بھی انسانوں کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی ہے جو سور نہ کھائے وہ مسلمان یا یہودی ہے۔ جو گائے نہ کھائے وہ سکھ ہے اور جو بالکل ہی گوشت نہ کھائے وہ تو پکا پکا ہندو ہے۔

نائیوں، قصائیوں اور درزیوں نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے یہ فرق بالکل واضح کر دیئے ہیں۔

OOO

دھماکے کے بعد

۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کے بعد پاکستانی قوم نے اپنے پاؤں مضبوطی سے پاکستان کی دھرتی پر جمانے شروع کر دیے ہیں۔ چودہ کروڑ لوگ ہیں۔ کچھ نے یہ تبدیلی فوری طور پر محسوس کر لی، کچھ آہستہ آہستہ کر رہے ہیں۔ ازلی طور پر وہی جن کو اپنے آبا پر بھی رشک رہتا ہے۔ اپنے وطن کے بارے میں تشکیک کا شکار ہیں۔ اتنا البتہ ضرور ہوا ہے کہ وہ پیران فرتوت بھی جو نظریے کے اونٹ سے اترتے ہی نہ تھے اور خیالی جادوئی قالینوں پر اڑے پھرتے تھے۔ اپنی زبان پر بصد اکراہ جغرافیے کا غیر اسلامی لفظ لے آئے ہیں اور اب پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی بات کرتے ہیں۔

اس تبدیلی نے اقلیتی پاکستانیوں کو بھی اپنے وطن پر اعتماد کی دولت بخشی ہے۔ پارلیمان میں ایک اقلیتی رکن نے ایک مسلمان ایم این اے کو بھارت اور ہندو بنیے کا فرق بتایا۔ اگر ہماری قوم ۸۰ فی صد ان پڑھ نہ ہوتی تو یہ بنیادی باتیں سکولوں میں پڑھا دی جاتیں کہ پاکستان اور بھارت دو ملک ہیں۔ ہندو مت اور اسلام دو مذاہب ہیں جن کے پیروکار دونوں ملکوں میں ہیں۔ بنیا اور ملا اسی طرح اسمائے صفت ہیں جس طرح پڑھا لکھا اور جاہل

اور یہ بھی دونوں ملکوں میں موجود ہیں۔

تاریخ ساز واقعات انھیں کو کہا جاتا ہے جن کے بعد کبھی کو سوچنا پڑتا ہے۔ اپنے نازک دماغ کو تکلیف دینا پڑتی ہے۔ رٹی رٹائی تقریریں اور گھسے پٹے نعرے بے کار ہو جاتے ہیں۔ وہی اشخاص اور قومیں اس امتحان میں پاس ہوتی ہیں جو بے رحمی سے اور ایمانداری سے اپنے عمل کا حساب کرتی ہیں۔ اپنی غلطیوں اور حماقتوں کو سچا ثابت کرنے کی کوشش ناکام کرنے والے زندگی کی دوڑ میں بھی ناکام ہوتے ہیں۔ زندگی کی نئی حقیقتیں اپنے ادراک کے لیے نئے علم کا تقاضا کرتی ہیں۔ شتربان اور ''کھوتے واہ'' ایٹمی دور کے عالم نہیں ہو سکتے، جہلا میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

مالی طور پر فقیر اور ذہنی طور پر پیدل لوگ ہی حساب کتاب سے کتراتے ہیں یا پھر چور اور بے ایمان۔ کرپٹ سیاست دان البتہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ احتساب سے بچ جائیں اس کے لیے چاہے حکومت ختم کرنی پڑے، چاہے ملک۔۔۔ مائی جی! شیخ سعدی نے کہا ہے۔

آن را کہ حساب پاک است
از محاسبہ چہ باک

جس نے گھپلا نہیں کیا وہ آڈٹ سے کیوں ڈرے؟

قومی حساب کسی تاجر کے حساب سے مختلف ہے۔ اس میں صرف روپیہ پیسہ نہیں ہوتا۔ ملک کا مستقبل، قوم کے مقاصد اور نئی نسلوں کی بہبود۔۔۔ اس طرح کے مسائل ہوتے ہیں کہتے ہیں فیصل آباد کا ایک تاجر کراچی سے بذریعہ جہاز آتے ہوئے پانچ سو روپے میں پچاس لاکھ کا بیمہ کروا بیٹھا اور لٹکے ہوئے منہ سے گھر آیا۔

''کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پانچ سو ضائع گیا۔''

پاکستان کے دوست ہمیں اس خرچے سے ڈرا رہے ہیں جو بم پر ہو گیا ہے اور جس کی وجہ سے ہمارے ائرکنڈیشنڈ کئی سال بند رہیں گے شکر ہے اللہ کہ میرے اور اشفاق بخاری کے ایسے ہمدرد نہیں ہیں ورنہ وہ ہمیں سمجھاتے کہ دوستوں اور بہنوں سے پیسہ لے کر بائی پاس تو کروا لیا ہے، بچو جی! اب یہ قرضہ واپس کرو گے تو پتہ چلے گا! (مر جاتے تو بہتر تھا؟)

ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق گھر میں ڈنڈا، کلہاڑی، پستول، بندوق رکھتا ہے کہ چوروں اور ڈاکوؤں کو اندر گھستے ہوئے ڈر اور جھجک محسوس ہو۔ کوئی بھی اس طرح حساب نہیں لگاتا کہ ۲۰ ہزار روپیہ بندوقری پر خرچ دیا، ابھی تک کوئی چور ڈاکو تو آیا نہیں۔

ملک بھی اپنی حیثیت کے مطابق اور اکثر اوقات اپنی حیثیت سے بڑھ کر، اپنی حفاظت کے لیے اسلحے اور فوجوں کو تیار رکھتے ہیں تاکہ کسی ہوس ملک گیری میں مبتلا ملک کو یا ہیرو بننے اور فاتح کہلوانے کے شوقین شخص کو جارحیت کی جرات نہ ہو اور کوئی بد بخت یا پنجابی محاورے میں ''نیت سے ہارا ہوا'' شخص ہی یہ تجویز لائے گا کہ ایٹم بم کی جگہ چاکلیٹ خرید لو۔ خان صاحبان مائی جی اور کامریڈو۔ دفاع کمزور ہو تو کون بچوں کو چاکلیٹ کھانے دیتا ہے۔ امن بقول فیض احمد فیض بچوں کی ہنسی ہے مگر یتیم بے بس لاچار محکوم اور مفتوح بچے ہنستے ہی نہیں خواہ فاتح دنیا کا تازہ ترین نظریہ اور مذہب لے کر آئے۔۔۔ امن کے لیے جنگ کو روکنا پڑتا ہے۔ جنگ کا راستہ بند کرنا پڑتا ہے۔ جنگ کے امکان کو ختم کرنا پڑتا ہے۔

دنیا کی چھٹی اور ساتویں ایٹمی طاقت میں جنگ کا امکان معدوم ہو گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چوتھی جنگ بعید از قیاس ہے۔ البتہ پرانا غصہ اترتے وقت لگے گا۔ جس طرح ذاتی لڑائیوں میں ہوتا ہے۔ 'ڈانگ سوٹے کے بعد گالیاں' پھر گھر گھر بڑبڑ۔ پھر زخموں پر ٹکور۔ تب کہیں شرماتے شرماتے صلح کی بات چیت۔ اسی طرح جذبات ٹھنڈے ہوتے وقت لگے گا۔ کچھ لوگ لڑائی فساد کے نام پر لیے ہوئے چندے کو حلال کرنے کے لیے کچھ عرصہ نعرے بازی کرتے رہیں گے پھر کوئی ڈھنگ کا کام ڈھونڈ لیں گے۔

لاہور اور دِلّی (پاکستان اور بھارت) کی دشمنی صدیوں پرانی ہے۔ دلا بھٹی کہتا تھا:

میں ڈھاواں دلی دے کنگرے
دیاں شکر وانگوں بھور

یعنی میں دِلّی کے قلعے اور تخت دیسی شکر کی طرح ریزہ ریزہ کردوں گا اور ساتھ ساتھ پنجابی پھکڑپن بھی ہے کہ میں مغلانیوں کی سیج پر۔۔۔

یہ دلی نفرت دِلّی سے جاتے جاتے جائے گی۔ فوری طور پر یہ ہوگا کہ

۱۔ دلی کی تاریخی، سیاسی، ذہنی، نفسیاتی اور ''تہذیبی'' برتری کا خاتمہ اور پھر اس کے نتیجے میں

۲۔ بھارتی دھونس کا خاتمہ

۳۔ پاکستانیوں کے اپنے آپ پر، اپنے ملک پر اعتماد اور فخر میں اضافہ

۴۔ علاقائی امن کی صورتِ حال میں بہتری کے بعد، معاشی بہتری، تعلیم اور صحت کے شعبے میں بہتری

۵۔ ملک کے اندر نعرے بازوں اور چندہ خوروں کا خاتمہ اور نتیجتاً ملا گردی کا خاتمہ یعنی ایک بہتر کل، ایک مہذب قوم، ایک روشن پاکستان

ooo

ایمان ہے کہ سبحان اللہ

کہانی ہے حسن ناصر کی، سنی سنائی نہیں۔ حسن ناصر کے ایک دوست، ساتھی، کامریڈ، میجر اسحاق محمد کی زبانی ۔۔۔ سرکاری فائیلوں کی زبانی، عدالتی کارروائی کی زبانی۔

آج تو عوامی مجمعے سے خطاب کرنے والا ہر مقرر حسن ناصر کا یار ہے۔ سرکاری، درباری لوگ حسن ناصر کا دن مناتے ہیں۔ حکومت میں آکر بھی کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس ظلم عظیم کی صحیح تحقیقات ہی کروالیتا، اپنی گردن میں پھندا نہ بھی ڈالتا، سچ تو نکھر کر سامنے آجاتا۔

کم از کم حکمرانی کے انداز ہر کہ دمہ کی سمجھ میں آجاتے، ریاست کیا ہوتی ہے؟ کس کے مفادات کی نگہ بان ہوتی ہے؟ اس کے کل پرزے، اپنی نمازوں، پرہیزگاریوں اور 'عزت سادات' کے ساتھ کس قدر چھوٹے، بزدل اور منافق ہوتے ہیں کہ یہ کل پرزے جس مشین کے ہیں اس مشین کو ایسے ہی پرزے درکار ہیں۔ ایسے نہ ہوں تو ٹوٹ جائیں یا مشین کو بے کار کردیں۔

حکمران طبقوں کی سیاسی جماعتوں کے رہنما اور اکثر کارکن کس طرح اپنے ذاتی

اور طبقاتی مفاد کی خاطر عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ کبھی مذہب اور فرقے کے نام پر، کبھی علاقے اور وطن کے نام پر، کبھی نسل اور برادری کے نام پر۔ صرف ایک بات عوام سے چھپاتے ہیں اور وہ ہے طبقاتی تقسیم، طبقاتی مفادات، طبقاتی منافرت اور طبقاتی جدوجہد۔۔۔ اس ایک جدوجہد سے عوام کو روکنے کے لیے کیا کیا کھلونا جدوجہدیں عوام کی جھولی میں ڈالی جاتی ہیں۔ اسلام اور کفر کی جدوجہد شیعہ سنی کی لڑائی، ہندو اور ہندوستان کی دشمنی، مرزائیت کے خلاف جدوجہد نہیں بلکہ جہاد۔۔۔ جہاد عورت کے خلاف، جہاد علم کے خلاف، جہاد تہذیب کے خلاف، کیا کیا جھوٹ نہیں تراشے جاتے۔ سولہ کروڑ پاکستانیوں میں ایک بھی یہودی نہیں، مگر پاکستانی پولیس، عدالت، تجارت سیاست کی سبھی خرابیاں یہودی سازش ہے۔۔۔ وڈیرے جاگیردار اور ملا جو کچھ کررہے ہیں وہ عین حب الوطنی اور اسلام ہے۔

جب سے طبقات وجود میں آئے ہیں۔ غریب ہمیشہ کثیر اکثریت میں رہے ہیں۔ کبھی یہ نہ ہوا کہ غریب اپنی اکثریت کے نتیجے میں، کبھی آسمانی فرمان کے نتیجے میں زمین کے وارث بن جاتے۔

پیرس کمیون کے چند ایمان افروز دنوں کو چھوڑ کر، روس کا عظیم اکتوبر انقلاب، انسانی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے۔ جب محنت کشوں نے زار جیسے 'عظیم' حکمران کو شکست دے کر اپنی حکومت، اپنی ریاست قائم کی۔ یہ کیوں کر ممکن ہوا؟

انسان نے پہلی بار انسانی سوچ سے رہنمائی حاصل کرکے جدوجہد کی۔ مارکس نے، اپنے وقت تک کی تمام انسانی سوچ کو کھنگالا۔ فلسفۂ معاشیات، سوشلزم کی کسک اور مارکسی فلسفہ اور سائنس وجود میں آئے۔ مادی جدلیات اور تاریخی مادیت، اس علم کے دو نام ٹھہرے۔

محنت کش، اپنی محنت کے دفاع کے لیے ہمیشہ سے جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے بہت عظیم الشان قربانیاں دیں، جانیں لٹائیں، مگر فتح سے ہمکنار کبھی نہ ہوئے۔ تاریخ نے یہی سبق دیا ہے کہ مارکسی فلسفے یا پرولتاری نظریے کی رہنمائی کے بغیر تمام جدوجہد

کیکر کے درخت پر انگور کی بیل چڑھانے یا ریت میں 'چنیا' بونے کے مترادف ہے۔

یہ صحیح ہے کسی کتاب نے کبھی کوئی قلعہ فتح نہیں کیا، اور یہ بھی سچ ہے کہ صحیح نظریے کی رہنمائی کے بغیر، بڑی سے بڑی تحریک انقلاب پر منتج نہیں ہوتی۔

میجر اسحاق محمد کی کتاب 'حسن ناصر کی شہادت' کا پہلا حصہ ایک سائنسی دستاویز ہے۔ جس کی موجودگی میں ڈھیٹ سے ڈھیٹ انسان بھی یہ دعوے کرتے ہوئے شرما جائے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں پولیس، امن وامان قائم کرنے کے لیے ہے۔ یا عدالتیں انصاف کے لیے ہیں یا حکمران عوام کی خدمت کا تصور بھی کر سکتے ہیں۔

محنت کش عوام کی جدوجہد تبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ اپنے نظریے سے پولیس، اپنی پارٹی کی قیادت میں جدوجہد کریں۔ یہ نظریہ کیا ہے؟ کتاب کا دوسرا حصہ اسی سوال کا جواب ہے۔ بالخصوص تیسرا باب 'شہید کی نظریاتی پرورش'

مارکسی فلسفے پر سینکڑوں کتابیں دستیاب ہیں مگر پاکستانی محنت کش کے لیے ان چند صفحات میں رہنمائی بے مثل ہے۔ مارکسی نظریہ انسانی جدوجہد اور انسانی سوچ کی تلخیص ہے۔ جب تک انسان کرۂ ارض پر موجود ہے، زندہ سلامت ہے، اس کی جدوجہد بھی جاری ہے۔ اس کی سوچ کا ارتقا بھی جاری ہے۔ اس کے نظریے میں بہتری اور بڑھوتی بھی جاری ہے۔ انسانی نظریہ کبھی جامد نہیں ہوتا۔ اسی لیے مارکسی نظریہ بھی حرفِ آخر نہیں ہے۔ ہاں آج تک کی انسانی سوچ کی معراج ہے۔۔۔ جمود صرف مردوں کے حصے میں آتا ہے۔ جمود اور حرفِ آخر۔۔ اس سے گریز ہر محنت کش اور انقلابی پر لازم ہے۔

زندگی کے ہر موڑ پر طبقاتی سوچ سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ دشمن طبقات، بطور طبقہ، کس طرح انسان کو جل دیتے ہیں۔ کون سی جنت کے خواب دکھاتے ہیں۔ کس طرح ان کے مذہب، علاقے، نسل کو برتر کہہ کر دوسرے مذاہب، علاقوں اور نسلوں سے نفرت سکھاتے ہیں اور سماج کی طبقاتی تقسیم پر پردہ ڈالتے ہیں اور ہم بھی درمیانے طبقے کے نیم

خواندہ لوگوں کی طرح ان کی شخصی برائیاں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ فلاں نے اتنی رشوت لی، فلاں نے فلاں نوکری اور پلاٹ لیا۔ ہاں یہ باتیں اگر تحریری طور پر اکٹھی کی جائیں تو یہ انقلابی کام ہے۔ سائنسی کام ہے کہ سائنس کی بنیاد اعداد وشمار پر ہے۔ مزدور کتنی قدر پیدا کرتا ہے۔ اس کو کتنی اجرت ملتی ہے۔ قدرِ زائد کون لے جاتا ہے۔ سرمایہ دار، وڈیرے، سردار اور بادشاہ اپنی دولت کس کے استحصال سے حاصل کرتے ہیں۔ کیا 'مظلوم سردار' اور 'روشن خیال جاگیردار' بھی ہوتے ہیں یا یہ محض ایک لطیفہ ہے۔

حکمران طبقات، خود تو مکمل طور پر طبقاتی شعور سے لیس ہوتے ہیں۔ محکوموں کو نسلی اور مذہبی خواب دکھاتے ہیں۔ چھوٹی عمر سے دماغوں میں کوڑا بھرنا شروع کرتے ہیں۔ جنوں، پریوں اور معجزوں کی داستانیں سناتے ہیں اور اسے علم کہتے ہیں۔ یہی جھوٹ سکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ سے پھیلاتے ہیں، تاکہ محنت کشوں کو گمراہ کیا جائے اور ان کا استحصال جاری رکھا جائے۔ سائنسی علم سے محروم عوام بھی یہ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ بقول شاہ حسین:

ے سچ گل سینوے کیوں کر
کچّی ہڈاں وچ رچی

اس کچّی کا علاج گپ شپ نہیں۔ طبقاتی نظریاتی علم ہے۔ بقول ماؤ:

کثرتِ شکوہ سے دل آزردہ کرنے سے بچیں
دور بینی سے ہمیشہ جائزہ اشیا کا لیں

اور اس دور بینی کے لیے ضرورت ہے مارکسی نظریے کی جس کو مسلسل عمل اور جدوجہد سے، حقائق سے صداقت کی تلاش کرتے ہوئے، آج کی سطح پر اٹھایا گیا ہو۔ آج کے علم سے، اگر اس میں مسلسل اضافہ نہ کیا جائے تو کل کی جہالت بن جائے گی۔

محنت کشوں کا اعتراض ہوتا ہے کہ ان کے اوقات کار اور معمولات زندگی، اس

طرح کے ہیں کہ وہ 'دانش وری' نہیں بھگار سکتے۔ مگر سادہ سے سادہ مسافر بھی یہ تو گھر سے طے کر کے نکلتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اگر مقصد مزدور کی بہتری، مزدور کی حکمرانی اور انقلاب ہے۔ تو انقلابی نظریے کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ ہر مزدور جب تک بلا استثناء، اس نظریے سے لیس نہیں ہوتا کم از کم اتنا نظریہ، جتنا دوسرے حصے کے تیسرے باب میں ہے تو انقلاب ایک خواب سے زیادہ نہ ہوگا۔ اتنا سا نظریہ سمجھنے کی ہر انقلابی کو ضرورت ہے۔ اسے پختہ کرنے کے لیے، اسے بار بار پڑھنے کی یا پڑھوا کر سننے کی ضرورت ہے۔ اس عمل سے حاصل کردہ سمجھ کو اس نظریے میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ دانش وری یہی ہے۔ کوئی ٹونا ٹوٹکا، جادو یا دور، وظیفہ نہیں ہے۔

ملتان کے ساتھی مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے اتنی اہم کتاب کی دوبارہ اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔

OOO

جاگیرداری کے بعد؟

کیا سماج کے جاگیرداری سے سرمایہ داری میں عبور کے دور میں ہمیں اس تبدیلی کے حق میں زور لگانا چاہیے یا جاگیرداری کو مضبوط کرنے کا چارہ کرنا چاہیے۔۔۔

یہ انتہائی اہم سوال ہے۔

کلاسیکی مارکسزم کے نظریہ تاریخی مادیت کے مطابق، انسانی سماج کی تبدیلی کی پانچ منزلیں بیان کی گئی ہیں۔

غلام دارانہ سماج

جاگیرداری سماج

سرمایہ داری سماج

سوشلزم

کمیونزم

یہ تاریخ کا عمومی رجحان ہے اور ایسا نہیں ہے کہ یہ تبدیلیاں، خود بخود ایک مقررہ وقت پر ہو جاتی ہیں۔ تبدیلی کی رفتار کو، ایک خاص معاشرے کے اندر موجود قوتیں متعین کرتی

ہیں، جن طبقات کے حق میں یہ تبدیلی ہوتی ہے، وہ اسے تیز تر کرنے کے لیے زور لگاتے ہیں اور جن طبقات کے خلاف یہ تبدیلی ہو رہی ہوتی ہے وہ اس تبدیلی کو روکنے یا اس کی رفتار کم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ تاریخ کے پہیئے سے لٹک کر اس کی رفتار کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کام کے لیے اپنے باپ دادا کا واسطہ دیتے ہیں۔ رسم ورواج کو مقدس ٹھہراتے ہیں۔ اپنے خداؤں کو اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔

تبدیلی کی قوتوں کو کمزور کرنے کے لیے، دنیا کا ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تبدیلی کی خواہش ہی غیر اخلاقی ہے، غیر قانونی ہے، کفر ہے وغیرہ وغیرہ۔

تعلیم اور ابلاغ کے سبھی ذرائع چونکہ حکمرانوں کے پاس ہوتے ہیں اس لیے بہت دیر تک یہی حربہ کامیاب رہتا ہے۔ جب بات ہاتھ سے نکلتی نظر آئے تو تبدیلی کی طاقتوں (انقلابی قوتوں) میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو خریدتے ہیں۔ کچھ اپنے لوگوں کو ان میں شامل کر کے نظریاتی دھندلاہٹ پیدا کرتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ یہ قوتیں حکمران سے لڑنے کی بجائے، آپس میں سر پھٹول کریں۔ ان کو غلط راستوں پر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں ایسے خوبصورت اور سنہرے خیالات داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو ناقابلِ عمل ہوں۔ (مثلاً آج کے پاکستان میں یہ مطالبہ کہ عدلیہ کی بحالی، پارلیمنٹ کی بجائے براہ راست کی جائے یعنی مشرف کے خلاف نعرے لگانے سے، مشرف صاحب عدلیہ بحال فرما دیں گے!)

○○○

شیطان کے چیلے

شیطان کا فخر یہ ہے کہ

"میں جو جانتا ہوں وہی کافی ہے"

شیطان اس بات پر راندہ گیا کہ اس نے سیکھنے سے انکار کر دیا۔

شیطان کے چیلے حیران ہیں۔ معاشرے میں آنے والی تبدیلی، ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ وہ پُرانے دھڑے کو دائمی سمجھتے ہیں۔

نامعلوم کے بارے میں تحقیق و تجسس، انسانی صفت ہے۔ جس نے اس سے انکار کیا، وہ شیطان کا چیلا بن گیا اور اگر اس کی صلاحیت اور طاقت فراواں ہو تو مجسم شیطان کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ اس کا غضب، اس کا غصہ اس کے بس میں نہیں رہتا۔۔۔ وہ دہشت گرد بنتا ہے۔ عورتوں، بچوں اور نہتے غریب مردوں کا بے رحمانہ اور بہیمانہ قتل کرتا ہے اور اس 'بہادری' پر فخر کرتا ہے۔

مکمل طور پر اپنے آپ کو اجتماع میں غرق کر دینے کے خطرات شدید ہیں۔ بیمار ذہنیت، اسی لیے فروغ پاتی ہے کہ عقل و دانش کی بڑھوتی رک جاتی ہے۔ اجتماع سے انحراف

گناہِ عظیم نظر آتا ہے۔

اس کا توڑ خودی ہے۔ خود آگاہی ہے۔ حتیٰ کہ خود غرضی بھی غلامانہ تقلید سے برتر رویہ ہے۔ جو نئی سوچ کو جنم دیتا ہے۔

ذاتی مفاد کی غلامی، ایک شخص کو اس اساطیری ہیرو سے جوڑتی ہے۔ جو جن کی قید میں، زنجیروں میں جکڑی ہوئی، عقل و خرد کی شہزادی کو چھڑاتا ہے۔ اس پرومیتھیس سے جوڑتی ہے، جو خداؤں سے بغاوت کر کے انسان کے لیے 'آگ' کا تحفہ لاتا ہے۔ جو کہ دانش بھی ہے، دانائی بھی اور توانائی بھی۔ اگر چہ اپنا جگر چیل کوؤں کو کھلاتا ہے۔ خداؤں کا اور اجتماع کا انتقام، خوف ناک ہوتا ہے۔ ہر معاشرہ، اپنے مسیح کو، اپنے بھٹو کو، اپنی بے نظیر کو مصلوب کرتا ہے۔

اس ہیرو کا ہیرو ازم، اس بات میں ہے کہ وہ معاشرے سے بغاوت کرتے ہوئے، معاشرے کو مضبوطی کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

ooo

مغرب زدہ

'مغرب زدہ' کی اصطلاح سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ مغرب سے استفادہ کس نے کیا ہے؟ سفارت خانوں کے مفت رسالوں سے چند مضامین پڑھ کر، ایک سے بڑھ کر ایک 'ماہر' وجود میں آ چکا ہے۔

سعدی نے گلستان، بوستان لکھی ہیں۔ عمدہ کتابیں ہیں مگر ان کو صدیاں بیت گئیں، کسی نے ڈھنگ کا ترجمہ تک نہیں کیا۔ گلی گلی میں شارحین موجود ہیں۔ متن (Text) غائب ہے۔۔۔ فیصل آباد میں قصائی، بکرے کی سری دو طرح سے بیچتے ہیں۔ ایک تو مکمل اور دوسری وہ جس میں سے مغز نکال کر الگ بیچ دیتے ہیں اسے 'جرنیلی' سری کہتے ہیں۔

یہاں تو سبھی جرنیلی سریاں لیے پھر رہے ہیں۔ سنی سنائی خبر بتا کر بیان کرنے والے۔۔۔

مغرب کا انہوں نے پڑھا کیا ہے کہ 'مغرب زدہ' بھی ہو گئے۔ نہ اس اصطلاح کے موجد نے اور نہ ہی اس کے شکار نے، کبھی مغربی تحریریں پڑھی ہیں۔ چند ایک ادیبوں اور ناقدوں کے نام رٹ لیے ہیں اور اللہ اللہ خیر صلا۔ شرح کی شرح لکھنے والا عالم کہلاتا ہے اور

دو چار مغربی ادیبوں، نقادوں کے نام جاننے والا ادیب اور نقاد ہے۔ پروفیسر صاحب ہے۔

میرے محترم دانشورو! آپ نے مغرب کا کیا پڑھا ہے۔ کسی ایک کتاب کا نام، کسی ادبی رسالے کا نام بتا دیجیے!

'نمونہ مشتے از خروارے' کے طور پر ہی، چند تحریریں حاضر ہیں، خدا لگتی کہیے کبھی پڑھی ہیں؟

یہاں تو ایسے ایسے سپیشلسٹ موجود ہیں جو کمیونزم پر تنقید کے ماہر ہیں مگر آٹھ صفحے کا کمیونسٹ 'مینی فسٹو' نہیں پڑھا۔ فرائڈ کے بارے میں فتوئی ہے کہ اب Irrelevant ہو گیا ہے۔ فرائڈ کی کسی ایک تحریر کا نام لیں، جو آنجناب نے پڑھ رکھی ہو۔

انقلاب کو دماغ کے علاوہ، دل میں بھی جگہ دیجیے۔ امیروں سے نفرت تو کبھی کرتے ہیں، غریبوں سے پیار کون کرتا ہے۔ غریبوں کی خدمت کرنے والے ہمیں برے لگتے ہیں۔۔۔ سامراج کے ایجنٹ ہیں اگر غریبوں کو کوئی سکھ کا سانس مل گیا، اگر ملاؤں کی عمل داری میں کسی نے جان پر کھیل کر بچیوں کو پڑھا دیا تو اس نے ہمارے انقلاب کو کھوٹا کر دیا کہ ہمیں تو ایڑیاں رگڑتے ہوئے عوام چاہئیں۔ انہیں منہ دھونے کی تلقین کرنے والا بھی ہمارا دشمن ہے۔ غریب کیوں پڑھیں؟ پارٹی کے لیڈر، کمپیوٹر کا علم کیوں سیکھیں؟ یعنی انقلاب لانے کے بعد، مارکس اینگلز کو پڑھیں گے۔۔۔ کس لیے؟

ooo

ظالم بچّی

عمر تو اس کی تین سال تھی مگر قدرت نے اس کو وہ محبت، وہ انرجی، وہ رنگ روپ دیا تھا کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا اور جب اپنی توتلی زبان میں پیاری پیاری باتیں کرتی تو کوئی اس کے سحر میں گرفتار ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ جب کھیلتی تو بھرپور کھیلتی اور جب اسے نیند آتی تو ایک پل میں گہری نیند سو جاتی اور جب گہری نیند سے بیدار ہوتی تو تر و تازہ اور چاک و چوبند۔۔۔ آدھے منٹ کے اندر اندر بستر سے نیچے۔۔۔ اگر رات کو کوئی کھلونا، بستر کے قریب پڑا ملتا تو فوراً کھیلنا شروع کر دیتی۔ یا پھر اپنے ننھے ننھے پاؤں میں ننھے ننھے سلیپر چڑھا کر بالکونی میں آ کر کھڑی ہو جاتی۔ خواہ باقی گھر بھر ابھی سو رہا ہو یا اپنے کاموں میں مصروف ہو۔ آج بھی وہ بالکونی میں کھڑی آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ فروری کے لاہور کی صبح تھی۔۔۔ بسنت رُت، کہ ایسا سہانا موسم دنیا بھر میں کہیں نہیں ہوتا۔ کوئی دلچسپ کردار نظر آتا تو زبان نکال کر اسے چڑاتی۔ سڑک پر جانے والے کو پتا بھی نہ چلتا کہ اوپر بالکونی میں کھڑی ایک ننھی سی بچّی اسے احمق سمجھتی ہے۔

کسی بھی احمق کو یہ احساس نہیں ہوتا!

سامنے ایک بڑی سی عمارت تھی جس میں صبح سویرے سے ہی بہت سی گاڑیاں آنے لگتیں۔ چوکیدار انہیں روک کر ان سے کچھ بات کرتا۔ کسی کو سلام کرتا منّی کو یہ چوکیدار بہت اچھے لگتے۔ پیاری پیاری وردی میں کھٹ کھٹ کرتے۔

اچانک منّی نے وہ تماشہ دیکھا جو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ ایک ٹرک پوری رفتار سے سیدھا بڑے گیٹ کی طرف بڑھا اور اس کے دوست چوکیدار کو کچلتا ہوا اندر گھس گیا۔ ابھی اس کی حیرانی دور نہ ہوئی تھی کہ جاسوسوں کے اڈے میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔۔۔ لوگ کہتے ہیں خوفناک تھا۔ منّی کو تو پتا بھی نہ چلا۔ دھماکہ اس قدر شدید تھا کہ اس کا سانس باہر نکلا تو اندر آنا بھول گیا۔

''منّی اپنی تین سالہ طویل عمر گزار کر اللہ میاں سے ملنے چلی گئی۔''

یوں تو یہ اچھا ہی ہوا۔ عدل بھی کسی چیز کا نام ہے۔

''منّی نے کیوں عراق پر حملہ کیا تھا؟''

OOO

ادویاتی اشیا کا غیر طبی استعمال اور ان پر انحصار قابلِ علاج مرض ہے

(Drug Dependence is a Curable Disease)

Drug ڈرگ کا لفظی معنی تو دوا ہے مگر جب یہ نشہ آور دوا کے لیے استعمال ہونے لگا تو امریکیوں نے اس کی جگہ Substance کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کا اردو معنی شے ہے جو بہت ہی عمومی معنی رکھتا ہے۔ امریکی تو اس کے ساتھ کبھی Abuse یا غلط استعمال اور کبھی Use استعمال کا لفظ برتتے ہیں۔ میں نے بہتر تفہیم یا ابلاغ کے لیے طبی اشیا یا ادویاتی اشیا کا لفظ استعمال کیا ہے۔

انحصار (Dependence)

W.H.O کی سفارش کے مطابق نشے اور عادت دونوں کی جگہ لفظ انحصار ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ یہ انحصار جسمانی بھی ہوتا ہے اور نفسیاتی بھی۔

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی

کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

عادت تو نہانے کی بھی ہوتی ہے اور نہ نہانے کی بھی۔ عادت تو شاعری کرنا بھی ہے اور شاعری پڑھنا بھی۔ اس سے بڑی عادت جو نشہ کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، اخبار بینی ہے۔ اخبار نویسی تو پیشہ ہے، اخبار پڑھنا پیشہ نہیں ہے، عادت ہے نشہ ہے۔

اخبار کا نشہ وہ نشہ نہیں ہے جس کا ذکر ہم آج کرنے جا رہے ہیں، اخبار پڑھنا ایک ضرورت ہے اور اس حوالے سے پڑھے لکھوں کی عادت ہے اور جب یہ عادت پختہ ہو جائے تو ہم اندازِ بیاں کے طور پر اسے نشہ کہہ دیتے ہیں۔

ہم لوگ جن کا تعلق انسانی ذہن، سوچ، جذبات اور ان کی صحت یا بیماری سے ہے یعنی نفسیات دان اور نفسیاتی بیماریوں کے معالج یا Psychologist اور Psychiatrist نشہ یا Addiction کا لفظ استعمال نہیں کرتے کہ یہ لفظ سوئے استعمال سے حرف تشخص نہیں گالی بن گیا ہے اور ہم طبیب لوگ اگرچہ اسی معاشرے کے افراد ہیں، جس میں گالی بکنا قابلِ فخر کام اور بڑائی کی نشانی ہے اپنے گاہکوں کے احترام میں اس لفظ سے اجتناب کرتے ہیں۔

لفظ نشہ کے بہت سے مشتق ہیں، نشئی، پوستی، شرابا، جہاز، پینگھ وغیرہ وغیرہ۔ چنگیز خان کے کسی چمچے نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ بہت رحم دل اور ہمدرد تھا اور مثال اس رحم دلی کی یوں ہے: ''چنگیز خان کی شاہی سواری جا رہی تھی اور عوام اپنے آمر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دو رویہ کھڑے تھے کہ عوام کالانعام (لفظی معانی: عوام مثل ڈھور ڈنگر) کو آمر بہت اچھے اور نیک لگتے ہیں ایک تماشائی بی بی کا بچہ ہجوم میں گر گیا اور ڈر تھا کہ ڈھور ڈنگر کے پاؤں تلے کچلا جاتا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر چنگیز خان کے دل میں درد کی اک موج اٹھی اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے بچہ اپنے نیزے کی نوک میں اُڑس کر ماں کے حوالے کر دیا۔۔۔ تالیاں حضرات تالیاں۔۔۔ اب بھی کچھ کچھ مغرب زدہ جمہوریت کی راگنی الاپتے اور ڈفلی

بجاتے رہتے ہیں۔

چنگیز سمان کچھ نیک دل لوگوں کو نشئیوں پر لادا گیا ہے انھوں نے بعد از صرفِ زر کثیر چوک چوک اور گلی گلی بورڈ لگوا دیئے ہیں کہ نشہ لعنت ہے اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔ بیمار کو گالی دے دی ٹھیک تو ہو ہی جائے گا۔"

میں نے آج تک کسی اخبار میں کسی مضمون میں، کسی بورڈ پر، کسی تقریر میں یہ نہیں پڑھا یہ نہیں سنا کہ منشیات فروشی ایک لعنت ہے۔ ہم کسی وعظ، کسی اداریے میں نشہ آور چیزوں کی تیاری اور فروخت کو لعنت نہیں کہتے، جرم نہیں کہتے وہ۔۔۔ کس لیے، کہ ہم بڑی بڑی مونچھوں اور خوفناک داڑھیوں والے کلاشنکوف بردار سواروں سے ڈرتے ہیں۔

ہم آج مجرموں کی نہیں انسانوں کی بات کریں گے، اُن مجبور اور بیمار انسانوں کی جو ادویاتی اشیا کے غیر طبی استعمال کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ یہی فسانہ مبتلا آج کا موضوعِ سخن ہے۔ آیئے تھوڑی دیر کو اس بات پر غور کریں کہ لوگ آخر کیوں ایسی اشیا استعمال کرتے ہیں اور کیوں کر ان کے عادی ہو جاتے ہیں۔ برٹن رُوشے اپنی کتاب ''الکحل'' میں لکھتا ہے:

''نسل انسانی کی بنیادی ضرورتیں خوراک، لباس اور سر چھپانے کی جگہ ہیں۔ اس بنیادی تثلیث میں دو اور برابر کی اہم چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں، تحفظ اور پیار۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی ضروریات ہیں جو اتنی اہم تو نہیں مگر ان سے انکار بھی آسان نہیں۔ ان میں سے ایک جو شاید سب سے زیادہ اپنی تشفی کے لیے اصرار کرتی ہے، حقیقت کے ناقابلِ برداشت پنجے سے کبھی کبھار رہائی ہے معلوم تاریخ کے بھی انسان ذہن اور یادداشت کے اس جبر سے شناسا ہیں اور سب نے تلاش کی ہے کسی ایسے قابلِ اعتبار ذریعے کی جو کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس بندھن کو ڈھیلا کر دے، اسی بات کو علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورت طریقے سے یوں بیان کیا ہے:

؎ او بیک دانۂ گندم بزمیم انداخت
تو بیک جرعہ، آب آنسوئے افلاک انداز

یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ایک گندم کا دانہ دے کر زمین پر پھینک دیا کہ جا فکرِ معاش کر۔

اے ساقی تو شراب کے ایک قطرے سے مجھے افلاک کی سیر کرا دے۔ پُرانے وقتوں میں یہ اشیا مذہبی رسومات میں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ کیتھولک Mass میں شراب اور صوفیا کے ہاں بھنگ کا استعمال سب کے علم میں ہے۔ اصل مسئلہ ان اشیاء کی موجودگی سے انکار، ان کی ضرورت سے انکار یا اس بات سے انکار نہیں کہ کچھ لوگ ان اشیاء کے ہاتھوں بے بس بھی ہو جاتے ہیں، ان مہذب اقوام نے جو نعرے بازی کی بجائے مسائل کے حل کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں یہ کیا ہے کہ ان ملکوں میں ہلکے پھلکے نشے مثلاً چرس کا سگریٹ اور ہلکی پھلکی شراب مثلاً بیئر اگر قانونی اور سماجی طور پر مباح نہیں تو کم از کم غیر قانونی بھی نہیں۔ رُوشے کی بیان کردہ وجہ کے علاوہ دو اہم وجوہات بھی ہیں: اولاً سماجی میل جول میں تفریحی استعمال یا۔۔۔Recreative use جو ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ اسی ذیل میں افیون اور ہیروئن کا بہتر اور طویل تر جنسی کارکردگی کے لیے استعمال شامل کیا جا سکتا ہے۔ (جسے حکما مسک کہتے ہیں)

ثانیاً تجرباتی استعمال یا Experimental Use جو Teenagers یا چڑھتی جوانی کے لوگ کرتے ہیں جن کی نفسیاتی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو بالغ اور مرد ظاہر کریں۔۔۔ ان میں سے اکثر چند بار کے تجربے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں۔ البتہ ضرورت سے زیادہ ردِعمل ہو تو چرس اور بیئر کی بجائے ہیروئن جیسا خفیہ نشہ شروع کر لیتے ہیں جس کا نہ ابا کو پتہ چلتا ہے نہ دادا کو، جب تک کہ عادت پختہ نہ ہو جائے۔ ان لوگوں کی ایک واضح اکثریت چند بار کے تجربے کے بعد زندگی کی مصروفیات میں کھو کر ان تجرباتی نشوں کو چھوڑ دیتی ہے۔ ماسوائے ان بدقسمتوں کے جنھوں نے یہ تجربہ ہیروئن سے کیا ہو، آپ جانتے ہی ہیں کہ ہیروئن سے چھیڑ چھاڑ کتنی خطرناک ہو سکتی ہے۔ میں نے شروع میں فیض صاحب کے اشعار اسی صورتِ حال کی طرف توجہ دلانے کے لیے کہے تھے۔

تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی

اب چند الفاظ اس مسئلے کے حل کے ضمن میں۔ مذہبی لوگ چلّے اور وظائف بتائیں گے۔ دوزخ سے ڈرائیں گے۔ قانونی لوگ کوڑوں اور قید و بند کی بات کریں گے۔ جیل والوں کے نزدیک جیل ہی ہر مرض کا علاج ہے۔ یادش بخیر ایک D.I.G جیل خانہ جات ہوتے تھے۔ حافظ قاسم یا ایسا ہی بھلا سا نام تھا وہ مخلوقِ خدا کی خدمت کے لیے لوگوں کو فی سبیل اللہ جیل میں بند کر دیتے تھے اور سلاخوں میں سے خوراک پہنچاتے تھے اور سارا دن تلاوت سناتے تھے۔ یہ مریض جیل سے فارغ ہوتے ہی ہیروئن کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔ شفیق الرحمان نے رسالے کے اس فوجی کا ذکر کیا ہے جو پہلی جنگ میں تھا اڑیل گھوڑے کا علاج کان مروڑ کر کر لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ بگڑی موٹر کا علاج بھی کان مروڑ کر ہی کرے۔ ہمارے حافظ صاحب بھی مریض اور مجرم کا فرق نہ جانتے تھے۔ لٹھ مار نشئیو کو درّے لگانے کا مشورہ دیں گے۔ ڈاکٹر اور حکیم اور ہومیو پیتھ علاج بالدوا تجویز کریں گے کچھ لوگ سوئیاں چبھوتے ہیں مثلاً بھائی، بھابھیاں اور Acupuncture والے، غرضیکہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ شادی بھی علاج کے طور پر تجویز کی گئی ہے تا کہ ایک کی بجائے دو گھر اُجڑیں تو مرگ انبوہ جشنے دارد کا سماں بن جائے۔

سائکاٹرسٹ چونکہ وکھری ٹائپ کے ڈاکٹر ہوتے ہیں جو دواؤں کے علاوہ انسانوں کی نفسیاتی ضرورتیں اور جذباتی اُلجھنیں بھی ذہن میں رکھتے ہیں اور انسانوں کے سماجی اور معاشرتی ساخت پر بھی غور کرتے ہیں اس لیے ان کا پختہ یقین ہے کہ انسانوں کی ضروریات جانوروں کے برعکس محض جسمانی نہیں۔۔۔ انسان ذہنی اُلجھنوں سے پناہ مانگتے ہیں۔۔۔ حاسدوں سے پناہ مانگتے ہیں انسان لمحاتی سکون چاہتے ہیں۔ انسان اپنے مسائل کے مستقل حل کے علاوہ وقتی سہارے بھی کھوجتے ہیں۔۔۔ غرضیکہ انسانی مسائل کا حل بھی انسانی ہونا چاہیے، حیوانی یا قانونی یا مذہبی نہیں۔۔۔

اس صدی کے شروع سالوں میں امریکیوں نے شراب کو غیر قانونی قرار دینے کا تجربہ کیا تھا۔ اب امریکی سامراج مردہ باد اپنی جگہ، یہ بات تو آپ مانیں گے کہ وہ ہم سے زیادہ Efficient اور کم بے ایمان ہیں۔ آیئے دیکھیں ان کا یہ تجربہ کیسا رہا۔ اس پابندی کے نتیجے میں شراب کسی نے چھوڑی نہیں البتہ جگہ جگہ مجرموں کے طاقتور گروہ یا مافیے قائم ہو گئے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں ہے۔ ان مافیو سائی نے ان کی پولیس کو کرپٹ کر دیا۔ ان کی عدلیہ کو کرپٹ کر دیا۔ ان کے سیاست دانوں کو کرپٹ کر دیا جیسا کہ۔۔۔ کہہ دوں؟۔۔۔ جیسا کہ ہمارے ہاں ہوا ہے۔ وہ لوگ عملیت پسند ہیں اپنے اعمال کا تجزیہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں انھوں نے بندش شراب سے توبہ کر لی کہ یہ قدم عوامی فلاح کے لیے تھا، ثواب کی لیے نہ تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بت شکنی اچھی چیز ہے اگر بت شکنی کو ہی بت نہ بنا لیا جائے۔

اس کے بعد بھی مہذب قوموں کا ایک صدی کا تجربہ موجود ہے۔ علاج منشیات کا اخلاقی ماڈل، جرم و سزا والا ماڈل اور امتناع والا ماڈل کامیاب نہیں ہو سکے۔ میڈیکل ماڈل کو کچھ کامیابی ملی ہے مگر اس میں Relapse Rate یعنی بیماری کے عود کرنے کی شرح بہت زیادہ ہے۔ البتہ ادویاتی علاج کو نفسیاتی علاج سے ملانے سے بہتر نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان معاشروں نے ہلکی پھلکی Drugs یعنی ایسی ادویاتی اشیاء جو وقتی طور پر سوچوں کے تلاطم میں سکون پیدا کر سکیں اور بپھرے ہوئے ناقابلِ برداشت جذبات کو سہارا دے سکیں مثلاً بیئر یا چرس، قانونی راہوں سے دستیاب کر دی ہیں تاکہ لوگ، سادہ لوح لوگ، محنتی، نیک، ایماندار مگر دُکھی لوگ زیادہ طاقتور نشوں مثلاً تیز شراب اور ہیروئن سے، اور ان کو غیر قانونی طور پر مہیا کرنے والے مجرموں سے اور چوکوں میں منہ سونگھنے والوں سے بچ سکیں۔ اس طریقۂ کار کے نتیجے میں تجرباتی استعمال سے عادی مریض بننے والے نوجوانوں کے تناسب میں ڈرامائی کمی ہوئی ہے۔

OOO

حالانکہ ڈاکٹر حسن امام شیعہ بھی نہیں تھا

ایک انگریزی محاورے کے مطابق "دیوتا جس قوم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں پہلے اسے پاگل بنا دیتے ہیں۔" میں جب اس محاورے کا اطلاق آج کے پاکستان پر کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ پاکستان کے 80 فیصد لوگ ان پڑھ ہیں پاگلوں کی فیصد کیا ہے؟ ڈاکٹر حسن امام جعفری سوشل سکیورٹی ہسپتال میں میڈیکل آفیسر تھے۔ گذشتہ ہفتے شام کے وقت ڈیوٹی اوقات کے بعد چند دوست ڈاکٹروں سے گپ شپ لگا رہے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، سرما کی بارش جس کا شدید سردی کے باوجود ایک اپنا حسن ہوتا ہے۔ ایک حسین اداسی ہر شے پر چھا جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا چند قدم پر میرا کلینک ہے ذرا ہو آؤں شاید کوئی مریض ہو۔ دو دفعہ تو دوستوں نے ٹھہرا لیا تیسری دفعہ اصرار کر کے چلے گئے۔ "یار کوئی سو پچاس کما لینے دو"۔۔۔ یہ ہے الٹی چھری والے ڈاکٹروں کی اوقات اس لکھ پتیوں کے شہر میں!

کلینک پر ایک مریض تھا اسے دیکھ کر نسخہ ڈسپنسر کے حوالے کیا تم دوا بناؤ میں بڑی D تک ہو آؤں والدہ نے کہا تھا آج مچھلی لے کر آنا۔ کلینک سے باہر آ کر موٹر سائیکل کو چابی

لگا رہے تھے کہ دو اشخاص ٹہلتے ہوئے تشریف لائے ایک نے ڈاکٹر صاحب کی کنپٹی پر پستول رکھ کر چار فائر کیے اور وہ دونوں معززین ایک ڈاکٹر کو 'کیفر کردار' تک پہنچا کر ٹہلتے ہوئے تشریف لے گئے۔ فیصل آباد شہر میں آج کل عمر شریف ڈرامہ ''ڈاکٹر، ڈاکو اور ڈانسر'' چل رہا ہے۔ ڈاکوؤں کا پھیلایا ہوا یہ فکری مغالطہ عام ہے کہ ڈاکٹر بھی ڈاکو ہوتے ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر ہو یا ڈاکو جس کا جی چاہے مکھی کی طرح مسل دے۔ کیا ڈاکو بھی ڈاکٹروں کی طرح غیر مسلح ہوتے ہیں، شام کو دروازے کھول کر کلینک میں بیٹھتے ہیں، موٹر سائیکلوں پر آتے جاتے ہیں، آدھی رات کو گھنٹی بجنے پر دروازہ کھول دیتے ہیں؟ بجیرو میں چار گارڈوں کے ہمراہ سفر کرنے والے گھر پر دو دو مسلح گارڈ رکھنے والے وہ تو نہ ڈاکٹر ہوتے ہیں نہ ڈاکو شریف لوگ ہوتے ہیں، رہنما ہوتے ہیں، علماء ہوتے ہیں۔ اسی لیے کلاشنکوف والے محافظ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

ڈاکٹر تو ایک پستول بھی نہیں رکھ سکتا۔ کلاشنکوف بردار کا خرچہ کہاں سے لائے گا اور کون سا ڈپٹی کمشنر یہ سند دے گا کہ فلاں ڈاکٹر پاکستان کا شریف اور معزز شہری ہے اسلحہ رکھنے کے قابل ہے اور ڈاکٹر کلاشنکوف برداری اور کلاشنکوف برداری کی صفات کہاں سے لائے۔۔۔ کہ قلم اٹھانے والے ہاتھ اوزار اٹھانے والے ہاتھ مختتی ہاتھ کلاشنکوف نہیں اٹھا سکتے، گالیاں بک نہیں سکتے، بڑھکیں لگا نہیں سکتے، ٹانگیں توڑ دیں گے سر پھوڑ دیں گے۔ یہ بیچارے تو چھوٹے چھوٹے زخموں کو بھی سینے بیٹھ جاتے ہیں، نامرد کہیں کے۔ کیا ڈاکٹر حسن شیعہ تھے؟ یہ سوال مجھ سے ایک بہت بڑے اخبار کے بیورو آفس انچارج نے پوچھا۔ بہت ملائمت سے، بہت عزت سے، جی نہیں، وہ تو عطاءاللہ شاہ بخاری کے عزیز تھے۔ ایک ساتھی نے جواب دیا انچارج صاحب نے ہمارے سامنے اپنے نائب کو سرزنش کی نگاہ سے دیکھا! اب اچھی طرح وضاحت کر دینا! اور ہمیں مخاطب کر کے ہمیں پُرسہ دیا دیکھو جی کتنا بڑا ظلم ہو گیا۔ ڈاکٹر سید حسن امام جعفری شیعہ بھی نہ تھا۔

یہی سوال ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر کے ساتھ مجھ سے کم و بیش پچاس لوگوں نے پوچھا ہے۔ ان میں صحیح العقیدہ لوگ تو تھے ہی بعض سلیم العقل لوگوں نے بھی اسی انداز سے سوال کیا۔ اسی انداز سے حیرانگی کا اظہار اور اسی پیار سے ڈاکٹر صاحب کے قتل پر اظہارِ افسوس کیا۔ یعنی اگر ڈاکٹر حسن امام شیعہ تھا تو اس کا قتل جائز تھا، صحیح جہاد تھا؟

''دیوتا جب کسی قوم کو۔۔۔ یہ سوچ یہ نظریہ'' نفاذ بذریعہ بدمعاشی'' کا نظریہ ہے۔ نظریے کا غلبہ دنیا پر چھا جانے کا شوق، قتل و خون اور ظلم و تعدی کے ذریعے۔ بھولے بادشاہ ہو! ایسے غلبے کون ہونے دیتا ہے؟

بہت سے فرعون اسی خواہش میں مر گئے اب یار لوگ لٹھ برداری سے گن برادری تک آ گئے ہیں۔ مگر ظلم و جہالت کا غلبہ نہ کبھی ہوا نہ ہوگا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کیا ڈاکٹر صاحب شہید ہو گئے؟ یہ سوال ایسے ملک میں اُٹھایا گیا جہاں قتل کے جرم میں پھانسی لگنے والا بھی شہید ہے اور زندہ آگ میں جلنے والا بھی۔ ڈاکٹر صاحب کے قتل کے خلاف احتجاجی جلسے میں سبھی نے ڈاکٹر صاحب کی شہادت پر افسوس کا اظہار کیا، قتل بے جا پر غم و غصہ کا اظہار کیا، قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا اور غصے میں بدلے کی بات بھی کی۔ شہادت تو ہماری قوم کے نصیبوں میں لکھی ہے۔ ہزاروں سالوں سے حملہ آور دھاڑوی گھوڑ سوار اس بدنصیب دھرتی کو روندتے رہے ہیں۔ سندھ میں تو ہر دکھ تکلیف کے موقع پر ''گھوڑورے گھوڑو'' کہتے ہیں۔ جس طرح حسین عورت کا حسن اس کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے مادر وطن کی زرخیزی صحرائی اور نیم صحرائی علاقے کے بھوکوں کی ہوس ناک نظروں کی تاک میں رہی ہے۔ ہماری کوئی نسل ایسی نہیں جس نے اپنے حصے کے شہید نہیں دیے۔ غرضیکہ شہیدوں کی ایک لمبی لڑی ہے، ایک لمبا سلسلہ ہے۔ کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ نیست۔۔۔ جو شہید نہ ہوا وہ ہمارے قبیلے کا نہ تھا۔

یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک چلا اس کے بعد بیرونی حملہ آوروں کی جگہ اور فاتحین نے

لے لی جنہوں نے باری باری اپنی ہی قوم کو فتح کیا۔ اس سلسلے میں ایک بڑا ظلم یہ ہوا کہ ہماری قوم کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی بائیں بازو والوں کو بائیں کے نعرے لگانے والے حکمرانوں کے ظلم اور بے ایمانیاں نظر آنی بند ہو گئیں۔ اور دائیں بازو والوں کو اسلام کی پسندیدگی کا دعویٰ کرنے والے حکمرانوں کی بے ایمانیاں اور ظلم نظر آنا بند ہو گئے بلکہ بھینگی آنکھوں میں ہیما مالنی کی آنکھوں کا حسن نظر آنے لگا اور بعض کو تو اپنی کانی آنکھ سے حسن سیرت بھی نظر آ گیا تھا۔

ع گو کسی کام کا ہوتا نہیں بھینگا معشوق
کانے عاشق کو ملے مفت تو مہنگا کیا ہے

ڈاکٹر حسن امام کا قتل ایک سفاکانہ اقدام تھا، غیر انسانی اقدام تھا، ظلم تھا۔ سبھی قتل غلط ہوتے ہیں، صحیح قتل کوئی نہیں ہوتا۔ کسی انسان کو دوسرے انسان کی جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ماسوائے معروف قانونی طریقے سے کسی انتہائی شدید جرم کی سزا کے طور پر بعض اشخاص جنہوں نے خود ہی اپنے آپ کو قاضی، منصف اور جلاد کا مقام دے لیا ہے۔ مجرم سے قانون کے مطابق نپٹنا حکومت کا کام ہے، پورے معاشرے کا کام ہے۔ مقتولوں کا بدلہ لینا معاشرے کا کام ہے کسی ایک شخص کا نہیں ڈاکوؤں اور قاتلوں کے مسلح گروہوں سے نپٹنا معاشرے اور حکومت کا کام ہے۔ مسلح جتھوں کی موجودگی سیاسی مسئلہ ہے اور سیاسی حل کا طالب ہے۔ مرنے والے کے قریبی لوگ ظاہر ہے قتل پر مشتعل ہوتے ہیں خواہ وہ خون کے رشتے سے قریب ہوں یا نظریے کے رشتے سے مگر اس قتل کے بدلے کا حق معاشرے اور حکومت سے لے کر اشخاص کو نہیں دیا جا سکتا ان عزیزوں کے جذبات اپنی جگہ معاشرے کا چلن اپنی جگہ۔

لوگ ظلم کے بدلے کی بات کرتے ہیں۔ 'الف' کے ظلم کا بدلہ 'ب' سے لینا یعنی اگر الف قتل کرتا ہے تو اس کا بدلہ اس کے بھائی سے لینا، اس کے بچوں سے لینا، اس کی خواتین کی

بے حرمتی کرنا، اس کے گاؤں کو جلا دینا، یہ ظلم کا بدلہ نہیں ظلم در ظلم ہے۔ یہ وہ قتل ہے جو قتلوں کے سلسلے کو جائز قرار دیتا ہے۔ الف کے ظلم پر ب کو مارنا فرقہ پرستی، نسل پرستی یا سیدھی سادھی قبائلیت اور جہالت تو ہو سکتی ہے، انصاف نہیں اور جب تک سول آبادی کے ہاتھوں میں اسلحہ رہے گا۔ ایسی قبائلیت چلتی رہے گی۔ ہماری بہادر مسلح افواج اور مستعد پولیس کی موجودگی میں عام شہریوں کے ہاتھ میں اسلحہ کا کیا جواز ہے؟ لائسنس کا سوال نہیں لائسنسی بندوق بھی اسی آسانی سے قتل کر سکتی ہے جتنی آسانی سے ناجائز اسلحہ اور سر راہ ہے۔ ناجائز اسلحہ وہ ہوتا ہے جس کے ماں باپ کا پتہ نہ ہو۔

قتل کا بدلہ قتل ہر گز نہیں ہے، ظلم کا بدلہ ظلم نہیں ہے۔ یہ مطالبہ عام ہوتا ہے سر عام پھانسی دو کس لیے؟ یہ ضیاء الحق سوچ اس لیے ہے کہ نئی نسل کے اندر اگر کچھ پاکیزہ جذبات باقی ہیں تو وہ بھی پھانسی کا ڈرامہ دیکھ کر ختم ہو جائیں اور وحشیوں کی ایک نئی نسل تیار ہو جائے۔ اسے نفسیات کی زبان میں "Brutalisation" یا حس لطیف کو جانوروں اور وحشیوں کی سطح پر لانا کہتے ہیں۔ جو کبھی آمروں اور تنگ نظر رہنماؤں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ ظلم کا بدلہ یہ ہے کہ ظلم اور ظلم کا امکان ختم ہو کلاشنکوف لہرانے والے ہاتھوں سے گن چھین کر قلم، اوزار پکڑا یا جائے ظلم کا بدلہ ظلم کو مٹانا ہے ظلم کے چلن کو مٹانا ہے۔ پس نوشت ڈاکٹر حسن امام کے قتل کے ایک ہفتہ بعد صوبے کے انتظامی سربراہ فیصل آباد تشریف لائے ایک ڈسپنسری کے ڈاکٹر کو معطل کر دیا (تالیاں) تھیٹر والے ڈاکٹر کو ڈاکو سے مماثلت دے کر تالیاں کماتے ہیں۔

ڈاکٹر حسن امام کے قتل پر اس کے گھر جا کر یا ہسپتال جا کر تعزیت کرنے کا وقت وزیر اعلیٰ کے پاس نہ تھا وہاں تو گلے شکوے ہوتے، تالیاں کون بجاتا۔ بچہ لوگ تالی بجاؤ!

ooo

تعویذ گنڈے کے بارے میں

کس زبان مرا نمی فہمد

بہ عزیزاں چہ التماس کم

چونتیس (۳۴) طویل سال گزر گئے ڈاکٹری کرتے کرتے، اپنے مریضوں کو گنڈے تعویذ سے نہیں ہٹا سکا بلکہ اب تو یہ کوشش بھی ترک کر دی ہے جب سے میں نے ''باقاعدہ'' ڈاکٹروں (ایم بی ایس پلس +) کو یہ کسب کرتے دیکھا ہے۔ ان میں سے ظاہر ہے ایک بڑی فیصد تنظیموں کی پرچیوں پر پاس ہونے والوں کی ہے۔

؎ دیکھ کر رقص جنوں کو عدم

عقلِ ناکردہ کار رقصاں ہے

ڈاکٹری سائنس کی ایک شاخ ہے یا ہونی چاہیے۔ بغیر سائنسی رویے کے کسی سچائی کو سمجھنا مشکل ہے۔ دنیا کو سمجھنا مشکل تر ہے اور دنیا کو بدلنا ناممکن ہے۔ کوئی بھی سائنس آخری سچائی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی یہ تو ایک طریقۂ کار ہے دنیا کو سمجھنے کا، حقائق کو اکٹھا کرنے کا، ان سے ایک نتیجہ، ایک سوچ، ایک نظریہ نکالنے کا، ان نتائج کو عمل کی کٹھالی میں پرکھنے کا، اس عمل کے نتیجے میں ہونے والے تجربات کو اکٹھے کرنے کا، اس سے اپنے

خیالات میں ترمیم کر کے نئی سوچ، نیا نظریہ بنانے کا، اس نظریے کو پھر سے عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کا۔۔۔ وعلی ھذالقیاس

یہ عمل غیر مربوط طریقے سے ہزاروں لاکھوں سالوں سے جاری ہے۔ اس پر عمل کو مربوط طریقے سے خاص حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے کرنے کا نام ہی سائنس ہے۔ زندگی کے بارے میں آپ کی سوچ اور رویہ یا تو مصالحت کی سوچ، سائنس کے ساتھ بھی مصالحت، جہالت کے ساتھ بھی مصالحت، ''ہم ٹھہرے میراثی، ہم حسینوں پاکوں اور یزیدوں پاکوں میں فرق نہیں کرتے۔''

ویسے سائنس دشمنی بھی زندگی کرنے کا ایک اسلوب ہے جو لوگ صمیم قلب اور یکسوئی سے غیر سائنسی سوچ اپنا لیتے ہیں۔ دنیاوی طور پر خاصے کامیاب رہتے ہیں۔ تعویذ لکھتے لکھتے پیر بن جاتے ہیں اور پھر پیر سے ایم این اے، ایم این اے سے وزیر یا گورنر۔

سولھویں (۱۶) صدی کے فرانس کے ایک ''فلاسفر'' نے تو باقاعدہ طور پر عقل اور سائنس کی ہجو لکھی ہے۔ نام اس کی کتاب کا ہے۔ ''سائنس کی بے یقینی اور غرور'' یہ حضرت ہنری کارنیلیس اگر پا، کولون میں پیدا ہوئے۔ بعد میں اپنے نظریات کی ترویج کے لیے پیرس تشریف لے گئے۔ ان کے اقوال زریں میں سے چند ایک یوں ہیں۔۔۔

وہ حروف ابجد کی بے ترتیبی پر تنقید کرتا ہے۔ گرائمر پر ہنستا ہے جس میں استثناء قواعد سے زیادہ ہیں۔ شاعروں کو پاگل کہتا ہے۔ تاریخ کو داستان طرازی قرار دیتا ہے۔ تقریر کا فن، اس کے کہنے کے مطابق، خطابت کے زور پر غلطی کو منوانے کا فن ہے۔ فلسفہ ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے والی آراء کا مجموعہ ہے۔ اخلاقیات جگہ اور وقت کے ساتھ بدلتی ہے۔ یہاں کچھ، وہاں کچھ، یہاں کیا، وہاں کیا۔ تجارت دھوکہ ہے، تمام خازن خائن ہوتے ہیں۔ جنگ ایک اقلیت کے کھیل تماشے کے لیے اکثریت کے قتل کا نام ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ (اب جگر تھام کے بیٹھو کہ ہماری باری آئی)۔۔۔ ''ڈاکٹر اور دوا سے بیماری کی نسبت زیادہ

خطرہ ہے۔''

اس کی خوش قسمتی خاصی سست رفتار رہی۔ سولہویں صدی کے فرانس میں تو اسے پیروکار نہ ملے۔ آج کے پاکستان میں اس کے لاکھوں مرید ہیں جو باقاعدگی سے، ایمانداری سے اور محنت سے عقل وخرد کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔

آخری سچائی تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ ہم سب تاریکی کے ذرے ہیں جو روشنی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ کچھ لوگوں نے تھک ہار کر نیم تاریکی یا اتھاہ تاریکی کو ہی روز روشن گرداننا شروع کر دیا ہے۔ میں نے بھی ایک پروفیشنل ہونے کے حوالے سے ایک ڈاکٹر ہونے کے حوالے سے اپنے مریضوں کی جہالت کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ساتھ ساتھ اپنی بھی) اس میں ناکامی کو آج اپنے ہم پیشہ ساتھیوں سے Share کر رہا ہوں۔

سائنس کا چلن پاکستانی معاشرے میں بڑھنے کی بجائے کم ہوا ہے۔ ایک وجہ تو ظاہر ہے تعلیم کی کمی ہے۔ ہمارے سکولوں، مدارس اور مکاتب کا حال سب پر عیاں ہے۔ ایک ہی ملک میں تعلیم کے دوہرے، تہرے معیار ہیں۔ (یا ''غیر معیار'' ہیں)

ہماری ایک نمبر تعلیم بھی ایک نمبر نہیں۔ دو نمبر کی تو بات ہی چھوڑیے۔ جہالت کی فیکٹریاں ہیں جو دن رات چل رہی ہیں۔ ہمارے فارغ التحصیل تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کولمبیا کون سے براعظم میں ہے اور یہ کہ براعظم کیا ہوتا ہے۔ جغرافیہ کیوں پڑھنا چاہیے، غیر اسلامی تاریخ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟

بعض کو یہ علم نہیں کہ وہ دور جاہلیت ختم ہو چکا ہے جس سے وہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہماری جنگ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ، ہم سے زیادہ پڑھے لکھے، ہم سے زیادہ محنتی، ہم سے زیادہ ایماندار لوگوں سے ہے۔ بغیر علم اور سائنس کے ان پر چھانا اور غلبہ پانا کچھ مشکل سا لگتا ہے۔

لوگ ہیں کہ درختوں کی شاخوں سے چیتھڑے باندھ کر، یا بازو پر تعویذ باندھ کر یا

گلے میں گنڈا ڈال کر علاج چاہتے ہیں۔ کس زبان مرا۔۔۔

''کوئی میری زبان سمجھتا نہیں
عزیزوں سے التماس کیا میں کروں''

گنڈا ایک رسی کو گانٹھیں دے کر اور گانٹھوں پر پھونکیں مار کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس رسی کو مریض کے گلے میں باندھا جاتا ہے۔ تعویذ تیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر ان میں بے ترتیب حروف یا کوئی سے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ الفاظ کسی غیر زبان کے ہوں تو تعویذ زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ استعمال یہ ہے کہ اس کاغذ کو چمڑے (ریکسین نہیں) یا چاندی کی ڈبیا میں بند کر کے، اس میں ایک کالا دھاگا ڈال کر گلے میں حمائل کر دیا جاتا ہے، بعض ماہرین کے نزدیک اس تعویذ کی سیاہی کو پانی میں حل کرنے سے اور مریض کو پلانے سے یہ سریع الاثر ہو جاتا ہے اور وریدی ٹیکے جیسا اثر رکھتا ہے۔

ایک پرانی کہانی ایک عوامی ہیرو کے بارے میں ہے۔ بادشاہ نے اسے گرفتار کر کے ایک پتھریلے تہہ خانے میں قید کر دیا۔ خونخوار پاسبان اس پر مقرر کر دیے جو کلاشنکوفوں (یا شاید تلواروں) سے مسلح تھے۔ اب یہ ہیرو چونکہ ہیرو تھا اس لیے گھبراہٹ اس کے نزدیک نہ پھٹکی۔ اس نے ایک کوئلہ فرش سے اُٹھایا۔ دیوار پر ایک ندی کی تصویر بنائی پھر ایک ناؤ کی۔

ہیرو ناؤ میں سوار ہوا، چپو ہاتھ میں پکڑا، خدا حافظ زندان، خدا حافظ محافظو، ہمارا ہیرو مسکرایا (بلکہ طنزآمیز ہنسی بھی ہنسا) کیونکہ وہ اب آزاد تھا۔

امید ہے آپ کو یہ کہانی پسند آئی ہو گی مگر افسانہ افسانہ ہے اور حقیقت حقیقت، دیوار پر کھینچی ہوئی لکیروں کی ناؤ نے آج تک کسی کو آزاد نہیں کیا۔ نہ ہی رسیوں میں دی ہوئی گانٹھیں یا کاغذ پر آڑے ترچھے الفاظ اور لکیریں کسی مرض کا علاج ہیں۔

OOO

تمام قاتل باغیرت ہیں

کبھی والدین اپنے بچوں کو سچ بولنے کا درس دیتے ہیں، کبھی سے میرا مطلب تقریباً ننانوے فیصد لوگ ہیں، باقی ایک فیصد میں وطن فروش، مذہب فروش، ہیروئن فروش وغیرہ آجاتے ہیں۔ جو خود بھی جھوٹ کی کمائی کھاتے ہیں اور اپنی لاڈلی اولاد کو بھی یہی پٹی پڑھاتے ہیں۔ اس لیے وہ ملتانی محاورہ کہ دوطرح کے انسانوں کا کوئی علاج نہیں، ایک وہ جو دریا پار جا کر گالی دے اور دوسرا وہ جو منہ پر جھوٹ بولے۔

جو رشوت خور دفتر میں بیٹھ کر ایمانداری پر لیکچر دے، جو سیاسی یا مذہبی لیڈر پاکستانیوں کو پاکستانیوں سے لڑائے اور قومی اتحاد کی بات کرے، جو نظریہ دان انسانی حقوق کی بات کرے مگر اہلِ وطن کو "ایک نمبر" اور "دو نمبر" شہریوں میں تقسیم کرے۔ اکثریت کے حقوق عورتوں کو دینے پر آمادہ نہ ہو، ان سب اقسام کے لوگوں کا کیا علاج ہے۔ ان لوگوں کا اپنا ایمان تو خراب ہوتا ہی ہے دوسرے لوگوں کا دماغ خراب کرتے ہیں۔ عام آدمی کنفیوژ ہو جاتا ہے جب اس کا واسطہ کسی شعوری طور پر جھوٹ بولنے والے سے پڑتا ہے۔

ایک بچپن کی پہیلی یاد آئی ہے۔ تین مکھیاں ایک قطار میں دیوار پر بیٹھی تھیں۔

ا۔۔۔ب۔۔۔ج۔ درمیان میں بیٹھی مکھی "ب" کہتی ہے، دو مکھیاں میرے آگے ہیں، دو مکھیاں پیچھے ہیں۔۔۔ آپ بتائیں یہ کس طرح ممکن ہے جب آپ اپنے ذہن کا پورا زور لگا لیتے ہیں تو ہار مان لیتے ہیں۔ اچھا بھئی میں ہارا، تم صحیح جواب بتاؤ۔۔۔ تو صاحب صحیح جواب یہ ہے کہ مکھی "ب" جھوٹی ہے۔۔۔

دنیا میں جھوٹے لوگ بھی ہوتے ہیں، بے ایمان بھی۔۔۔ پاک وطن پاکستان میں جھوٹے بھی ہیں، بے ایمان بھی ہیں، قاتل بھی ہیں، دہشت گرد بھی ہیں، رشوت خور بھی ہیں، ملک دشمن بھی ہیں۔ کب تک اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہیں گے ہم۔

ہمارے اردو پریس نے اور سرکاری ترجمانوں نے دہشت گردوں اور قاتلوں کی وکالت اپنے ذمے لے لی ہے۔ آج کسی جگہ دہشت گردی ہوتی ہے کل کے اخبار میں خبر آتی ہے اور ساتھ ہی یہ صفائی بھی کہ کوئی مسلمان کوئی پاکستانی یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس میں بیرونی ہاتھ ہے۔

خدا کے لیے بچپن سے باہر آؤ۔ ہر معاشرے میں اچھے برے سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور ہم مسلمان اور پاکستانی ہونے کے علاوہ (شاید) انسان بھی ہیں اور ہم میں بھی انسانی اور بشری کمزوریاں ہیں۔ اب تک ہم پر جو بیتی ہے وہ ہمارے ہی کرتوت ہیں اگر ملک میں جہالت بڑھی ہے، جھوٹ بڑھا ہے، منافقت بڑھی ہے، رشوت بڑھی ہے، بدمعاشی بڑھی ہے، اسلحہ بڑھا ہے، قتل و غارت بڑھی ہے، تو یہ سب ہمارا ہی کیا دھرا ہے۔ ہر آدمی بنیادی طور پر اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ ہر قوم اپنی کوتاہیوں کی ذمہ دار ہے۔

کس بیرونی ہاتھ نے "کہا" ہے کہ اپنی اسّی فیصد قوم کو ان پڑھ رکھو۔ کس بیرونی ہاتھ نے "حکم دیا" ہے کہ پاکستانی پاکستانیوں کو قتل کریں اور اپنے قبیح فعل پر نادم ہونے کی بجائے بڑھکیں لگائیں چھرا لہراتے ہوئے دفعان ہو جائیں۔ قتل عمد کو فرض کی تکمیل گردانیں اور اپنے جرم کے معاوضے کے علاوہ ثواب کی امید بھی رکھیں ان قاتلوں کی وکالت کا شوق

اردو پریس کو ہے جو انسانی قتل وخون سے لذت بھی لیتا ہے۔

''بھون ڈالا''

''پھانسی دے ڈالی''

کیفر کردار تک پہنچایا

فریضہ ادا کر کے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔۔۔ یہ ہیں خدا واسطے کے یا پنجابی میں ''دگھانے'' کے وکیل۔۔۔ آیے دیکھیں خود قاتل ان قتلوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ہمسایہ ملکوں کے پیسے سے قتل کرنے والے مکرتے نہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم یہ قتل اپنے فرقے یا مذہب یا ثواب کے لیے کرتے ہیں، دنیا پر چھانے کے لیے ایسے قتل زیادہ تر ۱۹۷۷ء کے بعد سے ہوئے ہیں شاید ''بیرونی'' کے علاوہ اندرونی Sponsor بھی مل گئے ہیں۔

کچھ قاتل حکومت پر قبضے کے لیے جمہوریت اور پارلیمان اور آئین کا قتل کرتے ہیں۔ ان کے اخباری اور سیاسی وکیل کہتے ہیں یہ قتل استحکام کے لیے ہیں۔ نصف صدی میں یہ قتال عظیم وکبیر تین بار ہوا۔

اور اب تک انسانی رشتوں کے خون کے، انسانی اعتماد اور پیار محبت کے خون کے یہ قتل پاکستان، بالخصوص پنجاب کے گاؤں میں روز روز ہوتے ہیں۔ یہ قتل عورتوں کے ہیں، ان بدقسمت عورتوں کے جن کو زمین کی وراثت میں سے کچھ حصہ ملنا ہوتا ہے، یا جو خاوند کی دوسری شادی میں مزاحم ہوتی ہیں۔ کسی دور دراز گاؤں کی کوئی عورت بھائیوں سے حصہ مانگنے پر قتل ہو جاتی ہیں۔ چچا بھتیجی کو قتل کر دیتا ہے، بیوہ ماں جس کے نام زمین ہے شادی کا ارادہ کرتی ہے خبر آتی ہے باغیرت بھائی نے بہن کو قتل کر دیا۔ باغیرت خاوند نے بیوی کو قتل کر دیا۔۔۔ اور۔۔۔ اور باغیرت بیٹے نے ماں کو قتل کر دیا۔ ماں جس کے قدموں تلے جنت ہے اس کا قاتل باغیرت ہے۔ یہ ڈگری اسے اردو پریس کی یونیورسٹی سے عطا ہوئی ہے۔ باغیرت بھائی نے بہن کو قتل کر دیا خبر کے ساتھ ہی یہ ڈگری عطا ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی

پینڈو جج مل گیا تو سزا میں رعایت بھی مل جائے گی۔ مقتولہ کی زمین بھی مل جائے گی، اسی لیے زمین کے لیے کیے گئے عورتوں کے تمام قتل غیرت کے قتل ہیں۔ خدا جانے شہریوں کی غیرت کہاں ہے۔ وہ اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو قتل کیوں نہیں کرتے۔ غرضیکہ میری بدنصیب قوم کے تمام قاتل باغیرت ہیں، اس قوم کے تمام بھائی، خاوند، چاچے اور بیٹے باغیرت ہیں اور مظلوم اور مقتول بہنیں، بیویاں، بھتیجیاں اور مائیں بے غیرت ہیں۔۔۔

لَيتَنِی کُنتُ تُرابا

اے کاش میں مٹی ہوتا

OOO

شہر جو ماں کے دل جیسا ہو

انسان لاکھوں برس تک غاروں میں رہا۔ غاروں سے باہر جنگل تھا۔ درندے تھے، خوف تھا، موت تھی۔ غار انسان کی اوّلین پناہ گاہ تھی جو اسے دشمنوں سے بچاتی تھی۔ پھاڑ کھانے والے شیروں سے بچاتی تھی۔ آدم خور انسانوں سے بچاتی تھی۔ یہ بھی جانے انجانے خوف اسے بھوت پریت کی صورت دکھائی دیتے تھے۔ اجتماعی انسانی تحت الشعور سے یہ خوف ابھی تک نہیں گیا۔ یہ نیند میں اسے آلیتا ہے۔ ڈراؤنے خواب اسے حقیقت لگتے ہیں۔

زندگی کے کمزور لمحوں میں یہ خوف اس کے رگ وپے میں سرسراتا ہے۔ یہی اندرونی خوف اور بیرونی سائے اس کے توہمات اور الہیات کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس خوف پر قابو پانے کے لیے انسان طرح طرح کے نظریے گھڑتا رہتا ہے جیسے عام زندگی میں یا تو ڈرانے والی چیز کے سامنے سربسجود ہو جاؤ یا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو امیر المومنین کہہ دو یا اس خوف کا مقابلہ کرو اس میں جان کا خطرہ ہے، مال کا خطرہ ہے۔ غرض یہ کہ زندگی ہر لمحہ ہر پہلو خطرہ ہی خطرہ ہے۔ کاش کہ میں اپنی محفوظ غار میں لوٹ سکتا۔ غار کی تاریکی میں عافیت ہے۔ 'چٹے' دن میں خطرہ ہے، ماضی محفوظ پناہ گاہ ہے، حال میں خطرہ ہے۔ مستقبل میں عظیم تر

خطرہ ہے۔ آؤ ماضی میں چلیں، بگٹٹ، دوڑ لگائیں، غار کی نیم تاریکی میں آگ کے پاس بیٹھی ماں خوف زدہ بچے کو تسلی دینے کے لیے بے چین ہے۔ آؤ ماضی میں چلیں، ماں کے پاس۔۔۔

بچہ جب تک رحم مادر میں ہوتا ہے تو وہ جسمانی درجہ حرارت والے پانی میں تیرتا رہتا ہے۔ نہ کھانے کی فکر نہ سانس کی فکر، نہ فردا کی فکر اور نہ کوئی فکر نہ کوئی سوچ۔۔۔ کہ بہت تکلیف دہ عمل ہے۔

اور اس سے زیادہ تکلیف دہ عمل پیدائش کا عمل ہے کہ تخلیق رحم مادر سے کھلی ہوا تک کے سفر کا نام ہے۔ پیدائش تکلیف دہ عمل ہے۔ زندگی اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مصائب کا نام ہے زندگی، کچھ کرنے کا نام زندگی ہے۔ دھرتی کو بنانے کا نام ہے زندگی، معاشرے کو سنوارنے کا نام ہے۔ زندگی مشکل، بہت ہی مشکل۔

اور اس لیے وہ کسک، وہ رحم مادر میں لوٹ جانے کی کسک، اپنی محفوظ غاروں میں جانے کی خواہش۔ اپنے "شان دار" ماضی کی طرف رجوع۔ اس کے نتیجے میں دو واضح انسانی رویے۔ آؤ اپنا قبلہ ماضی کی طرح کر لیں یا آؤ زندگی میں شامل ہو جائیں۔ اپنے آج کے لیے محنت کریں تاکہ ہمارا آنے والا کل تابناک (یا بقول شخصے تاں باک) ہو جائے۔ کہ غاروں سے لے کر یہاں تک انسان اپنی ہی شبانہ روز محنت سے آیا ہے۔ انسانی معاشرے کی ترقی کا سفر، بہت تکلیف دہ سفر تھا۔ انسان ایک جان گداز انچ اور تکلیف دہ انچ کر کے آگے بڑھا ہے اس راستے میں پسپائیاں بھی بہت آئی ہیں۔ ایک ہی چنگیز اور ہلاکو معاشرے کو میلوں (اور صدیوں) پیچھے لے گیا اور انسانیت کو طے کیا ہوا اور سفر دوبارہ سہ بارہ کرنا پڑا۔ تکلیف دہ انچ، حوصلوں اور مایوسیوں سے عبارت انچ انچ۔۔۔

آگے جانے والے، آگے لے جانے والے الگ گروہ رحم مادر کی کسک والوں کا الگ گروہ۔۔۔ دن کی سفیدی، رات کی سیاہی۔۔۔ الگ الگ۔۔۔ تار۔ حریر دو رنگ، جس سے بناتی ہے ذات اپنا قبائی صفات۔ دو وقت کبھی اک لمحے میں آپس میں ملے بھی

ہیں صاحب یا صبح کی خواہش مت کیجیے یا شام کی خواہش مت کیجیے۔ برسوں پہلے جب لائل پور کے حلقہ اربابِ ذوق میں تقسیم ہوئی تو ایک ذہن بہت صاف تھا۔ وہ عظیم شاعر جو ہمیں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ تنویر جیلانی، وہ پیارا انسان جو خیالات پر کبھی Compromise نہ کرتا تھا۔ ڈھیل نہ دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر ہفتے حلقے میں بیٹھ کر فتوے لگوانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنا کام کریں۔ انسانی سوچ میں، فکر میں، انسانی جدوجہد میں اپنا سا، تھوڑا سا حصہ ڈالیں اور ایک خوبصورت معاشرے کی خوبصورت مستقبل کی تعمیر کریں۔ ماضی کی ڈائینوں اور جنوں بھوتوں سے جان چھڑائیں، آؤ

آؤ ایسا شہر بسائیں
شہر جو ماں کے دل جیسا ہو
بچوں کی آنکھوں میں چمکتی
صبح مستقبل جیسا ہو
جس کو فرشتے دیکھنے آئیں
آؤ ایسا شہر بسائیں (تنویر جیلانی)

OOO

چک جھمرہ کا بکرا

چک جھمرہ لائل پور کے نواح میں ایک قصبہ ہے۔ اب کہ گاؤں قصبے بن گئے ہیں۔ چک جھمرہ جنکشن بھی ایک شہر کا روپ دھارن کر چکا ہے۔ ریلوے لائن کے دونوں جانب کچی بستی اور اس سے آگے آنندی۔

ایسے ہی قصباتی شہروں میں پاکستانی رہتا ہے۔ ایک عام پاکستانی۔ چک جھمرہ میں رہتا ہے احمد دین۔ لوگ شاہ جی کہتے ہیں۔ کلرک ہے دونوں کاف سمیت مگر ایماندار ہے۔ بس سفید پوشی نبھا رہا ہے۔ دو بیٹیاں ہیں۔ حسن بیٹا ہے سب سے چھوٹا۔ پانچ سال کا۔ گھر بھر کی رونق، سب اسے دیکھ کر جیتے ہیں۔ ضد کر بیٹھا کہ قربانی کے لیے بکرا لوں گا۔ اب کہاں ایک عیالدار، ایماندار کلرک اور کہاں قربانی کا بکرا۔ پر حسن کی بات کون ٹالے، لگ گیا گھر بھر بچت پر اور عید سے دو ماہ پہلے ہی حسن کا بکرا آ گیا، پلا پلایا جی دار بکرا۔ مقصد یہ تھا کہ حسن دو ماہ جی بھر کے کھیل لے پھر فریضہ بھی ادا ہو جائے گا۔ گھر بھر کو مصروفیت مل گئی اور حسن کو کھلونا۔

رہا بکرا، تو وہ بھی ذی رُوح ہے، پنجابی محاورے میں آخر انسان ہے۔ اس کی اپنی

سوچ، اپنی خواہشیں، اپنی امنگیں، اپنے جذبات، اپنے نظریات، اپنے خواب۔ چارے کے خواب، چنوں کے خواب، بیسیوں بکریوں کے خواب، دنیا پر چھا جانے کے خواب۔ تھا تو وہ اک بے زبان بکرا مگر گلا کسی ملّا کا تھا۔ رات دن، وقت بے وقت چلاتا تھا۔ طالب علم اور محلے دار تنگ تھے مگر قربانی کے بکروں پر کون انگلی اٹھائے۔ کیا پتا اس بات میں بھی گناہ ہو۔۔۔ گناہ کہاں نہیں!

بکرے کے بولنے میں شدت اس وقت آتی جب ٹرین جھمرہ کی حدود میں داخل ہوتی۔ خیر ٹرین سے تو پورا شہر تنگ تھا۔ ایک تو یہ انگریز کی یاد دلاتی تھی، دوسرے اس کی شکل کانے دجال سے ملتی تھی۔ تیسری اور بڑی وجہ صبح تین بجے آنے والی ٹرین تھی۔ اب یہ وقت ایسا تھا کہ نہ تو نماز کے لیے اٹھنے کا تھا اور نہ ہی دوبارہ سونے کا۔ جھمرہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ بکرے میاں کی ناراضگی کے اسباب اور تھے۔ انجن کو ان کے علاقے، ان کی جوہ میں داخلے کی ہمت کیسے ہوئی۔ کیا وہ نہیں جانتا، میں کون ہوں، کیا وہ نہیں جانتا میں پاگل آں، سیٹیاں بجاتا ہے خنذیرا!

گھر والوں نے سمجھایا، راہ چلتے راہیوں نے کہا، بکروں کو انجنوں سے نہیں ٹکرانا چاہیے، پر کون سنتا۔ جتنا جتنا لوگ سمجھاتے اتنا اتنا اس کا جنون بڑھتا، اور بھی زور سے بولتا، کیا بولتا تھا کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کوئی الگ سی زبان تھی، پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہ تھی، اردو نہ تھی اور انگریزی تو بالکل نہ تھی۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتے بچے کوئی لفظ انگریزی کا بول دیتے تو بکرے کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے، نچلے جبڑے سے لٹکتے ہوئے چند بال اکڑ جاتے، آواز اور بلند ہو جاتی۔ غرض اس نے نہ سمجھنا تھا نہ سمجھا۔

اب چونکہ وہ اس گھر کا پہلا بکرا تھا اس لیے اس کے گلے کی رسی بھی نئی تھی، ورنہ تو کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور جب انجن بکرے سے بلند آواز نکالتا تو جھمرے کے بکرے کا خون کھول جاتا، جی چاہتا ابھی رسّی تڑا کر اس مردود پر خودکش حملہ کر دوں۔ دنیا کو بتا دوں کہ

دہشت گردی کا اصل سبب کیا ہے۔ اصل تعریف کیا ہے دہشت گردی کی مگر ہر دفعہ رسّی کا نیا پن آڑے آ جاتا۔

بزرگوں نے کہا ہے سانچ کو آنچ نہیں اور ہمتِ مرداں مددِ خدا اور بھی ایسی ہی اچھی اچھی باتیں۔۔۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ روز روز کی گھس گھس سے رسی گھس گئی۔۔۔

عید سے دو دن پہلے بکرے نے رسی تڑوالی۔

کہتے ہیں شہید کبھی نہیں مرتے

ooo

فتح کشمیر تو معمولی بات ہے

ہم نے تو ایک افغان جرنیل کے نام پر ایک میزائل بھی بنالیا ہے۔ باقی جرنیلوں اور فاتحین کے نام پر مزید میزائل بنانے کا مطالبہ ملک کے مختلف حلقے کر رہے ہیں جن میں چوہدری محمد رفیق تارڑ بھی شامل ہیں۔ بس جمعے کی چھٹی کی دیر ہے۔ یہ کام تو پلک جھپکتے میں ہو جائے گا اور اس سے اگلے جمعے کی چھٹی کے روز کشمیر بھی دیکھ لیں گے۔

کچھ کام البتہ بہت مشکل ہوتے ہیں بالخصوص جب ہم یہ طے کر لیں کہ ہم نے یہ کام خود انحصاری کی بنیاد پر کرنا ہے۔ امریکہ سے رہنمائی لینی ہے تو صرف سیاسی اور مذہبی معاملات میں۔ انسانی حقوق، نکاسی آب، فراہمی آب، تعمیر سڑکات وغیرہ میں ہم امریکی رہنمائی سے بے نیاز ہیں۔ کشکول ہم نے توڑ دیا ہے۔ اس لیے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا بھی یہ کام نہیں۔ اسلامی ملکوں کی کمیٹی کشمیر اور فلسطین سے فارغ ہے۔ ہمارے ہمسایوں بھارت اور افغانستان میں نفاذ دین کا مسئلہ ہے۔ ایران ابھی رشدی سے فارغ نہیں ہوا۔

کون ہے جو اس برے وقت میں ہماری امداد کرے۔

آیئے اب اس مسئلے کی طرف آئیں اس کا تعلق فیصل آباد شہر سے ہے۔ فیصل آباد

ایک ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں ایک کمشنر صاحب بھی ہیں۔ یہ ایک ضلعی صدر مقام ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ہیں، ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر ہیں، ایس ایس پی صاحب ہیں، ایس پی ٹریفک ہیں۔ فیصل آباد ایک میونسپل کارپوریشن ہے۔ یہاں ایک لارڈ میئر بھی بنے گا یعنی آبائے شہر کا باپ۔ نہ ہو تو ایک بہت سینئر اور ذمہ دار افسر جو حکومت وقت کے موافق ہو ایڈمنسٹریٹر کے فرائض انجام دیتا ہے۔

اس شہر کی نمائندگی کے لیے کم از کم تین ایم این اے ہیں۔ پورے ضلع کے لیے نو ہیں۔ اس سے دگنے ایم پی اے ہیں اتنے بڑے بڑے افسر، اتنے بڑے بڑے رہنما، مذہبی غیر مذہبی، بیسیوں اخبار ہیں، قومی اور غیر قومی، ٹرانسپورٹر ہیں، جن کا اس مسئلے سے براہ راست تعلق ہے، وہ حضرات جو ٹرانسپورٹ سے ایم این اے اور وزیر بنے۔ ڈسٹرکٹ کونسل کے مالک و مختار بنے۔ یہ مسئلہ حل نہ ہوا۔

اور پھر عوام ہیں، جن میں سے روزانہ کم از کم ایک لاکھ کا اس مسئلے سے براہ راست واسطہ پڑتا ہے۔ عوام کالانعام۔ بہت سالوں تک میں اس کا مطلب کوئی تعریفی جملہ سمجھتا رہا۔ انعام یافتہ قسم کی چیز۔ تب کسی عربی دان نے بتایا کہ عوام کالانعام ''ڈھور ڈنگر'' جیسے عوام کو کہتے ہیں۔

صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے کروڑوں کی گرانٹ دی۔ اس شہر کے لیے پیکج کی خبریں بارہا چھپیں۔ شاہ فیصل نے سنا ہے کہ کروڑوں دیے تھے۔ وہ کہاں گئے؟ احتساب سیل والے جانیں۔

تو آیئے اب مسئلے کی طرف۔

آج سے چھ سات سال پہلے ہمارے ازلی دشمن بھارت نے پرتھوی میزائل کا تجربہ کیا۔ وہ میزائل شومئی تقدیر سے پاکستان کے شہر ثالث، فیصل آباد کے لاری اڈے کی سامنے والی سڑک پر آن گرا۔ ایک کھڈا کہ طول جس کا ڈیڑھ فرلانگ، چوڑائی پچاس فٹ اور گہرائی

تین سے پانچ فٹ ہے، بن گیا۔ اسی کھڈے میں سے سارا دن اور ساری رات فیصل آباد کے معروف لاری اڈے کی ساری ٹریفک گزرتی ہے۔ اب یہ ٹریفک رکے تو وہ کھڈا بھرا جائے۔

یہ تو نہیں ہے کہ تمام رہنما اور افسران اندھے ہیں۔ وہ تو محب وطن اور فرض شناس ہیں۔ دن رات مسلح محافظوں کے جلو میں رزق حلال کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ بس ایک ٹریفک ہے جو رکتی نہیں کہ کھڈا بھرا جائے۔ ہماری قوم نے تو ابھی کشمیر آزاد کرانا ہے، دنیا پر اسلام کا غلبہ قائم کرنا ہے، یہ کام تو معمولی ہے۔

ooo

قُقنس

لفظ ’’ققنس‘‘ یونانی لفظ Phonenix کا عربی رُوپ ہے۔ ’’ققنس‘‘ دیو مالا Mytholohy کا ایک پرندہ ہے جو سنا ہے کہ عربستان کے بیابانوں میں رہتا ہے کہا جاتا ہے کہ یہ کئی صدیاں عمر پاتا ہے اور جب اس کا آخری وقت آتا ہے تو وہ لکڑیاں جوڑ کر ان کے اندر بیٹھ جاتا ہے اور ایک روایت کے بموجب دیپک راگ گانے لگتا ہے۔ جس سے وہ لکڑیاں آگ پکڑ لیتی ہیں۔ ایک روایت ہے کہ وہ اپنے پر اس زور سے پھڑ پھڑاتا ہے کہ ان میں سے آگ نکل آتی ہے اور لکڑیاں جل اٹھتی ہیں اور ’’ققنس‘‘ ان میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

پھر اس راکھ پر بارش ہوتی ہے ایک انڈہ پیدا ہوتا ہے جس میں سے ایک نیا ’’ققنس‘‘ جنم لیتا ہے۔

ققنس ڈوب کر پھر ابھرتے سورج کا
موت کے بعد نئی زندگی کا
نشان ہے
ققنس، اداس شام کے بعد

نئی سحر کا وعدہ ہے
ققنس ٹوٹی ہوئی آسوں سے ابھرتی ہوئی
سدھروں کی لوک لہر کی کوک ہے
پنجاب کی اب تک کی تاریخ میں
ققنسوں کی ایک لڑی چلی آ رہی ہے

(میجر اسحاق کے پنجابی ڈرامہ ققنس سے اقتباس)

پورس، نانک، دلا بھٹی، بھگت سنگھ، حسن ناصر اور میجر اسحاق مزدور کسانی پارٹی کے بانی اور تاحیات صدر، دانشور، فلاسفر، ڈرامہ نگار، انقلابی، جنگ کشمیر کا ہیرو۔ ''جب وہ کشمیر کی جنگ میں بطور رضا کار شامل ہوا تو اسے پتہ نہیں تھا کہ انقلاب کیا ہوتا ہے۔ وہ پاکستان کے ایک ادنی اور فرض شناس سپاہی کی حیثیت سے اس میں شامل ہوا تھا مگر مفاد پرست سیاستدانوں نے کشمیر کو جس طرح اپنی اغراض پر قربان کیا اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ میں اس جال کو توڑوں گا۔''

''جنگ کشمیر کے تجربے نے اسے سمجھا دیا کہ دشمن کی کمیں گاہ تو کہیں اور ہے پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ بھی جنگ کے مورچے ہیں۔ اس کے پاس ہتھیار نہیں تھے مگر اس کے پاس مظلوم انسانوں کی جلتی ہوئی مشعلیں تھیں انہی کو ایک مرکز پر جمع کرنا شروع کر دیا۔'' (احمد بشیر)

''اسحاق کی سیاسی زندگی کا حال سب جانتے ہیں۔ مزدور کسان مسائل میں اور لوگوں نے بھی حصہ لیا لیکن جس خلوص ثابت قدمی، ایثار اور جانثاری سے اسحاق نے سب سکھ آرام تج کر اور درویشی کا چولا اوڑھ کر اس مظلوم طبقے میں اپنی ذات کو جذب کیا اس سے نردا کے الفاظ یاد آتے ہیں۔

''میں تمہاری جھونپڑی کی خاک میں مل کر خاک ہو گیا ہوں۔ میں تمہاری سیاہ

باجرے کی روٹی کا ایک نوالہ اور تمہارے چاک چاک کرتے کی ایک دھجی بن گیا ہوں۔''
(فیض احمد فیض)

میجر اسحاق حقیقی انسان تھے، ایک حقیقی سوشلسٹ۔ جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے اپنے آپ کو مظلوم طبقات کے کاز کے لیے کلی طور پر وقف کر رکھا تھا۔ وہ انتہائی بے لوث اور آہنی ارادہ رکھنے والے انسان تھے۔ پاکستان کے مقدر میں نہ تھا کہ مستقبل قریب میں ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا لیکن خدا اس قوم کو معاف نہیں کرتا جو اپنے حقیقی قائدین پہچاننے سے محروم ہو۔ ہم اسحاق کے لیے نہیں روتے ہم تو اپنے لیے روتے ہیں۔
(میجر جنرل احسان الحق)

''ان کا مشن ہمارا مشن ہونا چاہیے۔ وہ انسان کے علاوہ ایک مسلسل جدوجہد کا دور تھے جس نے انہیں لافانی کر دیا ہے جب تک یہ منزل ہم نہیں پا لیتے یہ جدوجہد اسحاق محمد کی جدوجہد کہلائے گی اور جب ہم یہ منزل پالیں گے تو یہ منزل بھی انہی کی ہوگی۔''

(محمد لطیف رندھاوا)

''میجر صاحب کے بعد یہ مشکل نہیں رہ گئی کہ انقلاب ضرور میری زندگی میں ہی آئے۔ یہ سبق انہوں نے مجھے دیا ہے انقلاب خواہ میری زندگی میں نہ آئے مگر آئے گا ضرور، یہ ان کو بھی پتا تھا یہ مجھے بھی پتہ تھا۔'' (سیّد رضا کاظم)

''اور پھر اچانک ایک دن ان کے بچھڑنے کی خبر ملی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے ہم پنجابیوں کے سر سے مسلسل چھاؤں کرنے والا برگد ٹوٹ گیا۔'' (فخر زمان)

''مجھے ان سے ایک اعتراف حقیقت بھی کرنا تھا انہوں نے اپنے اخبار میں ہمارا نام لے کر لکھا تھا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ سچے اور ثابت قدم دوست کون ہوتے ہیں اور چرب زبان اور منافق دوست کون۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ آپ مجھے جو محسوس کرانا چاہتے تھے وہ وقت اور حالات نے ہمیں محسوس کرا دیا ہے آپ صحیح کہہ رہے تھے لیکن بحث

مباحثہ، لڑائی اور اعترافِ حقیقت کا موقع دیے بغیر ہی وہ اچانک چل دیے۔ اب ایسے عزیز دوست، بھائی اور ساتھی کے بچھڑنے کے دُکھ کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ کوئی کہاں سے لائے؟ اور پھر ایسے دکھوں کے سامنے بیچارے الفاظ کی اوقات ہی کیا؟ ان کے لیے کس طرح روؤں؟ (رسول بخش پلیجو)

''جو لوگ میجر اسحاق محمد کے قریب رہے ہیں ان کے لیے ماننا مشکل ہے کہ وہ باقی نہیں رہا، وہ مرنے والا شخص نہیں تھا۔ اس نے زندگی کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے، وہ موت سے کیسے ہار مان گیا، کیسے سمجھ لیں کہ وہ چلا گیا ہے۔ پہلے بھی اسی طرح اٹھ کر چلا جاتا تھا اپنے کسانوں کے پاس فصیلوں اور مظلوموں کے پاس سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب کی مٹی کو سلام کرتا ہوا پاکستان کی عظمت کے خواب دیکھتا ہوا۔ سوتوں کو جگاتا ہوا اور جاگتوں کو راستہ دکھاتا ہوا وہ ہمیشہ چلتا رہتا تھا مگر پہلے تو وہ لوٹ کر آ بھی جاتا تھا اب۔۔۔ اس کو دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں یا الٰہی وہ کیسی بستیاں ہیں جہاں سے پیارے لوگ واپس نہیں آتے۔''

''وہ آدمی نہیں تھا پیار کا ایک بہتا دریا تھا وہ چٹانیں توڑنے اور راستے بنانے کے لیے آیا تھا تاکہ فصیلوں اور مظلوموں کی منزلیں آسان ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ برفوں میں گلاب اگیں اور صحراؤں میں بلبلیں چہکیں۔ وہ ایک خوش نوا فقیر تھا۔ رانجھے سے اس نے بانسری لی۔ مرزے کا تیر کمان جنڈ سے اُتارا، اور سسی کے جلے ہوئے تلووں کے نشانوں پر چلتا ہوا دور کے دیسوں کو نکل گیا۔۔۔ مگر وہ کالے بادلوں میں چھپے چاند کو دیکھ رہا ہے بھنگڑے کی لے پر ناچتے ہوئے محنت کشوں کے ساتھ ناچ رہا ہے اور کہہ رہا ہے زنجیریں توڑ کے آگے بڑھو اور اسی لے پر رقص کرتے ہوئے زندگی کو گریبان سے پکڑ لو وہ ہم میں نہیں اور لگتا ہے کہ اس کے جانے سے چاند بجھ گیا ہے اس گھپ اندھیرے میں کچھ بھی تو نظر نہیں آتا پتہ نہیں وہ میلہ باقی بھی ہے جو اس نے لگایا تھا۔۔۔ مگر وہ جو اسحاق محمد کو جانتے ہیں انہیں پتہ ہے کہ

سب کچھ اسی طرح ہے۔'' (احمد بشیر)

آج ہم اکٹھے ہوئے ہیں تاکہ میجر اسحاق کی یاد منائیں جنہوں نے انقلاب کے پرچم کو ہاتھ میں اٹھائے رکھا اور اپنی ساری عمر عوام کے لیے جدوجہد میں وقف کیا۔ میجر اسحاق کی یاد کو منانا خاص طور پر موجودہ صورتِ حال میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ سامراجی اور ان کے کتے کمیونزم اور مارکسزم کی شکست اور موت پر خوشیاں منا رہے ہیں۔''

(نمائندہ افغانستان لبریشن آرگنائزیشن۔ میجر اسحاق کی سولہویں برسی سے خطاب)

''میجر اسحاق جیسے انقلابی کی راہ شکست ناپذیر ہے۔ میجر اسحاق جیسے انسانوں کا قدر خاص طور پر اس میں ہے کہ یہ لوگ اپنے کاموں کی بدولت زندگی کے خاتمے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ آج ہم یہاں اکٹھے ہو کر ان کی یاد منا رہے ہیں۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ جو اپنی زندگی اور اپنی جان محنت کش عوام کے لیے نثار کریں وہ امر ہوتے ہیں ان کو عوام کبھی نہیں بھولتے۔''

(افغان خواتین کی انقلابی جمعیت RAWA کی نمائندہ)

ooo

ڈاکٹر مقبول اختر، کالم کار خالد حسن کے دیوانے تھے۔ جب بھی ہم اکٹھے بیٹھتے، ان کا ذکر ضرور ہوتا۔ میں، خالد حسن کو باقاعدگی سے تو نہیں پڑھتی تھی۔۔۔ گاہے بگاہے۔۔۔ کبھی، بھائی ان کے کسی خاص کالم کی فوٹو کاپی میرے لیے لیتے آتے۔

یہ مضمون، بھائی نے خالد حسن کی وفات کے بعد لکھا، لیکن مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اب ان کے کاغذات میں سے دستیاب ہوا ہے۔ تو میں اسے کتاب میں شامل کر رہی ہوں۔

مصنفہ

OOO

نمونۂ کلام

(چراغ حسن حسرتؔ کے ایام سنگاپور)

—خالد حسن—

(پیشگی معذرت: میں خالد حسن کے سٹائل کو کسی طور بھی ترجمہ نہیں کر سکا۔۔۔ نہیں کر سکتا۔ ترجمہ میں انگریزی پن زیادہ ہے، کوشش یہ ہے کہ خالد حسن کے سٹائل کی جھلک نظر آئے)

"چند ہفتے قبل، بالآخر، کراچی میں ایک کتاب چھپی ہے۔ ناقابلِ تقلید مولانا چراغ حسن حسرتؔ کے بارے میں، جنہوں نے ہلکے پھلکے اخباری کالم کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اب وہ لازماً اپنی قبر میں بل کھا رہے ہوں گے یہ دیکھ کر کہ یہ شاندار آرٹ اب کن حالات کو پہنچا دیا گیا ہے۔ ان بھاری بھر کم قلم گھسیٹوں نے جو ہر صبح اپنی ثقیل تحریروں سے قاری کو مار دیتے ہیں۔ بوجہ بوریت۔۔۔

کسی وجہ سے یہ ہر فن مولا، حکومت کو یہ بتاتے نہیں تھکتے کہ حکومت کو کیا کرنا چاہیے۔ ان میں سے ایک صاحب جب کابینہ میں جگہ پا گئے تو اپنی وزارت کے سب سے بڑے طرم خان ثابت ہوئے۔ (Bully کا ترجمہ غنڈہ بھی ہو سکتا ہے)

سبق اس کہانی کا یہ ہے کہ لوگوں کو وہی کرنا چاہیے جس کی ان میں لیاقت ہے، یا اہلیت ہے، یا ان کے لیے ممکن ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ حملہ آور ہوں، ان زمینوں پر، جن کے بارے میں وہ مکمل لاعلم ہیں۔

'فیلڈ مارشل' بعد از موت شائع ہونے والی ڈائریوں میں لکھتا ہے (خالد حسن رقم طراز ہے: کبھی نہ لکھتا) کہ ڈان کا ایڈیٹر الطاف حسین، جو سب کو لیکچر دیتا تھا، یہ کرو، وہ نہ کرو، وزیر بننے کے بعد اپنا منہ تک نہ کھولتا تھا۔۔۔ خیر یہ قصہ کسی اور دن کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔

آیئے، مولانا کی بات کریں۔ میرا دل یہی چاہتا ہے۔ قابلِ صد احترام، سدا بہار، مولانا چراغ حسن حسرت، جن کے لیے ہر بندہ مولانا تھا کہ وہ اسی طرح سب کو بلاتے تھے۔ کئی سال ہوئے فوت ہو گئے۔ ان کی یاد دلوں میں تازہ ہے، ان کو جاننے والے لوگ، یا ان کے ساتھ کام کرنے والے، عظیم بت شکن احمد بشیر جیسے لوگ، اب دوسری طرف پہنچ گئے ہیں، فرض کر لیں کوئی دوسری طرف بھی ہے۔۔۔

میرا خیال ہے ۱۹۹۹ء میں لاہور کے ایک ماہ نامہ Sputnik نے چراغ حسن حسرت کی یاد میں ایک مضمون چھاپا، یہ مضمون ضمیر جعفری اور مسعود احمد نے ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا جس میں انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران، سنگاپور میں گزارے ہوئے شب و روز کو یاد کیا ہے۔ یہ تینوں حضرات ساؤتھ ایشیا کمانڈ کے پبلک ریلیشنز کے شعبے میں کام کرتے تھے۔ حسرت یا میجر حسرت، کیونکہ وہ میجر حسرت تھے۔ جیسا کہ فیض، کرنل فیض تھے۔ مولانا اپنے شعبے کے چیف تھے، جعفری اور مسعود ان کے نائبین۔

مولانا کے ماتحتوں میں، ایم۔ ایچ عسکری بھی تھا جسے ہم سب کمانڈر عسکری کہتے تھے۔ حالانکہ اس کا نیوی کا علم اتنا ہی تھا جتنا ہمارے صدر مملکت کا ہجوں کا علم، صدر صاحب یقیناً ہجوں کے بین الاقوامی مقابلے کے چمپئن نہیں بننے والے۔

پیشتر اس کے کہ میں سنگاپور کی طرف لوٹوں اور یہ بتاؤں کہ سنگاپور کی شکست میں مولانا اور ان کے ساتھیوں نے کتنا حصہ ڈالا، یہ شکست جوان لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو بعد ازاں Honda اور Mitsubishis بنانے لگے۔

مولانا کے فرمودات، کرکٹ کے بارے میں پیش ہیں۔ ان یادداشتوں کے ایک ہیرے (Gem) کے لیے ہم ممنون ہیں احمد ندیم قاسمی کے، جو ایک دن مولانا اور دوسرے سٹاف کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مولانا اس اخبار 'امروز' کے ایڈیٹر تھے۔ جس کو جتنا بھی روئیں کم ہے۔ یعنی جس کے معیار اور ذوق کو بعد کا کوئی اخبار چھو بھی نہ سکا۔ یہ ایک روزہ گیم نہیں تھی، ٹسٹ میچ تھا۔ مولانا نے پاکستانی فیلڈروں کے بارے میں، جو گیند کے پیچھے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، کہا:

''مولانا، ہمارا کرکٹ بورڈ، ہمارے کھلاڑیوں پر ترس کیوں نہیں کھاتا؟ یہ بیچارے چھوٹی سی گیند کا پیچھا کر رہے ہیں اور گیند ہے کہ اپنی سپیڈ کم ہی نہیں کرتی۔ ہر پاکستانی کھلاڑی کو ایک بائیسکل دینی چاہیے تاکہ وہ گیند سے آگے نکل سکے۔

بیچارے! دیکھو اس مزدوری سے وہ کتنا تھک گئے ہیں۔''

چند اوورز کے بعد کہا:

''وہ دیکھو وہ جو گیند کا پیچھا کر رہا ہے۔ ایسے ہی ہے جیسے ن۔ م راشد غزل لکھ رہا ہو اور قافیہ ردیف کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ راشد آزاد شاعری کرتا تھا۔ جس کا مولانا اکثر مذاق اُڑاتے تھے۔ میں سوچتا ہوں وہ کشور ناہید کی نثری شاعری کے بارے میں کیا کہتے؟۔۔۔ ایک دفعہ تو اسے بھی چپ لگ جاتی۔

مولانا کے کلاسیکی امروز کالم کا قلمی نام تھا، سند باد جہازی۔ انہوں نے ایک بار دولتانہ کے بارے میں لکھا، اگر اس کے نام سے دولت نکال لو تو آنہ بچتا ہے۔ پاکستانی کمیونسٹوں کو وہ سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ انہیں تین قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ شالجمی،

امرود یے اور چقندر یے۔

اوّل الذکر باہر سے سرخ تھے تو اندر سے سفید۔ دوسری قسم باہر سے سفید اندر سے سرخ، تیسری قسم البتہ اندر باہر سے سرخ تھی۔

لیکن آیئے سنگاپور کی طرف لوٹیں، نوجوان مسعود احمد، کپتان کی وردی میں ملبوس، اپنی لکھی ہوئی چیز مولانا کے سامنے رکھتا ہے۔ مولانا ایک نظر ڈالتے ہیں، بغیر تبصرہ کیے اسے لوٹا دیتے ہیں۔ سگریٹ کے دھوئیں کے کثیف بادل سے ایک آواز آتی ہے۔

''اُف''

دو دن بعد مولانا نے مسعود سے پوچھا۔

''مولانا، اس تحریر کا کیا بنا؟ میں نے چھپی ہوئی نہیں دیکھی۔''

مسعود نے جواب دیا۔

''آپ نے 'اُف' کے ساتھ لوٹا دی تھی، اس لیے میں نے وہ تحریر پھاڑ دی۔''

''مولانا چھپنے دیتے، آخر اتنا کوڑا اخباروں میں چھپتا ہے، تھوڑے اور سے کیا فرق پڑتا۔''

ایک دن تو مولانا نے مسعود کی تقریباً تعریف ہی کر دی۔

''مولانا تم محنت تو بہت کرتے ہو، شاید کسی دن کالم لکھنے لگو۔ تمہیں بڑا فائدہ یہ ہے کہ پڑھا تم نے کچھ نہیں، اس لیے تم دوسروں کی نقل کی بجائے اپنے سادہ الفاظ میں لکھ لو گے۔''

مسعود احمد اچھا کالم نگار بن گیا اور کوئی دس سال پہلے، اس کی وفات تک اس کا کالم 'بھٹکتی آنکھ' نیشن میں چھپتا رہا۔

مولانا کو سنگاپور سے بہت پیار تھا، کیونکہ اس میں کھانے پینے کو بہت تھا۔ بالخصوص موخر الذکر اور انہیں عورتیں پسند تھیں، جو خوبصورت تھیں اور بہت تھیں۔ کلب تھے، رات کی پناہیں تھیں، سڑکیں چوڑی تھیں اور ساحلِ سمندر ننگے پاؤں کے لیے نرم، لیکن سنگاپور پھر

سنگاپور تھا، لاہور نہیں تھا، جس کی یاد مولانا کو بہت ستاتی تھی۔ وہ مسعود، جو ہر وقت ان کے ساتھ چمٹا رہتا تھا، سے کہتے:

''مولانا، سنگاپور کی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ اس کو اسی طرح سے اٹھا لو اور فرانس میں رکھ دو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اب لاہور کو لو۔۔۔ وہ ایک دن میں نہیں بن گیا، کسی کے بٹن دبانے سے۔ مولانا لاہور ایک طرزِ زندگی ہے۔ مولانا لاہور، لاہور ہے۔''

ایک دن پیغام ملا کہ 'ہماری گلی' والے احمد علی چین جاتے ہوئے، سنگاپور سے گزریں گے۔ مولانا اور ان کے پیچھے مسعود، دیر سے بندرگاہ پہنچے، جہاز کئی گھنٹے سے کنارے لگ چکا تھا۔

''آؤ، اسے ڈھونڈیں، میں اسے جانتا ہوں مجھے پتا ہے وہ کہاں ملے گا۔'' مولانا نے اعتماد سے کہا۔ انہوں نے ہر کلب، بار اور شب گاہ کو کھنگالا احمد علی کا کوئی نشان نہ ملا۔ آخر مولانا نے کہا۔

''وہ نہیں ملے گا۔ یہ چینیوں کا شہر ہے۔ اسے یہاں نہیں ڈھونڈ سکتے۔ اگر اسے سامنے سے دیکھو احمد علی ۶۰ فی صد چینی نظر آتا ہے۔ اس بات پر بھی غور کرو۔ ایک چینی، دوسرے چینی جیسا نظر آتا ہے، تو کیا امکان ہے ہم اسے ڈھونڈ ہی لیں۔''

مولانا ہر شام شہر پر حملہ آور ہوتے تھے۔ جانے سے پہلے کہتے:

''مولانا زندگی کو سامنے سے دیکھنا چاہیے، پیچھے سے دیکھنا چاہیے۔ شمال سے، جنوب سے، المختصر ہر جانب سے۔ مولانا آؤ اس شہر پر حملہ کر دیں۔''

اور وہ چل پڑتے۔

اس سے بھی خوبصورت کالم، ایک بہت خوبصورت اور طویل کالم، نور جہاں پر ہے، مگر کس کس کا ذکر کریں۔ کاش خالد حسن کو کوئی مترجم مل جائے جو اسی پائے کا ترجمہ کر سکے جیسا کہ خالد حسن نے اردو ادب کا انگریزی میں کیا ہے۔ کبھی تجربتاً منٹو کے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'

کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کریں۔ خالد حسن کے ترجمہ کو پڑھ کر کسی نے کہا تھا۔

"لگتا ہے یہ پہلے منٹو نے انگریزی میں لکھا ہے اور بعد میں کسی اور نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔"

نور جہاں پر کالم کا آخری پیرا

مادام نور جہاں، ایک عظیم عورت اور ایک عظیم آرٹسٹ تھی، اب تو خداؤں نے اسے، اس کی موسیقی کی طرح، اسے بھی لاثانی کر دیا ہے۔

جب پاکستان اور ہندوستان ایک ملک تھے تو وہ ہندوستان کی دھڑکن تھی۔

اس نے پاکستان آنا پسند کیا کیونکہ اس کا دل اس دھرتی میں تھا۔ وہ چھوٹا سا قصبہ، قصور جہاں وہ پیدا ہوئی، ہمیشہ اس کے دل کے قریب رہا اور لاہور وہ شہر تھا جس سے اسے محبت تھی، لیکن اس کی قسمت میں یہاں دفن ہونا نہیں تھا۔ کہتے ہیں، اس کی خواہش تھی کہ قصور میں دفن ہو، یہ بھی نہ ہوا۔ موت نے ملکۂ ترنم نور جہاں کا وقار اور بڑھا دیا۔ لاکھوں کروڑوں اس کا سوگ مناتے ہیں اور پیار سے یاد کرتے ہیں۔ اس پر واقعی رحمت تھی کیونکہ جس طرح لوگ اس سے لگاؤ محسوس کرتے ہیں۔ خدا یہ رتبہ صرف گنے چنے لوگوں کو دیتا ہے۔

'آواز دے کہاں ہے'

ایک کالم خالد حسن نے ہمارے پیارے امیر المومنین بننے کے خواہش مند میاں صاحب پر لکھا تھا، وہ تو مجھے اس وقت مل نہیں سکا لیکن اس کی آخری لائن مجھے اب تک یاد ہے

"بنیادی تعلیم کا کوئی نعم البدل نہیں"

"There is no substitiute for basic education"

اس کی شاندار اصطلاحات میں سے ایک CSP حضرات کے بارے میں ہے۔

Civil Serpants of Pakistan

پاکستان کے سِول عفریت

معاصرین کی آراء

آپ کی پسندیدہ شخصیت کے بارے میں دوسرے لوگ پسندیدگی کا اظہار کریں اور وہ ہوں بھی اصحاب رائے تو اچھا لگتا ہے۔

ع خوش تر آن باشد کہ سِرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بہت سے اچھے اچھے کالم نگاروں نے خالد حسن کے بارے میں کالم لکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ اقتباسات آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے حاضر ہیں۔

ڈاکٹر منظور اعجاز

درویش، جیہدا اہا سانکل جانداسی

خالد صاحب ٹر گئے، بہت کچھ دل دیاں دل وچ لَے کے۔۔۔ تے بہت ساریاں میرے دل وچ۔ ان کہیاں چھڈ کے۔ اونہاں نوں میرے نال دو الاہمے سن، اک تے ایہہ جو میں اونہاں نوں کدی فون نہیں کردا۔۔۔ دوجا میں انہاں دے سارے کالم نہیں پڑھدا۔ رب دا کرنا انج ہندا رہیا جو جدوں وی اونہاں نوں فون کروایا مشین جواب دیندی تے یاں اونہاں دی گھر والی۔ اوہ تے ۷۶ سال دی عمر وچ الھڑ ویرھکیاں وانگ سارا دن واشنگٹن DC گاہندے سن (اب میں کچھ عرض کروں گا کہ اس عمر میں اتنا فعال ہونے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کتنا مشکل کام ہے کہ خود اس عمر کے نزدیک ہوں۔ اس کیفیت کا ذکر آخر میں کروں گا Robert Frost کے حوالے سے)

(اس کے بعد صفحہ پر جگہ خالی چھوڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مقبول اختر اپنے خیالات کا اظہار نہ کر پائے۔ مصنّفہ)

الاہمے دی وچلی گل میں اوہناں نوں دس ہی نہیں سکدا۔ پر ہن اونہاں نال میرا

شاید کجھ چرنا کرانہیں ہونا، ایس لئی راز کھولن وچ شرم گھٹ آوے گی۔

میں اونہاں دا کالم کدی کدی ان گولا کر جاندا ساں، اصل وجہ ایہہ سی جو میں جدوں اونہاں دا کالم پڑھدا ساں تے اونہاں دی انگریزی زبان دی پکڑ، تے اوہدیاں لفظاں دیاں گجھیاں رمزاں، لکاں لپکاں دی کھیڈ نوں ویکھ کے کنب جاندا ساں۔

اویں ہی جویں، چھوٹے غلام علی خاں کہندے سن جو وڈے غلام علی دا گاناسن کے مینوں تاپ چڑھ جاندا سی۔۔۔

یا جیویں، فیض احمد فیضؔ نے اک انٹرویو وچ مینوں دسیا سی جو میں جد وارث شاہ تے بلھے شاہ نوں پڑھدا ساں تے مینوں یقین ہو جاندا سی میں اجیہا کدی نہیں لکھ سکدا اس لئی میں اردو تے محنت کرنی شروع کر دتی۔

خالد صاحب ایس اعتراف جرم نوں پڑھ کے اچی اچی ہس رہے ہوون گے کیوں جو اوہناں نوں ایس دا پہلاں ای پتا سی۔ خالد صاحب کول انگریزی دی پکڑ سی۔ اوہ اوہدیاں گجھیاں ماراں، اٹکھیلیاں تے رمزاں دے استاد سن۔[(Henry James) بہت بڑا ناول نگار ہے۔اس کا ایک کردار امریکہ سے پیسے کما کر انگلستان آ جاتا ہے اور ایک جاگیر خرید لیتا ہے۔وڈیروں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔اس کا بھتیجا امریکہ سے چھٹی پر آتا ہے اور پوچھتا ہے انکل اب تو انگریزوں کی زبان اچھی طرح سمجھ آتی ہو گی۔انکل نے جواب دیا۔

''یار جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ تو سمجھ میں آ جاتا ہے، جو کچھ وہ چھوڑ دیتے ہیں وہ سمجھ نہیں آتا۔'']

اوہ سدا بندے دے اندر، دھر اندر لکیاں جذبیاں سدھراں، خوفاں تے سُوداں دی کھیڈ کاری دے کھوجی سن۔

ایہوں کھوج اونہاں نوں نور جہاں کولوں سوال کروا دیندی سی۔۔۔

''بی بی، کنے کو عشق کیتے ہوون گے؟''

دنیا داری وچ انہاں بہت کھٹیا وٹیا نہیں۔۔۔

میرا خیال اے شکار دے کول جا کے اونہاں دا ہا سا نکل جاندا سی۔

(منو بھائی سے کسی نے سوال کیا کہ کام تو آپ کے دنیا داروں جیسے ہیں۔آپ پھر امیر کیوں نہیں ہوئے؟ منو بھائی نے اسے باز اور چیل کی کہانی سنائی۔کسی نے چیل سے کہا کہ تمہاری چونچ اور پر تو باز جیسے ہیں پھر تم مردار پر کیوں اکتفا کرتی ہو؟ اس نے جواب دیا۔

''جب شکار میری زد میں ہوتا ہے تو 'میرا ہاسہ نکل جاندا اے')

A progressive secular vision and acerbic wit, by Beena Sarwar.

Khalid Hassan never suffered fools...

An immensely humanlistic progressive, secular vision, a great love of literature, poetry, art, music a deep knowledge and understanding of history, principle stands and an acerbic sense of humour.

Naval Attack

جب بھارتی فلموں اور TV نے فراخ دلی سے خواتین کی ناف دکھانی شروع کی تو خالد حسن نے اسے Naval attack لکھا۔۔۔بحری حملہ۔۔۔Naval کا مطلب ناف ہے۔

مسعود منور۔۔۔خالد حسن لئی گلاب دا کفن

تہاڈے کوچ دا نگارا وجیا تے مینوں اک بہشتی بیلی، اختر حسین جعفری دی اک نکی جیہی کویتا یاد آئی۔

؎ تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں

تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے

یار خالد حسن

تُسیں اونہاں لوکاں وچوں نہیں جیہڑے قبرستان آباد کردے نیں۔ توں تے لوکاں دے دلاں وچ وسن والا بندہ ایں۔ میرے اتے تہاڈے پیار دا قرض وی ہے۔۔۔ میں تہانوں اک چٹھی لکھ کے رکھی ہوئی اے۔ اوہ کیہڑے پتے تے گھلاں۔

اکمل علیمی نے لکھا ہے:

اونہاں نے ۱۹ سال دی عمر وچ مرے کالج سیالکوٹ توں ایم۔ اے انگریزی کر لیا تے جدوں اسلامیہ کالج لاہور وچ انگریزی پڑھانی شروع کیتی تے اپنے کئی شاگرداں نوں عمر وچ اپنے آپ توں وڈا پایا۔ مگروں اوہ مرے کالج تے لارنس کالج گھوڑا گلی وچ وی انگریزی زبان تے ادب نال جڑے رہے۔ سن ۸۵ء وچ اوہ مقابلے دا امتحان پاس کر کے انکم ٹیکس افسر بن گئے۔ پر اونہاں موجب "نہ تے مینوں ایس کم توں کوئی سواد سی تے نہ پیسہ کٹھا کرن دا شوق سی۔ ایس لئی چھیتی ای میں نوکری چھڈ دتی۔"

حمید اختر کا کالم ہے: 'زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے'

۔۔۔موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ جانے کا فیصلہ کیا تو بیٹے سے ملنے کے علاوہ، جن لوگوں سے ملاقات کی خواہش دل میں تھی، ان میں خالد حسن بھی شامل تھا۔ افسوس کہ اب یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوگی۔

(پاکستان ٹائمز میں) آئی۔اے۔ رحمان، ایلس فیض صفدر میر یا میرے کمرے میں خالد حسن آجاتا تو پروگیسو پیپرز لمیٹڈ کا پورا دفتر قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ اس کی تحریر ہی شگفتہ نہیں ہوتی تھی بلکہ گفتگو میں مزاح اور طنز سے بھرپور ہوا کرتی تھی۔ انتہائی اچھی انگریزی لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب کا ذوق بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ زندگی بھر

وہ فیض صاحب کی شاعری کا مداح رہا۔

وہ برسوں سے امریکہ میں مقیم تھا، مگر لاہور کو کبھی نہیں بھولا۔ سال میں ایک دو دفعہ لاہور کا پھیرا ضرور لگاتا اور پھر پرانی محفلیں آباد کرنے اور یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کرتا۔

جب بھٹو صاحب نے پاکستان میں شراب اور جوئے پر پابندی عائد کرنے کا اعلان کیا تو کسی غیر ملکی نے خالد حسن سے سوال کیا کہ اس حکم کے اطلاق کے بعد پاکستان آئندہ کس شکل میں سامنے آئے گا تو خالد نے جواب دیا۔

"پاکستان اب بغیر تیل کے سعودی عرب کا نقشہ پیش کرے گا۔"

Khalid Hasan sets aside his pen.

Anwer Iqbal

بہت سے لوگ عادی ہو گئے تھے، خالد حسن کے مزاحیہ، گہرے اور ایماندارانہ کالم پڑھنے کے، جو لکھے گئے پہلے لاہور میں، پھر لندن، ویانا اور واشنگٹن میں۔ وہ اب اسے نہیں پڑھ سکیں گے۔ وہ شخص جو نصف صدی تک جہاں بھی ہوتا تھا، لکھتا رہا، اس نے اپنا قلم اٹھا کر رکھ دیا ہے۔

اردو کے دوسرے کالم نگار، زمین پر پاؤں رکھیں تو شاید انہیں خالد حسن نظر آجائے۔

اکمل علیمی۔۔۔ خالد حسن، کجھ گلاں، کجھ یاداں

اودھے وچ صحافت دے جراثیم، مڈھوں لاسی۔۔۔ (نور جہاں دے انٹرویو دے بعد کہیا) ملکہ ترنم دے بیان نوں انگریزی وچ کرنا بہت اوکھا ہے۔ میں پچھیا

"مثلاً"

تے اوہ بولیا:

"بی بی کہہ رہی سی، جدوں میں کسی سوہنے جوان نوں ویکھنی آں تے مینوں اوہ

چنگا لگدا اے تے میری ہڈیاں وچ اچھوائی ہوون لگدی اے۔"

خالد حسن نے ایس جملے نوں انج لکھیا:

"I have a funny feeling under my bones."

۔۔۔اوہ سیالکوٹ دے کرداراں نال بڑی لگن رکھدے سی تے کئی وار اوہناں دے بیان نقل کردے۔

پاکستان وچ، روایتی طور تے انگریزی دے صحافی مغرور رہے ہن پر میں خالد حسن نوں ہمیش بزرگ صحافیوں دا فین ہی ویکھیا تے انگریزی توں ودھ، صحافت بارے فکر مند رہے۔ ایہو کارن ہے تسی اوہناں دی website تے چراغ حسن حسرت دی اک گل دیکھدے آں جیہڑے وچ اوہ پڑھن والیاں نوں تاکید کردے ہن کہ

''صحافیاں دیاں گلاں تے بہتی توجہ ناں دیو کیوں جو سویرے جیہڑے کاغذ تے اوہ لکھدے نیں اوس وچ شامیں مچھی لپیٹ کے ویچی جاندی اے۔

ooo

بشکریہ 'وچار ڈاٹ کام'

ڈاکٹر مقبول اختر 'وچار ڈاٹ کام' پر باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ ان کے مضامین کو اکثر ہفتہ بھر کا بہترین مضمون قرار دیا جاتا اور ویب سائٹ والے اس کا سندھی ترجمہ بھی دکھاتے۔

ooo

پنڈ و پنڈ کچہری

ادھی صدی پاکستانیاں وڈیریاں دی خدمت کیتی اے۔ اوہناں دے سوجھوان تے وکیل ایس نوں اسلام دی خدمت اتے پاکستان دی خدمت دسدے رہے۔ لوکاں داکم ہے خدمت کرنا۔ وڈیریاں داکم ہے موجاں ماناں۔ اینہاں دیاں آونیاں جانیاں ویکھ کے اُلٹی آوندی ہے۔ کروڑ رپے دی تاں گڈی لوڑی دی اے۔ چار چار گڈیاں وچ چار چار راکھے۔ آٹومیٹک اسلحے۔ موٹیاں کھلاں بچاون لئی موٹے پربندھ۔

جماناں دے پروہنے آون تے کمیاں دیاں لتاں ٹٹ جاندیاں خدمتاں کرکر کے۔ ہن وڈیریاں دی گُڑ مائی ہوگئی ہے نویں رجیاں نال جیہڑے ہن تے گماشتے پراکھواندے ہین سرمائے دار۔ گماشتے ملٹی نیشنل دے۔ کامیاں دیاں پھٹیکاں ودھ گئیاں ہین۔ ملٹی نیشنل ہوگئیاں ہین۔ ہُن خدمت کرو ساری اُمہ دی سارے عربی شہزادیاں دی خدمت کرو۔ عربی گھوڑیاں ہار کھرکھرا کرو، مُٹھی چاپی کرو، سگوں ڈومو، بیروت وچ تاں حالات اجیہے ای ہین۔ تمبواں وچ ائر کنڈیشنر لوا کے خدمت گار نال پیش کرو۔ عربیاں دی خدمت کرنا ثواب داکم ہے۔ کار ثواب ہے۔

پر ہُن اک نویں انھیری جُھلی ہے۔ ایہہ جھین۔۔۔ نواں زمانہ، لوکیں کہندے ہین پاکستان دی خدمت سرپر۔ پاکستانیاں لئی وی کجھ ہوجاوے تے کیہ ہرج اے۔ عام پاکستانی دی دکھاں دی ماری جندڑی علیل اے۔

جثا پیلا کر چھڈیا اے
دُکھ دیاں ظالم دھپاں نے
مینوں چھاں ناں دتی سجنو
ہتھیں لائے رُکھاں نے (ممتاز کنول)

اک اتوں اسمان توں اگ ورھدی پئی ہے۔ چالی توں پنتالی پنجاہ درجے دی گرمی، پکھا چلے ناں، راتیں بتی ناں بلے۔ نھیرا اے تے انھیر اے۔ اندھیر نگری تے چوپٹ راجہ۔ کسے آکھیا اشرف راجہ۔ ایہہ راجہ اشرف لارے لپے دا تے بجلی دا وزیر ہے۔ فارسی وچ آہندے ہن، تنگ آمد، بجنگ آمد۔ ہر بندہ تنگ ہے کیونجو اوس دا بالی بچوا تنگ۔ جنگ ناں کرے تاں کیہ کرے۔

میں اج کھارے چڑھ کھلوتاں۔۔۔
آپے سہرے گانے بنھساں
سینہ کڈھ ہلدی دے بُٹھے
میں مُڑ کلا ای وہساں
مُڑ چکاں چوں، مُڑ شہراں چوں
مُڑ جھوکاں چوں
جچ تے جچ چڑھیسی۔۔۔
ہن پنڈ و پنڈی لاوساں اساں آپ کچہری (شارب انصاری)

اک ٹریا، بیہیا ٹریا۔ روس وکھالے بن گئے۔ شہراں وچ، قصبیاں وچ۔ اپنے اج دے دُکھ پٹن لئی، کسے دوجے ملک دے، کسے دوجی صدی دے دکھ نہیں، کسے ماڑے دے

خلاف نہیں، علم، عقل تے عورتاں دے خلاف نہیں۔ اپنی جان دے دکھ، سب دی جان دے دکھ۔

اپنے بچیاں دے آرام لئی
انھے واہ وودھائے بجلی دے بلاں دے خلاف
لوڈشیڈنگ دے خلاف
پٹرول راہیں لُٹ مار دے خلاف
اپنے بچیاں دیاں زندگیاں بچاون لئی
اپنیاں دھیاں بھیناں دی عزت لئی
عورت ذات نوں ذلیل کرن والے وحشی طالبان دے خلاف

گل کجھ پاکستانیاں اپنے گھر ول ویکھنا شروع کردا ہے۔ پاکستان پاکستانیاں لئی۔ پاکستان دیاں دولتاں تے خزانے وی پاکستانیاں لئی۔ جداوہ دیہاڑ آسی۔ کڈا سوہنا ہوسی اوہ پاکستان۔ جھوکاں تھیسن آبادول۔ آ ورل گاویے سوہلے اوس پاکستان دے۔

Sing about the hidden country
fresh and full of quiet green
sailing over seas uncharted
to a port that none has seen

پہلی ڈبچی:

اک ہندستانی فلمی گانا ہے۔ دنیا میں سب چور چور، کوئی چھوٹا چور، کوئی بڑا چور۔ پاکستان وچ وی ہر نمبر تے ہر سائز دے چور ہین۔ بنے ہنے صوبائی اسمبلی دی ایک ممبر پھڑی گئی ہے۔ کریڈٹ کارڈ چرا کے اوہدے نال گہنے خریددی۔ چوری دے گہنے پا کے خورے اوہ کڈی سوہنی لگنی سی۔ نال ای اک نواں قانون آگیا ہے۔ وڈے چورنوں، چوراں دے چورنوں چور کہن دی سزا چوداں سال قید تے پھانسی برابر متھیاں جاندیاں ہن۔ میں تاں

پہلاں ای آکھیا سی، ناں چھیڑتا ئے نُوں۔۔۔
دوجی ڈبچی (ٹیل پیس)

کل میاں چنوں دے اک پنڈ وچ ات وادیاں نے ادھے پنڈ نوں تھیہہ کر چھڈیا ہے۔ مچا اوہناں دا اک گھر سی جتھے اسلام دیاں جڑھاں پٹیاں جارہیاں سن۔ اک بالڑی پنج تے دس سال دی کچی عمر دے بچیاں اتے بالڑیاں نوں پڑھا رہی سی۔ ہے ناں نھیر۔ ایسے ات وادی پروگرام دا دوجا حصہ سی اوسے تاریخ وچ جماعت اسلامی دے رُج مین ئیاں امیر دا ایہہ بیان جو پنجاب وچ ات وادیاں دے خلاف اپریشن نہیں ہونا چاہیدا۔ ناں کاہنوں۔۔۔

پچھوں خبر آئی ہے، ایہہ ات وادیاں دی گھرو کی لڑائی سی، دوجے لوکیں تاں دھگا نے مر گئے۔

ooo

چوراں دی ماں

پنجابی دا اک سیکڑے ورھیاں پرانا اکھان ہے، چوراں نوں ناں مارو، چوراں دی ماں نوں مارو۔ اک اکھیائی ایہدے وچ ایہہ ہے جو ایناں تاں پتہ ہووے چوراں دی ماں ہے کون۔

کل کجھ اتا پتا لگا ہے۔ جرنیل حمید گل مچھاں تے ہتھ پھیر کے آکھیا ہے، ایہہ یاراں دا کم اے۔ طالبان ہمارے بچے ہیں۔ کل نوں جد پاکستانی قوم طالبان دے جرماں دی ایف آئی آر لکھاوے گی تے اوہدے وچ اک جرنیل داناں وی ہوسی۔ پلسیاں دی زبان وچ بڑی بھاری رپٹ ہوسی۔۔۔

وچار وچ ای اک سجن نے چوراں دی نانی دی وی دس پائی ہے۔ جماعت اسلامی کیس اگانہہ ودھ رہیا ہے۔ ہن چھڑا ماں دا پتہ کرنا ہے۔ شنید ہے اوہدا ناں ہے بھلا جیہا، جنسی جنیسی کہندے نیں۔ بڑی میل ملاپ والی اے۔ سنیا اے فوج دے وڈے کمانڈراں تائیں تعلقات ہن اس دے۔

ooo

تن پھپھے کٹنیاں

اج توں کوئی ۴۰۵ ورھے پہلوں شیکسپیئر دا ڈرامہ میکبتھ لکھیا گیا۔ شیکسپیئر بہت وڈا ڈرامہ نگار ہا۔ تے ایہہ اوسدا بہت مشہور ڈرامہ ہے۔

پہلا سین اک ویران جگہ تے ہے۔ بدل گج رہیا ہے بجلی لشکدی پئی ہے۔

(تن پھپھے کٹنیاں) جادوگرنیاں آکھ لو یا چڑیلاں یا بدروحاں (آپو وچی بھیناں نیں، داخل ہوندیاں نیں)

پہلی: مڑ کدوں ملساں اساں

کڑ کدے بدل یا لشکدی بجلی یا ورھدے مینہ وچ،

دوجی: جدوں سارا رولا مک جاسی

جدوں جنگاں ہاریاں جتیاں ویسن

تریجی: دینہہ ڈبن توں پہلوں

پہلی: کتھائیں

دوجی: بیلے وچ

تھوڑی ہور گل بات توں بعد رل گاوندیاں نے
بچ کوڑاے تے کوڑ بچ
چل گندی واء تے دھند وچ اڈیے

میں پچھلی راتیں دیر تک نیٹ تے بیٹھا رہیا، کجھ جھٹ اوس سیانے بندے شیکسپیئر نال لنگھایا۔ آہندااے۔

''جے کرتوں ویلے دے بی ویکھ کے دس دیویں، ایہہ اگسی تے ایہہ ناں اگسی، مڑ میرے نال گل کریں'' سرف کردا کردا نظریے تے اپڑ گیا۔ نظریہ چین، نظریہ جاپان، نظریہ روس، نظریہ امریکہ خورے کتھے کتھے خوار ہوندا رہیا۔ اک تھک کے اردو اخبار چالئی۔ چیئر مین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل طارق مجید دا بیان پڑھیا۔ ساڈیاں ہتھیار بند فوجاں ہن ملک دی نظریاتی حداں دی راکھی کرسن۔ دل گارڈن گارڈن ہوگیا، اخبار پرانہہ سُٹی، خوشی نال نچن لگ پیا۔ سارا رولا ای نظریاتی سرحداں دا ہے۔ جغرافیائی سرحداں دی حفاظت جبراں کیتی نیں اوہ تے تواریخ دا حصہ ہے سوات، بونیر تے شانگلہ اوس دیاں تازہ مثالاں نیں، نچدا نچدا میں تھک پیا، میں سوں گیا۔

رات دے پچھلے پہر اکھ کھل گئی۔ کمرہ نور نال بھریا ہویا سی۔ اسماناں توں مقدس روحاں اُتر رہیاں سن۔ ہولی ہولی، ہجے ہجے، کجھ پچھاتیاں پچھاتیاں لگدیاں سن، شکلاں سہی نہیں ہو رہیاں سن کیونجو اوہ زورزور نال نچ رہیاں سن، زور زور نال نعرے لا رہیاں سن، اپنی نظر تے زور دتا، اوئے ایہہ تے جنرل شیر علی اے، ہتھ وچ لیپ ٹاپ سی، google.com تے ملکاں دا نظریہ لبھ رہیا سی، دوجی روح چھیتی پچھاتی گئی، ایہہ صورتاں کتھے لکیاں رہندیاں نیں۔ اوہیو اپنے جنرل ضیاالحق سن، اپنی ڈنگی مسکان نال، تے تیجی ہستی سی جنرل حمید گل۔ ایہہ جیوندی روح تک کے آپاں تے بے ہوش ہوگئے، تہاڈی ہوش قائم ہووے تے تسیں سناؤ، ہور سناؤ۔۔۔

نونہاں دنداں والے

انسانی وسیب تے رہتل وچ تہذیب دا چلن اودوں ہویا جدوں عورتاں نے بچے تے اجڑ پالدیاں بیں توں بوٹے بندے ویکھے تے کھیتی باڑی دا مڈھ بجھا۔ فیر عورت دوالے گھر تے بعد وچ خاندان بنیا۔ ایس سارے پسارے وچ عورت نینہہ دا پتھر ہائی۔ اوہیو گھر نوں پالدی تے سمبھالدی ہائی۔ اوسے نوں سارے فکر سن تے اوسے دی حاکمی ہائی۔

فیر زمانے دی ادلا بدلی نال تے زراعت دی پیداوار دی وجھوں ہل دا ویہار آیا۔ میر تیر شروع ہوئی۔ عورتاں تاں ماواں ٹھنڈیاں چھاواں ہوون کارن کم کاج وچ رُجھیاں رہیاں بندے ہل مارن وچ جُٹ گئے۔ کھوہ کھنج ہوئی، جائیداد دا ویہار چالو ہویا۔ ڈنڈاں پٹاں والے ویہلواں زمیناں تے قبضہ کرلیا، پائیاں تے، جنگلاں تے۔ فیر اپنی حاکمی جگاون دا فکر ہویا۔ عورت تے قبضہ کرلیا۔ ماڑے کول اک ادھی، زوراوراں کول سینکڑے۔ عورت تے اپنی حاکمی جگاون دی کوشش شروع کردتی۔

پر اوس وی اپنی خودمختاری ناں چھڈی۔ ڈنڈ پٹ، ڈانگ سوٹا، گالھ مندا سبھے کجھ ورتیو نے۔ جتھے بنا کے جانوراں طرحاں عورت دا شکار کھیڈیا۔ اوس نوں ڈرایا، دھمکایا۔ جبر

کیتو نے۔ اکھاں وکھایاں، مچھاں وکھایاں، داڑھی دے واسطے دتے۔ جد اوہ ناں منی تے رب بنا کے وچ پالیے۔ ایہو کجھ کردیاں ہزاراں سال لنگھ گئے، عورت نے نہیں منناسی ناں منی۔ کجھ بندیاں عقل کیتی کجھ زمانہ اگے ودھیا۔ آدمی انسان بن گیا۔ ماواں دے جمیاں نے ماواں دی تے ماواں دی جنس دی عزت شروع کر دتی۔ وسیب مہذب ہوندے گئے۔ پر کجھ ایسے وی سن جیہڑے پنجابی اکھان موجب ماواں نہیں سن جے بوٹیاں تے لگے سن۔ کجھ تے اُکا تھوردے بوٹے تے۔ چھتر تھور جیہیاں شکلاں، تھوراں بھرے ویرانے جیہیاں عقلاں اتے پتھر دل۔

ایہہ اپنے کرودھ وچ بھسے لوکی عورتاں نوں فتح کرن لئی جٹے رہے۔ ہڈوں ایہہ عورتاں توں ڈردے ہن۔ اک وڈی ساںگوانا لسٹ کرن ہار نے کہندی ہے جو ایہہ عورت دے ساہمنے آون توں ڈردے ہن تے اک دوجے دے پچھے وڑدے ہن۔ ایہو ایہناں دی نفسیاتی بیماری دی جڑھ بنیاد ہے۔

اج ساڈی پھلاں بھری سوہنی وادی سوات وچ اُجاڑ پئی ہے۔ سوسوکوہ تائیں اُجاڑ منگن والے اُلو بولدے پئے ہن۔ جالب دے کہن موجب۔۔۔

پل پل خوف کے گہرے سائے، جیون موت سمان

گلیاں سن مسان ہن پر مرزا یار نہیں۔ سنجیاں گلیاں وچ کتے بھونکدے ہن۔ لوکیں گھر بار چھڈ کے، جاناں بچاون لئی بھج رہے ہن۔ باقی رہ گئے کتے۔

ان کے حق میں اب دعا بھی، بددعا بھی چھوڑ دو۔

فروغ فرخ زاد آکھیا ہا۔۔۔ جیون اک لمی گلی ہے جیس وچ اک عورت ٹوکری چک کے روز لنگھدی ہے۔ ایہہ سوات میرے دی سوہنی وادی کیہو جیہی گلی ہے جتھے عورتاں دا داخلہ منع ہے۔ جیس بندے دے پُتر نے سوات دے اجڑیاں لوکاں دی تصویر اخبار وچ یاں نیٹ تے یاں ٹی وی تے تکی ہے تے اوہ رُنا نہیں، اوہ بندہ نہیں، اوہ طالبان ہے۔

چھوٹے چھوٹے بال نویں کپڑے پا کے کھڑے نے، نہیں پتہ کتھے جا رہے ہن، مڑ ایس دھرتی ماں نوں ویکھسن یا ناں، دہشت ناں رو وی نہیں رہے۔ بندے خالی اکھاں ناں خلا وچ تکدے، گواچے گواچے، اک تمبو برقعے وچ لکی عورت دوالے کھڑے ہن لدے دی اُڈیک وچ، عورت او ہیو مینہہ دا پتھر، جیہڑی اپنے ٹبر نوں بچاون لئی سفر کر رہی ہے، حج دا سفر نہیں جیس اک سفر دی اجازت صوفی دے اسلام وچ ہے، فتوے پرانہہ سٹ کے، پرواہ نہیں ٹنڈے لاٹ دی، پرواہ نہیں صوفی صافی دی۔ جی انسان دی بچی!

اوہ اک ماں ہے، اوس اپنا بالی بچڑا بچاونا ہے اوہناں شیر دیاں پتراں توں جیہڑے دھنیاں پیاز لین آیاں ماںواں نوں سوٹیاں ماردے ہن، جیہڑے دھیاں بھیناں نوں سڑکاں تے لمیاں پا کے کوڑے مارن دا تماشہ وکھاندے ہن۔ ایہہ اوہ ماواں ہن جیہناں دے ہوٹھاں تے لوریاں سوں گئیاں ہن پر جیہناں نوں اپنا عورت پن نہیں بھلا۔ اوہناں نوں ماں دی ممتا یاد ہے۔ کوئی رواج، کوئی فتوا، کوئی پشتون ولی یاد نہیں۔ اوہناں ہزاراں سالاں توں انجے ہنڈھائی ہے اپنی زندگی۔

سیونی اسیں ذات دیاں پھوکیاں
لیبے لگیاں جد وکنیاں جمیاں
پولے پیریں
دھرت سمندر گاہندیاں
نونہاں دنداں والیاں کولوں ڈھڈ لکاؤندیاں
سانوں ورھے ہزاراں ہو گئے

(نجم حسین سیّد)

ooo

انھّی دے۔۔۔

گجھ شیواں تے پیدائشی انھیاں نوں وی لبھدیاں ہین۔ ساڈیاں ویریاں دشمناں نوں کیوں ساڈی 'تاریخی عظمت، ثقافتی رفعت اور تمدنی برتری' نظر نہیں آوندی۔ (ہور اردو بولاں؟) فیر اوہ جیہڑے ساڈے موڈھیاں تے، سگوں تالوتے چڑھے ہوئے ہن اوہ کتنے وڈے ہوسن۔ اللہ اللہ!

اک ہے دنیا داسب توں امیر صدر، عزتاں والا۔ گل عزتاں دی وی سن لو۔ لہور وچ بھنڈاں دا اک جُٹ ہنداسی۔ بڑا مشہور ہویا۔ پڑوچ وڑدیاں ای رجز پڑھدے سن۔۔۔ بھانڈا اے پررررر پرررر۔۔۔ اوہ ہولی ہولی سیاسی جگتاں دے سپیشلسٹ ہو گئے سن۔ ضیاالحق وی رگڑیا گیا۔ پھڑ سدائے۔ اوئے ہیما مالنی دیاں اکھاں والا تسیں سنایاسی، اوہ تے سرجی اساں ہیما نوں بھنڈیا سی۔ اوئے اوہ پنج ڈالراں والی زنانی دی گل۔ نہیں سرجی، کسے دشمن اساڈے تے تہمت لائی ہے۔ اللہ معافی، اوئے حرامیوں، میں ڈیڑھ سو کروڑ مسلماناں دا لیڈر رہاں، میں۔۔۔ ہتھ جوڑے، پیریں پے گئے۔ ساڈی کھل لھوا دو، پھاہے لادو، ایہہ لطیفہ اساں نہیں بنایا۔۔۔

گل ہورئی سی عزتاں والے صدر دی۔ اک چھوٹے ملک، چین توں چھوٹے ملک، دے وڈے وزیر نے منہ تے بے عزتی خراب کر دتی۔ ربا، ایہہ دھرتی پاٹ کیوں ناں گئی۔ ہوندا کدھرے ساڈا شہری، دس دیندے کیویں لوکاں دیاں بیزتیاں کری دیاں، آہو۔ چوداں سال تے کدھرے نہیں سی گئے۔

اک ہور عظیم صدر، کیونجو اوہ وی اوس عظیم قوم دا فرد ہے جیس دی تاریخی عظمت۔۔۔ آذربائیجان نے کجھ منڈے پڑھن لئی مغربی ملکاں وچ بھیج چھڈے۔ حالاں لوڑ نہیں سی، اساں تے آپوں ساری دنیا نوں سبق پڑھاونا ہے، جہالت دا۔۔۔ اوہناں خورے کیہ پڑھایا، آوندیاں سار اک وڈیو بنا چھڈی اک منڈے نے، اوہدا بھلا جیہا ناں اے، عمران حاجی زادہ۔ بہت حاجی اے۔ اوس وڈیو وچ اک کھوتا پریس کانفرنس کر رہیا ہے۔ آذربائیجانی بڑے سیانے لوک ہن، فٹ کھوتے دی کھل وچ اپنے صدر نوں پچھان لیا۔ منڈے نوں جیل وچ پادتا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

دنیا داسب نالوں سینئر صدر، مصر دا حسنی مبارک۔ انی سو اکاسی وچ آیا سی، حالے وی قائم دائم اے۔ صدر دا صدر اے۔ کیہ لوڑ اے امیر المومنین بنن دی۔ اوس دی رعایا وچوں کسے نے، کدھرے اک کوتا لکھ ماری، اوس کیہ لکھیا ایس دی تے سانوں کوئی سار نہیں، بندہ تن سالاں لئی اندر اے، ہور لکھو، ہن دنیا رولا پاوندا۔ ساڈے خلاف جو ہوئے، حالاں ایس کسے دے خلاف نہیں سوائے ہندواں دے، سکھاں دے، عیسائیاں دے، یہودیاں دے، بدھ مت والیاں دے، کمیونسٹاں دے، دہریاں دے، ناستکاں دے۔ کجھ ہور۔۔۔

بڑا عجیب زمانہ آ گیا اے، جہدی پیڑھی تھلے اگ لاؤ اوہو ای بھڑکدا اے۔

ڈبچی:

مینوں اک ایس ایم ایس ملیا اے، تسیں وی ڈردے ڈردے پڑھ لو۔

Zardari is honest

I Love Zardari

OOO

پنج جولائی

امریکہ وچ جدچار جولائی ہوندااے، آزادی دیہاڑ۔ اوہیو دیہاڑ پاکستان دا یوم غلامی ہونداہے۔ پنج جولائی۔ سچ آکھیا ہے سیانیاں آزادی دا مل ہے ہر ویلے راکھی۔ اساں راکھی ناں کیتی۔ تت کیہہ؟ تریہہ سال پہلوں اُنی سو سنتالی وچ پاکستان آزاد ہویا۔ تریہہ سال پچھوں اُنی سو ستتر وچ پاکستان انگریز دی تھاں پولیٹیکل اسلام دا غلام ہوگیا۔ اُڈ پڈ گھیاں ذاتی آزادیاں، اُڈ پڈ گئے مُڈھلے انسانی حق۔ بولن دا حق، ٹرن پھرن دا حق، اکٹھے ہوون دا حق۔ پاکستان دیاں زنانیاں تے اقلیتاں وی کہندیاں ہونیاں ہن، 'اسیں آزاد آں'۔ بی بی ہولی بولو کدھرے طالبان ناں سن لین۔ امریکہ وچ تاں پرسوٹ آف ہیپی نس، خوشی دی تلاش نوں وی مڈھلا حق مندے ہین۔ ایتھے ایجہاں ستھاں وی ہن جیہڑیاں سرکار دی چھتر چھاں تھلے ایہہ گل پک کردیاں رہندیاں ہن جو کوئی، کدھرے خوش تاں نہیں۔

ایس واری پنج جولائی نوں میں ربوں اسلام آباد وچ سی۔ تھاں تھاں تے پیپلز پارٹی دے جھنڈے۔ میرا گیاراں سالاں دا دوہترا میرے نال سی۔ پُچھن لگا ایہہ کیس خوشی وچ؟ اہنوں دسیا اج توں بتی روہے پہلوں اک فوجی نے امریکہ نال رلتی ہو کے پاکستان نوں

ملانیاں ہتھ ویچ دتا سی۔ ویلے دی چنی ہوئی پیپلز پارٹی دی حکومت توڑ کے بل مارلئی سی۔ پی پی پی اج روس وکھالے لئی یومِ سیاہ منارہی ہے۔ پچھیا سیاہ، کالے نوں نہیں کہندے۔ اوہ ویکھ پتر وچوں کالا اے۔ پر اوہ رتا تے ساوا، اوس مڑ پچھیا۔

تھوڑی ڈاکٹری ماری، اوہنوں دسیا کجھ لوکاں نوں رنگ نہیں دسدے۔ کجھ سیاست تے استادی ماری، اوہنوں دسیا، رتا رنگ ہے سوشلزم دا جیس داناں لیندیاں ہن پی پی سنگدی اے۔ ساوا رنگ ہے پاکستان دا۔ پاکستان تاں پاکستان ہے، اصل شے ہے حکومت۔ حکومت چلاون لئی کئی چلتر کرنے پیندے ہن۔ فضل الرحمٰن ورگے مولبیاں نال رلنا پیندا، صوبے تروڑن والے، جگا ٹیکس وصولن والے وی یار بناونے پیندے ہین۔ کنجری بنیاں میری عزت ناں گھٹدی۔۔۔ جیوندیاں زنانیاں نوں دبن والیاں دے سر تے ہتھ رکھنا پوندا ہے۔ پنجاب نوں تروڑن بھنن لئی کوئی چارہ کرنا پوندا ہے۔ جناں نوں ڈبی وچ پونا پیندا ہے، متاں اپنے آپ نوں حاکم میل توں وی وڈا سمجھن لگن۔

موٹروے راہیں مڑدیاں، کلر کہار دو ٹرک الٹے ہوئے تکے۔ روز دا کم اے۔ اترائی بہت اے۔ رفتار دی حد پنجاہ کلو میٹر لکھی ہے۔ کیہڑا منے۔ اک تاں جو سرکار کہندی ہے کوڑا ای ہوونا اے۔ دوجی پٹرول اُتے ڈیزل دی مہنگیائی۔ انجن بند کر کے راساں رب تے چھڈ دتیاں۔ اگے آئے، کھبے پاسیوں اک سوزوکی شوں کر کے لنگھ گئی۔ اگانہہ آ کے نواں رنگ تکیا۔ تناں لیناں وچ ٹرک، رب رب کر کے ٹردے گئے۔ اک ویگن جیہڑی قانون دے حساب صرف کھبی لین وچ ای چل سکدی ہے، ساڈے سجے پاسے توں اوورٹیک کر کے اوہ گئی۔ جھٹ ٹھہر کے دو کاراں وچ لگی ریس نوں تکیا، اپنی بلد موترنی چال وچ مقابلہ ہو رہیا سی اوس اک سڑک تے جتھے لوکیں عام طور تے قانون مطابق ای چلدے ہن۔ پلس کدھرے نظر نہیں آرہی سی۔

ایس واری میری حیرانی احمد نے دور کیتی۔ اج پنج جولائی ہے۔ جیس دیہاڑے ہر قسم دے قاعدے قانون تروڑدے گئے، اوتھے ٹریفک دے قانون کیس گنتی وچ۔

بے بے، بے بے۔۔۔

بے بے دا ٹوہر جھلیا نہیں سی جاندا۔ جیس ماں دا اک پتر بدمعاش ہووے اوہدا ٹہکا ای نہیں جھلیا جاندا۔ جیہدے خیر نال دس ہوون اوہ تاں بلے بلے۔ وارو واری جوان ہو رہے سن۔ جوانی توں سال پہلاں ای بدمعاشی چ پیر پا دیندے سن۔ اُتلا اک پوڑی ہور چڑھ جاندا۔ چیئرمین بن جاندا، چیئرمین توں ایم پی اے، ایم پی اے توں ایم این اے۔ ابا اوہناں دا ٹر گیا سی۔

دس پتراں نوں پالدے پالدے
بڈھا گیا سی ہو
دس پتر پر رل مل کے اک
پال سکے ناں پیو

پیو دے جان نال بے بے، بے بے ہو گئی۔ منڈے انگوٹھا چنگھدے ای جوان ہو گئے۔ اَنج وی کہندے نیں یہودی تے مسلمان اودوں تیکر جوان نہیں ہوندا جد تائیں اوہدا پیو ناں مرے آپ بھانویں پچاہ سالاں دا ہو جائے۔

بے بے دا وجھکرا تاں بندے دے ہوندیاں وی بتھیرا سی، ہن دون سوایا ہو گیا۔ اللہ بھے تے بالاں دے چھوٹیاں ہوندیاں توں آؤن لگ پئے سن۔ بے بے، چھیدے نے وٹا مار کے ساڈی ککڑی دی لت توڑ دتی۔ بے بے، چھیدے نے ساڈی کڑی دا گھڑا بھن دتا۔ بے بے، چھیدے نے اپنے بیلی نال لے کے ساڈا کماد برباد کر دتا۔ بہتی واری تے بے بے گل ٹال جاندی۔ کدی کدائیں اپنی اولاد تے ناراض ہوندی، وے ناں کریا کر وانج دے کم۔ کمینے لوک تے اِک گنے دا وی میہنا دین آ جاندے آ۔ کماد والا دھون نیویں پا کے ٹر جاندا۔ کدی بہتا ناراض ہوندی تے چھیدے دے منہ تے پیار نال چپیڑ مار دی، انج لگدا اوہدیاں گلھاں تے پیار نال انگلاں پھیر رہی اے۔ ماں جو سی، اک آئیڈیل ماں۔ اوہ اوہدے پنڈ دے سارے منڈیاں دی آئیڈیل سی۔ اوہ منڈے جدوں رزق دی تلاش وچ شہر آئے تے ساریاں اپنے رکشیاں، بساں تے ٹرکاں دے پچھے لکھایا ہو سی۔۔۔ ماں کی دعا۔۔۔ نی اوہ چھیدا فیر آ گیا۔

گل کیہ، ماں دی دعا نال ایس گھر نوں بہت بھاگ لگے۔ رب ایہو جیہے گھراں وچ بہت برکت پاؤندا اے۔ جیہڑے ممبر بن گئے سی اوہ وزیر ہو گئے۔

اک نوں دوجیاں دی ویکھو ویکھی تعلیم دا شوق چڑھیا۔ کیوں ناں میں وی بی اے پاس کر لاں، لوکی کہن گے گریجوایٹ ہو گیا اے۔ اک بھتیجے دی ڈیوٹی لائی، کاکا امتحان شمتحان دے دئیں۔ لوکی بھیڑے تے اویں گلاں کر دے نیں۔ سونہہ رب دی سکا بھتیجا سی!

دوجے کول اک زنانی کم کراؤن آ گئی۔ واہوا مونہہ متھے لگدی سی۔ ذرا اپنے سر تے ہتھ رکھ کے دسو، ممبری اینویں لبھ جاندی اے۔ اوہدے کولوں خرچا تاں لینا سی۔ اوہ نری پڑھی لکھی سی، پیسا پلے نہیں سی۔ اسیں حاکم لوک، سانوں وصولی دے ہور ڈھنگ وی آؤندے نیں۔ اخباراں، ٹیلیوژن والے تے ہین ای وہیلے، بدمعاش۔

چھیدا دیسی پی پی کے اکیا تھکیا سی، بندہ اچیچا گھلیا بنکاک، کوئی میرے لائق دی لبھ

کے لیا وے۔ اگل واہنڈی ائرپورٹ تے لین گیا۔ اگوں افسر اجکل دے، کمیاں دے پتر۔ قانون پڑھاون لگ پیا چھیدے نوں۔ چھیدا تے آپ بناوے قانون۔ تھوڑا قانون اودس افسر نوں پڑھانا پیا۔ فیر رولا۔ ایہہ ماں۔۔۔ میڈیا۔

بے بے غصے نال چھیدے دیاں گھاں تے انگلاں پھیریاں۔ 'میرا سوہنا پتر! ایہہ جیہڑے قانون لوکاں لئی بناؤندے او، بیٹا جی، اوہناں تے کدی آپ وی نظر مار لیا کرو۔'

پیار بھریاں اکھاں نال اپنے جگر تے ٹوٹے ول تکیا 'شرارتی ناں ہووے تے۔'

ooo

چیلنج دادائرہ

مفتی نعیمی نوں مار کے طالبان نے چیلنج دادائرہ کوئی بہتا ای وڈا کر لیا ہے۔

ایہہ دائرے دی گل اَج ہے۔ اک منڈا، جوان، تگڑا، نویں نویں باکسنگ سکھی سی۔ جوانی ٹھلی نہیں سی جاندی۔ اک ہوٹل وچ بیٹھا یار دوستاں نال مستی کر رہیا سی۔ شراب دے دوگھٹ ودھ پیتے گئے سی۔ اچی اچی بول رہیا سی۔

اوئے کوئی ہے تہاڈے چوں میرے تُل دا۔ یار بیلی سن، ہس کے ٹال دتا۔ اوئے کوئی ہے ایس کمرے وچ میرے مقابلے دا۔ نال دی میز توں اک بندے مڑ کے ویکھیا، ہس کے اپنے نال دیاں نال گلاں کردا رہیا۔

اوئے کوئی ہے پورے شہر وچ جہڑا میرے نال مقابلہ کرے۔ نال دی میز والے نے اوازار ہو کے اک بھوں چک کے اوہدے ول تکیا۔ تدنوں منڈے نے ہور گلاسی اندر سٹ لئی۔

اوئے کوئی پورے ملک وچ ہے، یاں سارے زنانے ای او۔ نال دی میز والے نے، جو پوری دنیا دا باکسنگ دا چمپئین سی، گھوری وٹی پر چوہا تاں شرابی ہو گیا سی۔

بے بے، بے بے۔۔۔

بے بے دا تو ہر جھلیا نہیں سی جاندا۔ جیس ماں دا اک پتر بدمعاش ہووے اوہدا ٹھکا ای نہیں جھلیا جاندا۔ جیہدے خیر نال دس ہوون اوہ تاں بلے بلے۔ وارو واری جوان ہو رہے سن۔ جوانی توں سال پہلاں ای بدمعاشی چ پیر پا دیندے سن۔ اُتلا اک پوڑی ہور چڑھ جاندا۔ چیئر مین بن جاندا، چیئر مین توں ایم پی اے، ایم پی اے توں ایم این اے۔ ابا اوہناں دا ٹر گیا سی۔

دس پتراں نوں پالدے پالدے
بڈھا گیا سی ہو
دس پتر پر رل مل کے اک
پال سکے ناں پیو

پیو دے جان نال بے بے، بے بے ہوگئی۔ منڈے انگوٹھا چنگھدے ای جوان ہو گئے۔ انج وی کہندے نیں یہودی تے مسلمان اودوں تیکر جوان نہیں ہوندا جد تائیں اوہدا پیو ناں مرے آپ بھانویں پنجاہ سالاں دا ہو جائے۔

بے بے دا وجھگڑا تاں بندے دے ہوندیاں وی جھیڑا سی، ہن دوُن سوایا ہو گیا۔ الاہمے تے بالاں دے چھوٹیاں ہوندیاں توں آون لگ پئے سن۔ بے بے، چھیدے نے وٹا مار کے ساڈی ککڑی دی لت توڑ دتی۔ بے بے، چھیدے نے ساڈی کڑی دا گھڑا بھن دتا۔ بے بے، چھیدے نے اپنے بیلی نال لے کے ساڈا کماد برباد کر دتا۔ بہتی واری تے بے بے گل ٹال جاندی۔ کدی کدائیں اپنی اولاد تے ناراض ہوندی، ووے ناں کریا کرو انج دے کم۔ کمینے لوک تے اِک گنے دا وی میہنا دین آ جاندے آ۔ کماد والا دھون نیویں پا کے ٹر جاندا۔ کدی بہتا ناراض ہوندی تے چھیدے دے منہ تے پیار نال چپیڑ مار دی، انج لگدا اوہدیاں گلھاں تے پیار نال انگلاں پھیر رہی اے۔ ماں جو سی، اک آئیڈیل ماں۔ اوہ اوہدے پنڈ دے سارے منڈیاں دی آئیڈیل سی۔ اوہ منڈے جدوں رزق دی تلاش وچ شہر آئے تے ساریاں اپنے رکشیاں، بساں تے ٹرکاں دے پچھے لکھایا ہوسی۔۔۔ ماں کی دعا۔۔۔ نی اوہ چھیدا فیر آ گیا۔

گل کیہ، ماں دی دعا نال ایس گھر نوں بہت بھاگ لگے۔ رب ایہو جیہے گھراں وچ بہت برکت پاؤندا اے۔ جیہڑے ممبر بن گئے سی اوہ وزیر ہو گئے۔

اک نوں دوجیاں دی ویکھو ویکھی تعلیم دا شوق چڑھیا۔ کیوں ناں میں وی بی اے پاس کر لاں، لوکی کہن گے گریجوایٹ ہو گیا اے۔ اک بھتیجے دی ڈیوٹی لائی، کاکا امتحان شمتحان دے دئیں۔ لوکی بھیڑے تے ایویں گلاں کردے نیں۔ سونہہ رب دی سکا بھتیجا سی!

دوجے کول اک زنانی کم کراون آ گئی۔ واہوا مونہہ متھے لگدی سی۔ ذرا اپنے سر تے ہتھ رکھ کے دسو، ممبری اینویں لبھ جاندی اے۔ اوہدے کولوں خرچا تاں لینا سی۔ اوہ نری پڑھی لکھی سی، پیسا پلے نہیں سی۔ اسیں حاکم لوک، سانوں وصولی دے ہور ڈھنگ وی آؤندے نیں۔ اخباراں، ٹیلیوژن والے تے ہین ای ویہلڑ، بدمعاش۔

چھیدا دسی پی پی کے اکیا تھکیا سی، بندہ اچیچا گھلیا بنکاک، کوئی میرے لائق دی لبھ

کے لیاوے۔ اگل واہنڈی ائرپورٹ تے لین گیا۔ اگوں افسر اجکل دے، کمیاں دے پتر۔ قانون پڑھاون لگ پیا چھیدے نوں۔ چھیدا تے آپ بناوے قانون۔ تھوڑا قانون اوس افسرنوں پڑھاناپیا۔ فیر رولا۔ ایہہ ماں۔۔۔ میڈیا۔

بے بے غصے نال چھیدے دیاں گلھاں تے انگلاں پھیریاں۔ 'میرا سوہنا پتر! ایہہ جیہڑے قانون لوکاں لئی بناؤندے او، بیٹا جی، اوہناں تے کدی آپ وی نظر مار لیا کرو۔'

پیار بھریاں اکھاں نال اپنے جگر تے ٹوٹے ول تکیا 'شرارتی ناں ہووے تے۔'

ooo

چیلنج دادائرہ

مفتی نعیمی نوں مار کے طالبان نے چیلنج دادائرہ کوئی بہتا ای وڈا کرلیا ہے۔

ایہہ دائرے دی گل اِنج ہے۔ اک منڈا، جوان، تکڑا، نویں نویں باکسنگ سکھی سی۔ جوانی تھلی نہیں سی جاندی۔ اک ہوٹل وچ بیٹھا یار دوستاں نال مستی کر رہیا سی۔ شراب دے دوگھٹ ودھ پیتے گئے سی۔ اچی اچی بول رہیا سی۔

اوئے کوئی ہے تہاڈے چوں میرے ٹل دا۔ یار بیلی سن، ہس کے ٹال دتا۔ اوئے کوئی ہے ایس کمرے وچ میرے مقابلے دا۔ نال دی میزتوں اک بندے مڑ کے ویکھیا، ہس کے اپنے نال دیاں نال گلاں کردا رہیا۔

اوئے کوئی ہے پورے شہر وچ جہڑا میرے نال مقابلہ کرے۔ نال دی میز والے نے اوازار ہو کے اک بھوں چک کے اوہدے ول تکیا۔ تدنوں منڈے نے ہور گلاسی اندر سٹ لئی۔

اوئے کوئی پورے ملک وچ ہے، یاں سارے زنانے ای او۔ نال دی میز والے نے، جو پوری دنیا دا باکسنگ دا چمپئن سی، گھوری وٹی پر چوہا تاں شرابی ہو گیا سی۔

گلاسی ہورسٹی۔اوئے پوری دنیاوچ کوئی۔۔۔چمپئین نے بیٹھیاں بیٹھیاں اک مکا ماریا۔شرابی شیر ریستوراں توں باہر جاڈگا۔اٹھ کے کپڑے جھاڑ رہیا سی نالے کہہ رہیا سی، چیلنج دا دائرہ کجھ بہتا ای وڈا ہو گیا سی۔۔۔کجھ بہتا۔۔۔

ہر کھیڈ وچ کوئی ناں کوئی چمپئین ہوندا اے۔جے اسلام اسلام ای کھیڈنا اے تاں کتھے ان پڑھ، ان گھڑت طالبان، کتھے مفتی۔مفتی محمد حسین نعیمی دا پتر مفتی سرفراز نعیمی۔ایم اے عربی، پنجاب یونیورسٹی توں گولڈ میڈل۔تحریک نفاذ نظام مصطفےٰ اتے تحریک ناموس رسالت دا لیڈر۔تنظیم المدارس اہل سنت دا ناظم اعلیٰ۔طالبان دے ایس نویں کارنامے نال سارا ملک ہل گیا اے۔سرکاری سوگ اتے چھٹی۔تھاں تھاں ہنگامے۔ہور تے ہور، جماعت اسلامی نوں وی سوگ پے گیا اے۔کیہڑے منہ نال مفتی دے قاتلاں دی وکالت کرے گی۔کیہڑے منہ نال مذاکرات دی سفارش کرے گی۔

صدر نوں ٹی وی تے آؤنا پیا۔فوجیاں دیاں قربانیاں، تنخواہ وچ وادھا۔پاکستان لڑائی دی حالت وچ اے۔ات وادیاں دیاں کرتوتاں، ات وادمکاون لئی پوری قوم دا ایکا۔ایس جنگ نوں اخیر تک لے جاون دا عزم۔سوات دے لوکاں دیاں اوکڑاں، اوہناں نال ہمدردی۔واہ لگدی مدد دیون دا ارادہ۔اوہناں دی واپسی اتے بحالی۔اوہناں دی حفاظت۔حفاظت لئی چھاؤنی۔سرکاری ملازماں دی تنخواہاں وچ وادھے دی گل۔

آج ٹی وی نے تقریر توں مگروں مشتاق منہاس توں اوہدی رائے پچھی کیونجو اوہ بہت وڈا سوجھوان اے۔آپ نے فرمایا ایویں وقت ضائع کیتا اے۔پالیسی بیان تاں کوئی ہے نہیں!

خورے ڈکشنریا منہاسیا وچ ہتھیار سٹن نوں پالیسی کہندے ہین۔

کجھ ایسا کفر تولیا ایمان والیاں
کہ کفر توں وی ہولا ایمان ہو گیا

رہی گل وڈے تڑکے کیتی ہوئی زرداری دی تقریر دی۔خورے چناں دن وی چڑھ پے۔خورے امداد دا پیسہ، ایس واری، سوئٹزرلینڈ ناں ای جاوے۔خورے ایتکیں جنگ اخیر تک جاوے۔خورے ایتکیں مہاجراں نوں مذہبی ٹولیاں ہتھ ناں ای وکن۔خورے۔۔۔ خورے۔۔۔

ساڈے شہر سویر وی تھیوے
پکھواں دی چھکار وی آوے

OOO

بن پتراں بن ڈالیاں

ایران دی انقلابی جدوجہد سو سال توں ودھ پرانی ہے۔ تودہ پارٹی، ڈاکٹر مصدق، مجاہدین خلق۔ اتے اج دی انتخابی جدوجہد۔ انقلاباں دا کم انجے چلدا ہے۔ سمندر دیاں لہراں طرحاں۔ پہلی لہر آئی کنڈھے دی ریت وچ جذب ہو گئی۔ فیر دوجی فیر تیجی۔ چل سو چل۔ فیر سمندر اگے کوئی روک نہیں کھڑوندی۔

شہنشاہ دے برخلاف پہلے انقلاب نوں امریکہ نے سی آئی اے راہیں ڈالراں تے خون وچ ڈوب دتا۔ دوجی لہر پہلی نالوں تکڑی ہو کے اگانہہ ودھی۔ ایس دا مقابلہ ممکن نہیں سی۔ ڈیرے داراں طرحاں ایس نوں چوری کرا دتو نے۔ انقلاب چور دوجیاں ملکاں وچ شیہہ کے بیٹھے سن۔ پکیاں کمیٹن نوں آ گئے۔ ساری دنیا ایہناں چوراں نوں پچھاتا اتے گواہی بھری

ع منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

چوراں چوری دے مال نوں انج لٹیا جیویں لٹن دا حق ہے۔ لگر لگر کر چھڈی منڈی۔ لکھاں جوان تے بچے اپنی جہالت دی قربان گھہ تے وار چھڈے۔ جیہڑا ملک ترقی یافتہ ملکاں وچ رلتی ہو رہیا سی اوس نوں بھکیاں تنگیاں وچ دھک دتا۔ پنج ہزار سالہ تہذیب والے

ملک نوں طالبان رنگے جانگلیاں تے وحشیاں دے وس پا دتا۔ حسن نقاب وچ اتے جھاڑ بوجھ سامنے۔ نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے۔

مجاہدین خلق دا میرا اک سجن مولبیاں توں ترٹھا کجھ دیہاڑے پاکستان وچ کڈھ گیا سی۔ تد میری اوس دی ملاقات ہوئی۔ جڈا اپکا ایمان میں اوس کمیونسٹ دا ویکھیا گھٹ ای ویکھیا ہے۔ اوہ بڑا اوڈا آرٹسٹ سی۔ عالمی انقلاب دے آگواں دے شاندار پورٹریٹ تربھ سیکنڈ وچ بنا لیند اسی۔ اک شعر اپنی سوہنی لکھائی وچ لکھ کے مینوں دے گیا سی۔

ماہی از سر گندہ گردد نی زدُم
فتنہ از عمامہ خیزد نی زخم

مچھی سر توں سڑدی ہے پوچھاں توں نہیں۔ خرابی پگڑ توں ہوندی ہے، گلاسی توں نہیں۔ ایران دے اک بلاگر نے اپنے اج دے ویران دیس دا نقشہ انج کھچیا ہے۔۔۔ 'باغی بی برگی'۔۔۔ بن پتراں بگیچی۔ سعدی تے حافظ دا سوہنا دیس اج ویران ہے۔ جہالت تے ظلم تے ملاں ننگے نچ رہے ہن۔ جیس دیس چوں خیام دا سوہنا نغمہ اٹھیا ہا جیس ساری دنیا دے دل وچ گھر کر لیا، کیہ مشرق کی مغرب۔ اوتھوں ہن بڑھکاں سنیدیاں ہن۔

چوراں دے گھر دیوے بلن تاں بلن۔ چوری تاں نہیں چھڈ دے۔ پہلوں انقلاب چرایا، ہن انتخاب۔۔۔ الیکشن۔۔۔۔ چرالیا۔ سائیاں رولا پایا تے چور ڈکیٹ بن گئے۔ ڈانگاں سوٹے بندوقاں۔ کنے بندے پھڑ کر چھڈے، کنے جانوں ماردتے۔

لوکاں شہر و شہر کچہری لائی، لکھاں دے وکھالے۔ مقابلے وچ جھوٹے دا اکو ہتھیار، جھوٹ تے بدمعاشی۔ پڑدہ پان دی کوشش کیتی۔ لوکائی نوں ڈراون دی کوشش کیتی۔ پر لوکائی تے اج نہیں اک ہور بلاگر لکھیا ہے۔

نومید مشو ای جاں
در ظلمت ایں زنداں

میری جان ایس کال کوٹھی وچ آس دا پلاناں چھڈ۔ اج راتیں اللہ اکبر دی واج روز نالوں بہتی ہائی۔ ایہہ اللہ اکبر جماعت اسلامی والا نہیں جیہڑا سینے توں باہر ہوندا ہے۔ اک ترکونے پلاسٹک دے بلے دی صورت وچ۔ ایہہ عوامی اللہ اکبر ہے۔ ایرانیاں روس وکھالے دانواں ڈھنگ لبھا ہے۔ سارا شہر آپو اپنے کوٹھے تے چڑھ کے اللہ اکبر دے نعرے لاندا ہے۔ جیویں پاکستانی قدرتی آفتاں ویلے اتے مارشل لا دی صورت وچ انسانی آفتاں ویلے کوٹھیاں تے چڑھ کے بانگاں دیندے ہن۔

اج راتیں اللہ اکبر دی آواز روز نالوں بہتی ہے۔ اطلاع دیون ہی اک راہ ہے۔ تسلی کروان والی۔ اکلاپے دی راہ اتے جان دی سلامتی دی راہ۔ جدوں خالی ہتھاں والی لوکائی ظالم اتے مسلح دشمناں توں اپنا حق منگدی ہے۔ روز راتیں اللہ اکبر دی آواز سواہ تھلے چنگیاڑ ہے اتے لوکائی دے جاگن دا نشان وی ہے۔

لوکاں اطلاع دے نویں نویں ڈھنگ بھال لیے ہن۔ بلاگ، اللہ اکبر، ایس ایم ایس، ٹوٹر، فیس بک۔ تو شب آفریدی چراغ آفریدم ملاں نے نھیر اپایا لوکاں دیوا بال لیا۔ ہن ہور کجھ نہیں ہوندا اتے ملاں تے اوہناں دے یار دیوے تے چانن نوں مندا بول رہے ہن۔ اللہ کرے سائنس وچ کیڑے پے جان۔ نھیرے کتھے جان۔ نھیرے والیا۔

آزادی، انقلاب اتے ایران دے چاہ مند کجھ تھوڑ دے گھابر جاندے ہن خورے مولبیاں نے اپنے بدمعاشاں راہیں لوکائی نوں قابو وچ کر لیا ہے۔ انج نہیں ہوندا سوہنیو۔ حالی تے کل ای لوکاں نے پنجی کلومیٹر لمی ہتھاں دی زنجیر بنائی ہے۔ آزادی دا گھول تے انجے چلدا ہے۔

امن تے آزادی دی جدوجہد وچ کم آون والے ایرانیاں بارے فیض صاحب لکھیا ہا۔۔۔

یہ کون سخی ہیں

جن کے لہو کی
اشرفیاں چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارض عجم
یہ لکھ لٹ۔۔۔
یہ طفل و جواں
اس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن۔۔۔۔
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن

ooo

بانگے ککڑ

جد چوچے ذرا وڈے ہوندے نیں، اپنے اک وڈے جیہناں دا شور بہ حکیم کمزور مریضاں نوں دسدے ہین، تے اوہ بانگاں دین لگ پوندے ہین اتے ہر ویلے ہر چوچے نال لڑدے ہین۔ حالی بانگ وی پوری طرحاں نہیں دے سکدے پر دیندے رہندے ہین، خورے چھری نظر آوندی ہے۔ پاکستان دے شمال وچ رب دے بانگے ککڑ اج کل ایہو کجھ کر رہے ہین۔

کئی واری ککڑیاں وی ایہو کجھ کر دیاں ہین۔ اوہناں دی بانگ سن کے لوک کہندے ہین، لو جی ایہہ تاں قیامت دی نشانی اے۔ قیامت تے خیر کیھ آونی اے، اوہ تے چودھویں صدی مکن تے ناں آئی، ناں ای ویہویں صدی مکن تے آئی، "چندا" نوں مسلماناں دے گھیرے وچ سڑک تے لمیاں پا کے کوڑے مارن نال ناں آئی۔ اینال ضرور ہے جو ککڑیاں نوں چوچیاں ہار لڑدیاں اتے بانگاں دیندیاں ویکھ کے حیرانی ضرور ہوندی ہے۔

ساری عمراں عورتاں دے حقاں بارے اتے اوہناں دے حق چ بولدیاں سنگھ بیہہ گیا اے۔ منگل سولاں جون نوں پنجاب اسمبلی دیاں 'خاتون' ممبراں دی لڑائی ویکھ کے

(نالے گالھاں سن کے) اوہناں دے خلاف لکھن نوں جی کرداا ے، پر نہیں لکھنا۔ ایک کم لئی ملاں شیر جوان تھوڑے نیں۔ اوہ تے کمزوراتے حقاں توں وانجھیاں ہویاں عورتاں دے خلاف لکھن بولن نوں بہادری اتے فیشن سمجھدے ہین۔

عورت تے انسان نوں جمدی اتے پالدی ہے۔ اوہ تے تہذیب دا سوما ہے۔ پر ماڑا ہووے میل ونڈ دا، طبقاتی نکھیڑ دا۔ حاکم میل دیاں عورتاں وی حاکم ای ہوندیاں ہین۔ اوہیو سوچاں، اوہیو طور طریقے، اوہیو بھیڑ۔۔۔

ooo

بابا جی ہن تہاڈی واری اے!

رحمان بابا دے مزار دی بے حرمتی کرن والیاں دے حوصلے ساڈے نکمے حکمراناں اپنے ودھا چھڈے نیں جو میری چنتا بابے بلھے شاہ بارے بہت ودھ گئی اے۔ اسمبلی وچ طالبان اگے ہتھیار سٹن دی قرارداد منظاں وچ منظور ہو گئی۔ کوئی کجھ نہیں بولیا، تریمتاں وی نہیں۔

سچ آکھناں کیوں ڈرنا ایں
اس سچ پچھے توں ترنا ایں
سچ سدا آبادی کرنا ایں

بربادی تے جھوٹ کپٹ نال ہوندی اے۔

جیس ویلے بولن دی لوڑ ہووے اوس ویلے چپ کرناں وسیب دا سب توں وڈا گناہ اے۔ سب توں وڈی منافقت اے۔ سب توں وڈا کوڑ اے۔

علم تے عقل دے ویریاں سوات فتح کرن توں پچھوں پنجاب ول مہاراں موڑ لئیاں نیں۔۔۔ تیری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں۔۔۔ ظالمو اسلام آرہیا جے۔

امن زندہ باد

اک بچی ونی کردے نیں جرگے۔ اساں ساریاں سوات دیاں زنانیاں مولویاں نوں ونی کر چھوڑیاں وڈے وڈے دعوے کرن والیاں وچوں کوئی نہیں بولیا۔ کدھرے طالبان تے سچ نہیں بولدے۔۔۔ مغربی جمہوریت نرا فراڈ اے۔ ایس جرم وچ سارے رلتی نیں۔۔۔ لکھ جنے، لکھ تریمتاں، ساری پنچیر و برادری

بتاں اگے سیس نوائی
جہڑے گھڑ کے آپ بنائی

ایہہ بت ساڈیاں ووٹاں نال بنے پر انھے بولے کیوں نیں؟ سوات دی دھی دیاں چیکاں ایہناں نوں نہیں سنیاں۔۔۔ میماں نوں وی نہیں۔ ایہناں دے ہیرو محمد بن قاسم نے کیس قسم دیاں چیکاں سنیاں سی۔

نعرہ لاواں؟

محمد بن قاسم زندہ باد

طالبان تے قومی اسمبلی وی زندہ باد!

دھرتی ویچ لئی نیں

دھیاں بھیناں سبھ ویاہون

نہ ماتا کسے ویاہی اے

امن زندہ باد!

ooo

اللہ دا ہتھ

اقبال آکھیا سی۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اوس دا مطلب تے شاید ایہہ سی جو سہی سلامت ایمان والا بندہ جو کار کرسی اوہدے وچ رب دی مرضی رلتی ہے۔ اج کل دے مذہبی سیاستدان ایہہ کہندے تے سمجھدے ہین جو اوہ جو کجھ وی کر لین، جو جھک مار لین، اوہنوں رب دا کیتا جانو۔

ایران کوئی تریہہ ورھیاں توں مومن ملانیاں دی کڑکی وچ پھاتا ہویا ہے۔ پچھلے جمعے اوتھے صدر دی کرسی لئی چوناں ہویاں۔ حاکماں دی مرضی دے چار پنج امیدوار سن جیہڑے اوہناں دی اجازت نال ایہہ چوناں لڑ رہے سن۔ اوہناں چوں اک حاضر سروس صدر احمدی دی سی۔ سرکار اوسدے نال، دربار اوس دے نال، عدل انصاف تے عدالتاں اوس تے نال، سیاسی مخالفاں لئی بنائی ہوئی بدمعاش فورس وی اوہدے نال۔ جتھے دیکھاں میرے پیر دا جبا (جلوہ) اوہناں چوناں وچ جتن لئی ادھے ووٹاں نالوں اک ووٹ ودھ ہونا چاہیدا ہے۔ جیکر کوئی ادھے ووٹ ناں لے سکے تاں اُتلے دو اُمیدواراں وچ سدھا مقابلہ ہوندا ہے۔

شروع شروع وچ جیہڑی گنتی آئی اوہدے وچ حسین موسوی اگے سی۔ نر سرکار نے ہتھ کیتا۔ گنتی دسنی بند کر دتی تے ست کروڑ لوکاں دے ووٹاں دا دو گھنٹے وچ حساب لا لیا بھاویں ووننگ پچاسی فی صدی۔ مولویاں تے فرشتیاں رل مل کے چھیتی چھیتی گنتی کیتی تے اعلان کر دتا جیویں کسے زمانے وچ مناظرے توں بعد ڈانگاں والے مولوی دے بندے کردے سن۔ 'ساڈا مولوی جیت گیا۔ ساڈا مولوی جیت گیا۔' اتے جتیا وی جیویں جتن دا حق ہے۔ تریٹھ فی صد ووٹاں نال! ملک وچ تریہہ فی صد بے روزگاری، ووٹ پچھلی واری نالوں ستر لکھ زیادہ۔ مسلمان حساب وچ ای مار کھاندا ہے۔ جد پنجاہ فی صد نال گزارہ ہوندا سی تے تریٹھ فی صد کاہدے لئی؟ اساں پاکستان وچ نوے فی صد ووٹ لیندے بندے تکے ہن۔ بندے؟ منہ نال متھا، جن پہاڑوں لتھا۔ کہندے نیں خیالی پلاؤ پکانا ہووے تے مسالے کیوں گھٹ پانے۔ اوہناں اللہ دے ہتھ والے موماں وی تاں تریہہ ورھیاں وچ ایناں ای سکھیا اے۔۔۔

اوہ آکھن لوکیں جھلے نے

ایہناں دب ورتو، ایہناں رج ورتو

ایہناں وکھو وکھ کر کے وڈھ ورتو

مولویاں دے مولوی آیت اللہ خامنائی کول شکایت کیتی۔ اوس جواب دتا۔ ایہہ اللہ دا ہتھ ہے۔

پاکستان وچ اقبال دی شرح لکھن دا بڑا فیشن ہے۔ ایہہ اک پورا مضمون ہے۔۔۔ اقبالیات۔

لکھو ہن نویں شرح اقبال دی۔

حسین کوئی کھبے پکھ دا بندا نہیں، کوئی لبرل یاں سیکولر بندا نہیں۔ اوہناں وچوں ای ہے۔ اوہناں دا ای ہے۔ پرانے اسلامی انقلاب دیاں موہریاں وچوں ہے۔ بس ایناں

کہندا اے، ذرا ہتھ ہولا رکھو۔ لوکائی اوہدے نال ہے، جوان اوسدے نال ہن (ایرانی ووٹر سوچوں سٹھ نوجوان ہن۔ صدقہ پھاہیاں دا تے ایران عراق جنگ دا) ظالماں، حاکماں دا دھروا پنی تھاں۔ اک خلقت وی ہوندی ہے۔ خلقت دی زبان نوں خدا دا نگارا کہندے ہن۔ نگارا وجیا۔ یدھ پے گیا۔

خلقت سڑکاں تے آ گئی۔ اودھروں بسیج، مولبیاں دی لٹھ فورس، اوہناں دے البدر تے الشمس، لاٹھی، گولی، گیس۔ یونیورسٹی تے دھاڑا کیتا۔ ست سٹوڈنٹ جانوں مار دتے باقیاں نوں ماریا کٹیا۔ ہوسٹل لٹے، لوکیں سڑکاں تے آ جاون تے 'پچھے مول ناں ولدے۔'

لکھ حاکم ڈاھڈے نے

پر خلقت اج ناں ٹلدی (ارشد میر)

لکھاں دے جلوس۔ چپ چاپ۔ کدیں کدائیں اللہ اکبر۔ ہتھاں وچ چھوٹے چھوٹے پلے کارڈ۔ میرا ووٹ کدھے؟ ویئر از مائی ووٹ؟ رائے من کُو؟ بولو سرکار۔ فوج چڑھاؤ۔ گولیاں مارو۔ کوڑ مارو۔

لبھ نہیں ویہن سدائیں

گھو گھول گھچولا

ایہناں پُن کڈھنا اے۔۔۔

وت ہڑھ چڑھنا اے

جس پٹ کھڑنا اے کرخانہ کُوڑ دا (نجم حسین سید)

○○○

انوکھا لاڈلا

اک لاڈلے بچے دی ماں ماسٹر نوں کہندی اے ویکھو جی میرا بچہ بہت لاڈلا اے بہت سیانا اے تے بہت حساس وی اے۔ جے کر ایہہ کوئی غلطی کرے تے نال دے منڈے دے منہ تے چنڈ مار دینا ایہہ آپے سمجھ جاوے گا۔

امریکہ بہادر ولوں زرداری نوں حاضری دا پروانہ ملن دی دیر سی ساڈی آزاد پارلیمنٹ دے آگو آزاد وزیر اعظم نوں سارے آپشن کھلے نظریں آون لگ پے نے۔

فوج نے تیاری پھڑ لی اے

آرمی چیف کہندا اے جیکر سولاں کروڑ بندے ہتھ پوان تے خورے آرمی صوفی دی 'افواج قاہرہ' دے مقابلے لئی تیار ہوای جاوے۔

'فوج لوکائی دے آسرے نال انتہا پسندی مکا سکدی اے' آرمی چیف۔

نواز شریف تے ہے ای انوکھا لاڈلا تے سمجھدا روی ہے۔ فٹافٹ لین بدل لئی اے۔ پاکستان بچاون دی لڑائی ہن امریکہ دی نہیں پاکستان دی لڑائی اے۔ جس طرحاں دوجی لام ویلے فاشسٹاں دے خلاف جنگ راتوں رات سامراجی جنگ نہیں سی رہی سگوں ایہہ

جنگ سی جنگِ آزادی۔ بس سوویت یونین تے حملے دا انتظار کر رہی سی۔

پرڈدھ وچ مینگناں ناں پاوے تے بکری نوں بکری کون آکھے۔ خورے حوصلہ مک گیا اے۔ لاہوری محاورے وچ کہندے نے اوئے بکری۔ میاں صاحب لئی پاکستانی طالبان حالی وی چنگے نیں! اوہ آرٹ تے امن دی عاشق ہزاراں سالاں دی تہذیب دی مالک سواتی قوم پھیر کیہہ اے؟

منڈا چنڈ کھا کے وی ٹھیک پہاڑا سنا دیوے تے شاباش ای کہندے نے۔

ooo

ون سوّنے رب

لو جی، ٹونی بلیئر صاحب وی بولے جے۔ بھلے تے ناں ہو سو ایس بندے نوں۔ کسے زمانے وچ بش دی چمچہ گیری وجھوں لیھوں بش دا پوڈل کہندے سن۔ فرماؤندے نیں، ہر فرمان والے بھیڑے بندے ہار، میں جیہڑی جیہڑی خرابی کیتی اوہ میرے رب نے میتھوں کروائی۔ میریاں کرتوتاں دا تعلق میرے رب نال ہے، اوہ مینوں سمجھاندا اے۔ (پُچھی مت دین نوں خورے سمجھانا ای کہندے ہون۔ اوہ دیاں اوہ جانے)

ایس توں پہلوں بش دا ایہہ دعوٰی تے ہر کسے دی نظر وچ ہے جو عراق ورگی ہر خرابی لئی اوہدا رب اوہنوں موہنوں تموہنی کہندا سی۔ وارے جایئے اینھے رب دے۔ جیہدے کول موبائیل فون وی ہے نیں۔

طالبان وی رب جانے کسے رب دے کہن تے کڑیاں دے سکول ساڑدے ہین اتے عورتاں تے بالاں نوں بمباں نال اُڈاؤندے ہین۔ خورے ایہو جیہے ظالمان دی حمایت وی قاضی تے مشتاق منہاس رنگے بندے کسے رب دے کہن تے کردے

ہوون۔ ایڈے رب والے لگدے تے نہیں۔ 'رب دیاں رب جانے' اک پنجابی اکھان ہے۔

رب نوں ہر پڑوچ لیا کھلارن والے لوک اپنی لوڑ ویلے رب توں ای مکر جاندے ہن۔

یملا جٹ تے رب نوں لے گئے چور۔

ooo

گھمر گھیر چ لڑناں لگدی

لڑ اوہ لما بانس ہے جس نال دھک کے سندھ دریا دے ملاح اپنی کشتی دھکدے ہن۔ جتھے پانی بہت ڈونگھا ہووے اوتھے لڑ تھلے نہیں لگدی، اُپروں گھمر گھیر ہووے تے ملاح کیہ کرے۔ ناصر بلوچ دا تھلوچی ملاح اپنی کشتی ٹھلدا ایہناں سوچاں وچ اے۔

گھمر گھیر چ لڑناں لگدی
نین جتی دے اتنے ڈونگھے
ڈھلدے دے۔نہہ دا سارا سونا
اس ہک مکھ تے آن کھلوتا
۔۔۔میں ہاں نوکر توں مہرانی

کشتی کدھرلے ونجھاں، کیویں لے ونجھاں، ایہے وچار او ہیو کری جو کشتی ٹھلسی۔ ایہہ مہراں، مہرانیاں دی کھیڈ نہیں۔ اوہ تے سوہنے لیڑے تے سوہنیاں گڈیاں دنیا نوں وکھان لئی جے ہین، وکھالین تے سمجھو پھل ہوئے۔ کجھ لٹ مار کر لئی تے پو باراں۔

اساڈا ملک وی گھمر گھیر وچ ہے، لڑ وی نہیں لگدی۔ ٹالسٹائی کہندا ہے 'میں اک

چھوٹی کشتی وچ اوس بندے ہار ساں جیس نوں ہواواں تے لہراں دھکی جاندیاں ہوون۔ اوس بندے لئی ایہو وڈا تے کلا سوال ہے جیس دا اوس نوں جواب دینا چاہی دا ہے۔ کدھر ٹھلاں؟ تے جیکر اوہ بندہ ایس بجائے ایہہ آکھے کدھرے تے جا ای رہے ہاں' تے فیر اوہ۔۔۔ پاکستان ہے! پرانیاں سوچاں کنڈم ہو گئیاں ہین۔ نویں سوچ دا حوصلہ نہیں، عادت نہیں۔

جیہڑے بندیاں ہتھ اساڈی ڈور ہے اوہناں کول ایس سوال دا جواب ہے نہیں۔ اوہناں نوں ایس دی لوڑ وی نہیں، اوہناں دے آکھنے تے کدھرے پردیساں وچ ہین۔ اوہناں موجب سوچ دا مطلب ہے حرام کماون دے نویں نویں ڈھنگ۔ جنہاں لوکاں نوں ایس جواب دی لوڑ ہے تے جنہاں کول ایسدا جواب ہے اوہ مرزے ہار لال دوشالہ تان کے ستے پئے ہن یاں مہرانیاں دے سوہنے مکھڑے پئے تکدے ہن جہڑے ایڈے سوہنے وی نہیں، ہاں، لیرے چون پاندیاں ہین۔

باٹھ سال اساں 'کدھرے تے جا ای رہے ہاں' والے ٹولے نوں اپنا مرشد بنا کے رکھیا ہے۔ اوہناں دی اوقات تے اپنی وی نہیں جو اوہناں نوں پچھے لا کے وی کوئی فخر نال ٹرے۔ ویہلڑ، لٹیرے تے بڑبولے۔ ایہہ تواریخ دے ڈھیر تے سٹن جوگ ہین۔ پرانہہ مارو۔ نیندر نال ماندے جتے نوں ترویا کرو۔ اپنی سوچ، اپنا گیان، اپنا وچار جس نوں زنگ لگ چکا ہے، لشکاؤ تے اگانہہ ودھو۔

تیری لوڑ پے گئی پتر ڈلیا اوئے۔۔۔ لدھی ماں دار کھ لے مان۔۔۔ آجا
لدھی ماں دار کھ لے مان۔۔۔ آجا

OOO

جے توں ناں مکلاوے جاندی۔۔۔

تینوں بھرم رہنا سی
کہ رنگاں دا مطلب پھل ای ہوندا ہے
بجھی ہوئی سواہ دی ہمک نہیں ہوندا

اسیں بڑے آکڑ پھاکڑ والے لوک آں۔ دیاہ ویلے پتراں دا مل ٹکا کے لیندے آں۔ دھیاں پیسے دے کے ویاہنیاں پیندیاں ہین۔ ادائیگی جہیز دی صورت وچ تے اج کل نقد وی۔ کھسم دے بتی روپے چار آنے دا احسان فیر وی سر تے رہندا ہے ساری عمراں۔ ایہہ ہے ویاہ دا مل (کڑی دا مل جیہڑا منڈے والے رل کے متھدے ہن)۔ ایس دا عربی ترجمہ ہے 'حق مہر'۔ جے کڑی والیاں نوں بہتا تھلے لانا ہووے تے کہندے نے ہنے لے لو، نقد۔ نہیں تاں جدوں تہاڈی کڑی نوں چھڈاں گے اودوں لے لینا۔۔۔ عدالت دے راہیں۔

ماپے بڑے چائیں چائیں محنت نال کوئی کماؤ منڈا لبھدے ہین تے دھی نوں دھکا دے چھوڑ دے ہین۔ اج کل منڈے کمائی کرن پردیساں نوں ٹر جاندے نے، سو کڑی دی ڈلیوری اوتھے کرنی پوندی ہے۔ C & F بذمہ کڑی دے ماپے۔

نصیبولال۔۔۔نہیں توبہ میری۔۔۔نصیباں بی بی عمر ترےٹھ سال نوں قید بول گئی ہے لندناں وچ۔قصور وچاری مائی دا ایناں ای اے جواوس نے اپنیاں تن نونہاں 'نوں غلاماں تے کُتیاں ہار رکھیا تے باقاعدگی نال کُٹیا پھنڈیا'۔اوہ کڑیاں ہے سن ایسے لائق دیاں۔اک، دو، تن سارے ماپے انھے ہو گئے سی۔اوہ مائی نویں نونہہ دی اپڑدیاں سار سوٹیاں نال کھل لاہن لگ پیندی سی، کم کرو حرام دیو، ایتھے سیراں کرن آیاں او لندناں وچ۔دن رات اوہناں توں کم لیندی سی' کمرشل سلائی مشیناں' تے۔

ساڈا جیون وچ کٹھالیاں

کھسماں دیاں اگاں بالیاں

جیہڑی قوم دے رول ماڈل بادشاہ ہوون، سیکڑیاں رناں تے لونڈیاں والے، اوہ قوم کیہ بنے گی۔بادشاہ تے بن توں رہے۔ایہدے لئی بادشاہ دا نطفہ لوڑی دا۔غلام تے لونڈیاں بن گئے۔ویسے ساڈا ابر بھکا ننگا دوجے بھکھے نوں انج ای بلاؤندا اے۔آ و بادشاہو۔

گل مکدی ایہہ جے ایہہ رحام دیاں کم ناں کرن تے کم کداں چلے۔منڈے شاماں نوں آوارہ گردی توں تھک کے گھر آؤندے ہن۔چار پیسے ہون تاں تیو بیرے رل کے باہر جان، دو دو بیراں پی کے گھر آؤن۔

وے پت، آؤندی واری دھیان نال آیو، میرے سوہنے پت۔پاتھے پاتھے آیو، روڑے روڑے ناں آیو۔ایہناں رحام دیاں پتاں نوں کئی کئی قید بولی اے ایہہ خبر نہیں آئی۔

رہ گئی گل ایس گورے انصاف دی، مولوی ساڈے ویہلے نہیں، نہیں تاں دس دیندے کسے دے عظیم ثقافتی ورثے دا کیویں مذاق لاہی دا۔

OOO

ایہہ اوہیو نواز شریف اے؟

اے پی سی وچ نواز شریف دا بیان پڑھ کے میں اوس نوں نہیں پچھاتا۔اک بالغ بندے ہار اپنی سوچ کُھل کے دسی، مڑ مڑ کے جماعت اسلامی ول نہیں تکیا۔اوس ایہہ نہیں ویکھیا جو ملاں کیہ آکھن گے، سگوں ایہہ ویکھیا پاکستان لئی فیدے وند کیہڑی گل ہے۔اوہنوں ایتھے تائیں لیاون وچ کنیاں لوکاں دا دھکہ رلتی اے، ایہہ ویکھن دی لوڑ ہے۔

اک سمندری جہاز وچوں اک بندہ سمندر وچ ڈگ پیا۔رولا پے گیا۔لوک ریلنگ نال کھڑے اوس ڈبدے بندے نوں ویکھ رہے سن، وچار کر رہے سن اتے افسوس کر رہے سن تد نوں اچن چیت اک بندے نے سنے لیڑیاں چھال کڈھ ماری۔چار ہتھ مارے اوس ڈبدے نوں گلویں توں پھڑ کے جہاز تائیں لے آیا۔بڑی بلے بلے ہوئی۔لوکاں پچھیا اوہ کیہڑا جذبہ سی جیس اس توں ایڈا اوڈا کم کرایا۔اوس ولدا دتا، جذبہ تے جھٹ ٹھہر کے دساں گا۔ایہہ دسو مینوں دھکا کیس دتا سی۔میں اوہدی۔۔۔

ایس توں پہلوں وی جد جد نواز شریف پیر پچھانہہ ول گھسیڈ اسی، لوکائی اوس نوں آہندی سی 'قدم بڑھاؤ نواز شریف، ہم تمہارے ساتھ ہیں' کدیں اوہ ٹرپینداسی، کدیں ہف

کے بیہہ جانداسی۔

اصل وچ ایہہ لوکائی لہر، خدائی لہر تت سی اوس وڈے گھول داجیہڑا عاماں لوکاں وکیلاں دی اگوائی وچ لگاتار دوسال کیتا سی، ان تھک اتے قربانیاں بھریا۔ پاکستانی وسیب جاگیرداری توں سرمایہ داری ول پلٹا کھار ہیا ہے۔ عدالتی انصاف سرمایہ داری وسیب دی وڈی لوڑ ہے، انصاف سرمایہ دار لئی، انصاف مزدور لئی، اتے انصاف عاماں لوکاں لئی۔ جاگیرداری نوں انصاف وارا نہیں کھاندا۔ پیپلز پارٹی نے ایس انصاف نوں ڈکن لئی پورا پورا ٹل لایا تاہیوں پاکستان دے سارے وڈے جاگیردار پیپلز پارٹی وچ رلتی ہن۔ ٹھیک گل تاں اینج ہے جو سارے وڈیرے ایس پارٹی وچ ہن ایس کر کے ایس پارٹی نے عدالتی انصاف دی راہ وچ ہر روڑا اٹکایا۔

میں نہیں سمجھدا جو میاں شریف دے بھولے نے سوچ سمجھ کے ایہہ راہ پھڑی ہے۔ بس تواریخ دا اپنا جبر ہے کیس توں کیہ کم لیندی ہے۔ اوس تے اگا نہہ وودھنا ہے۔ امیر المومنین بنن دا شوقی اج اپنے جغرافیائی وطن دی جنگ لڑ رہیا ہے۔ پاکستانیاں دا امیر، جیہڑے مسلمان وی ہن، عیسائی وی، ہندو وی اتے سکھ وی۔ کوئی عجب نہیں جو تواریخ طالبان توں قبائلی نظام نوں توڑن دا کم لوے تے آکسفورڈ دے پڑھے قبائلی نظام دے وکیل ٹپدے رہ جان۔

مبارکاں میاں صیب، بالغ تھی گئے او۔

ooo

خبر کی ہوندی ہے

جدوں دا لائل پور فیصل آباد بنیا ہے ایہدا مزاج ای بدل گیا ہے۔ مولبیاں دیاں جنیاں خبراں آندیاں ہن اہناں چوں ادھیاں تاں ایتھوں دیاں ہوندیاں ہن۔ اج دی خبر ایہہ ہے جو دو جوان چھوراک مدرسے دے انچارج کول ڈھائی کلو سونے دے جعلی سکے ویچ گئے۔

اخبار نوں خبر ایہہ لگی ہے جو سکے جعلی سن اتے ویچن والے منڈے عیسائی سن۔

سچی پچھو تے خبر ایہہ ہے جو اک مدرسے نے ڈھائی کلو سونے دے سکے خریدے ہن۔ ایہناں سکیاں نال اسلام دی کی خدمت کرنی ہے؟ کی گل اے فرشتے ڈالر نہیں قبولدے؟ جیکر ایہہ سکے اصلی ہوندے تے کیہدی تلی تے رکھنے سن؟

ویچن والے وچارے عیسائی ہن۔ جیکر اوہ مکرن تے مولبی کہہ سکدا اے ایہہ مینوں جھوٹیاں کردے ہن۔ میری بے ادبی کردے ہن۔ ایہناں نوں موت دی سزا دیو۔ مولبی وی تاں چنگا بھلا مقدس ہوندا ہے۔ آون والیاں نسلاں ایہہ گل یاد رکھن۔ مولبیاں نوں دستانے پا کے دھریکن۔

ٹیل پیس:

پاکستان دے جنٹلمین کرکٹر مکدے جا رہے ہن۔ پاکستان دے پہلے بالر، پہلے ٹسٹ دا پہلا بال کرن والے اتے پاکستان ولوں پہلی وکٹ لین والے خان محمد چلانا کر گئے۔ اچا لما گبھرو۔ یاراں دا یار۔۔ شیرانوالے گیٹ دے اندر جمیا تے پلیا لہوریا، لہوریاں ہار سدھی گل اگلے دے منہ تے ماردا سی۔ جیویں دی اوس دی بالنگ سی، تیراں ٹسٹاں وچ چونجا وکٹاں، بہتیاں بولڈیاں ایل بی ڈبلیو۔ کرکٹ کنٹرول بورڈ دے اک کھانے تے بورڈ والیاں اپنی کاروائی پاون لئی مشرف نوں دسیا، جی اسیں اہناں نوں کوچ لا رہے ہاں۔ مشرف آکھیا ایہہ تے ولایت وچ رہندے ہن۔ خان محمد آکھیا ایہہ جہڑے گورے کوچ تساں لائے ہن ایہہ گوالمنڈی رہندے ہن؟

OOO

اِک چنگا مُلّاں

ناں سی اوس دا نصرالدین۔ بخارا دا خواجہ وی کہندے ہن۔ ازبک آفندی کہندے ہن۔ مُلّائے مشہور وی۔ رہندا سی لوکاں دے دلاں وچ۔ ویسے اوس دا ملکھ سی ایران، ترکی، افغانستان، سنٹرل ایشیا، مصر اتے ہندستان۔ جمیا سی اوہ بلخ، بخارے، قاہرہ یاں اک امریکی ویب سایٹ موجب امبر سروچ۔ گل ایہہ ہے جو اوس دا برتھ سرٹیفکیٹ گواچ گیا ہے۔ کجھ کہندے ہن اناطولیہ وچ، اشہر وچ رہندا رہیا۔ اک شہر وچ اوس دے ناں دا پارک وی ہے۔ کونیا وچ چلانا کیتا۔ یونسکو نے اُنی سو چھیانوے نصرالدین دا سال متھیا ہا۔ اوس دا زمانہ ہے تیرھویں صدی۔ سلطنت سلجوقیاں دی۔ چارے پاسے سنی مسلمان بادشہیاں۔۔۔ بادشاہ، دربار، وزیر، امیر، درگاہاں، مقبرے مزار دربار پیر متولی، کوتوال، پیادے، جاسوس، ٹیکس لین والے، سود خور، علاّمے قاضی مُلّاں۔ دھوم دھڑگے، موجاں ای موجاں، چارے پاسے فوجاں ای فوجاں۔ غریباں دی جان کڑکی وچ۔ بھکھ ننگ غریبی کھوہ کھنج۔ ظلم زیادتی، داد ناں فریاد۔ ملاں لوکاں دا بندہ سی، لوکاں وچ، لوکاں ہار رہندا سی۔ اوس نوں ڈھیر نفرت ہائی منافقت توں، لٹ کھوہ توں، ظلم توں۔ فوجاں تے اوس کول ہان کوئی ناں، اک عقل ہائی، دنیا دی اصلیت دی سمجھ ہائی، دنیا تے ہسن دی ہمت ہائی، لوکاں نال اوس نوں تے

اوس نال لوکائی نوں پیار آہا، لوکاں دی بُکل ہائی۔ گلاں باتاں وچ، ہاسے ہاسے وچ لوکاں نوں ایس کوڑ ویہار دی مَت دیندا ہا۔ جتناں ہوسکدا لوکائی نوں ایس ظلم توں بچاندا ہا، ظالماں دا ہاسا پاندا ہا۔ ظالم بادشاہاں، چکری وزیراں اتے لالچی ملازمان سرکار نوں ذلیل کر کے اوس نوں بڑا سواد آندا ہا۔ ظاہرا جھلا بن کے حاکم میل نوں ننگیاں کردا رہندا ہا۔ اپنی ذات دا لوبھ ہا کوئی ناں، جو پیسا دھیلا ہتھ آندا لوکاں وچ انجے ونڈ چھوڑ دا سی جیویں اپنی عقل تے سمجھ ہاسے ہاسے لوکائی وچ ونڈ دا رہیا۔

اک دن اک بندہ ملاں کولوں اوس دا کھوتا منگن آیا۔ ایہہ کھوتا ملاں دالدا وی سی، اوہدا یار وی تے بانہہ بیلی وی۔ ملاں کیہا کھوتا تے شہر گیا اے، تد نوں کھوتا بول پیا۔ اوس بندے روہ کیتا، ملاں جی کھوتا تاں گھر وچ ای ہے۔ ملاں آکھیا میاں تیری مرضی اے، میری گل دا اعتبار کریں یاں کھوتے دی گل دا۔ کئی سالاں توں اکھاں والے لوگ طالبان تے اوہناں دے ظلم دی گل کر رہے سن۔ پر سرکار ایہہ گل منن تے راضی ناں ہائی۔ ہر طراں دی سرکار... وزیر، افسر، فوجی، ملاں۔ قاضی ورگے بندے تے ایہہ وی کہندے سن، طالبان تے قاعدہ دا وجود ای کوئی نہیں اوس چتر زنانی ہار جہڑی اپنے یار نال رلی بیٹھی سی، بندہ اوس دا کھجیاں لاہندا پیا ہا۔ اوس پچھیا ایہہ کون ای، آہندی اے کیہڑا کون، تیری نظر خراب ہوگئی اے۔ مشتاق منہاس رنگے بندے تے ایہہ وی کہندے سن، اسیں اکھیں ویکھ آئے آں، لوکائی تے خوش ای بہت اے ایس ظلم تے۔

ہن ڈالراں دی آس لگی اے تے طالبان وی نظر آ گئے ہن تے اوہناں دے ظلم وی۔ فضل الرحمان حالی وی کہندا اے فضل اللہ نال گل بات کرو۔

پوری فوج تے ایرفورس اپنا ٹل لا رہی اے طالباں دے خلاف کیونجو اوہ امریکہ دے ضلع سوات تے مل ماری بیٹھے ہن۔ امریکہ دی لڑائی پئے لڑدے ہن۔

تہاڈی مرضی اے فوج دی ہڈ بیتی تے یقین کرو یاں قاضی تے فضل الرحمان جیسے عقلمند تے ایماندار بندیاں تے۔

اِک لیلہ اک بگھیاڑ

ہر کسے اپنی نانی توں، اپنی دادی توں، اپنی بے بے توں باتاں سُنیاں ہن۔ اج میں وی اک بات سناواں جے منّو تے۔

اک بہت سوہنی پہاڑی وادی ہائی۔ انچ انچ نرم نرم، ہری گھاہ نال ڈھکی ہوئی۔ ٹھنڈے تے مٹھے پانی دے سومے۔ چھوٹیاں چھوٹیاں ندیاں چ پانی ترل ترل وگے۔ نکیاں تے وڈیاں آبشاراں، ٹھنڈیاں واواں، سوہنے سوہنے پھلاں نال لدے بوٹے۔ گل کی کوئی بندے دا پتر ہووے تاں ویکھ کے ای شاعر بن جائے۔ انج دی تھاں جیس دی نقل مار کے لوکاں جنت دیاں کہانیاں گھڑیاں ہن۔ بس نری پُری اپنی سوات دی وادی سمجھ لو۔

کہانی دا سواد تاں اوندا ہے جے اُگھارا دیو... چنگا فیر... اگے ٹرئیے۔ جیہو جیہی سوہنی تھاں تہو جیہے بندے۔ کی کہندے نے، آرٹسٹ۔ ہاں اہیو صحیح اکھر ہے۔ اکھاں دی نجھ لالا کے ایہہ سوہنی وادی ٹوپیاں تے، چولیاں تے، شال دوشالیاں تے لاہندے رہندے سن۔ ہر آئے گئے نوں رات دی تھار تے سوادی کھانا کھواندے سن۔ لڑائی جھگڑے توں دور۔ ہزاراں سالاں دی تہذیب۔ کئی بھکے ننگے آئے، کھا پی کے وگ گئے یاں اتھائیں وس

گئے۔ ساوٗ بندے، سادمرادے۔ کسے لیلے ہار معصوم۔

پرانہہ پہاڑ ول، شمال ول، سِکے پہاڑاں تے سِکے بندے۔۔۔ چلو بندے ای کہہ لئو۔ پتھر دے ول۔ جنگلی جنوراں رنگیاں شکلاں، اُنجھ دیاں ای عقلاں۔ وڈے شکاری ماں دے۔ کلا دوکلا لبھ جائے تے لئو۔ وڈھ کے سٹو۔ واہ لگے تاں دھیاں بہناں چائو، لے جاکے واڑیاں چ بند کردیو۔ شکلوں جاپن بگھیاڑ۔ چلو بگھیاڑ ای کہہ لئو۔ کہانی اگے ٹوریئے۔

اک دن اک بگھیاڑ اک لیلہ تکیا۔ آکھدا اے اوئے لیلیا، تیرا اخلاق بہت خراب اے، میں تاں ایہہ وی سنیا اے توں ٹی وی تکدا رہنا ایں۔ اوس ولدا دتا، بھا جی تسیں خورے کیہڑائی وی تکدے او، اساڈا تے جد کھولو، عذاباں دی بشارت دیندا ہے۔

میں سنیا اے توں مولبیاں نوں ووٹ پانا ایں ناما نیما۔ اوس آکھیا، سر جی بندے جو ہوئے، وسیب بہت اگانہہ ودھ گئے ہن، ایہہ جیون دا نواں ڈھنگ ہے۔ اوئے تینوں پتا نئیں، عقل دیاں گلاں کرناں، ووٹ پانا تے ووٹ گھن ناں کفر ہے۔

بگھیاڑ ہا پرانے زمانے دا، قصے کہانیاں تے پلیا۔ اوس ایسپ دیاں وی کجھ کہانیاں سنیاں سن۔ اوہدا خیال سی دوچار ہور وچار اپنے بگھیاڑ وڈ کیاں دے ایہنوں سناواں گا، سر ایس دا قلم کراں گا، بگھیاڑاں والا نعرہ لاواں گا، اہنوں کھا جاواں گا۔

اوہ جنور دا پتر اک چھوٹی جہی گل بھل گیا جو زمانہ پرت رہیا اے، پرت گیا اے، انسان جنوراں نالوں ڈھیر تکڑا ہو گیا اے۔ اوس پہاڑ دی ٹیسی تے بیٹھے فوجی شارپ شوٹر نوں ناں ویکھیا۔

اپنی میری بات، اتوں پئی رات
چھتنا سی کوٹھا، چھت لئی سوات

○○○

آزادی دی پری ـــــ ندا آغا سلطان

دکھیاں دے دکھ دکھیارے ہی جان سکدے ہن۔ ایران دی سوہنی قوم نال تریہہ سالاں توں ملاں آمریت نے کی نہیں کیتا۔ سب دنیا گواہ ہے۔ اسیں تے اوہناں دے گواہنڈی ہاں تے آپوں آمریتاں دے ڈنگے ہوئے ہاں۔ اسیں اوہناں دا دکھ جاندے ہاں، سیاندے ہاں۔ کیونجو اساڈی غلامی تے دوہری تہری ہے۔ اساڈے ڈکٹیٹر رنگ برنگے ہن۔ کدیں فوجی، کدیں وڈیرے۔ ایس توں اڈ جہالت دی اتے ملاں دی آمریت تے، نہراں دی زبان وچ، دوامی ہے۔ پر سانوں تے پنجابی فلماں طراں کدے کدائیں کامک ریلیف وی لبھ جاندا ہے۔ زرداری رنگے عوامی صدر وی آجاندے ہن۔ ایرانی شوہدے بدقسمت ہن، اکو جہیاں شکلاں، اکو جہیاں عقلاں.. یاں ناعقلاں..والے مسخرے جہڑے اپنے آپ نوں عقلمند سمجھدے ہن۔ رب اپنے آپ نوں عقلمند سمجھن والے کم عقل دے عذاب توں سب نوں محفوظ رکھے۔ آمین۔

ہن توڑی تے ملاں دے غضب دا نشانہ اوہ ہو رہے ہن جہڑے شاہ ایران اتے سی آئی اے دے دشمناں دی لسٹ وچ سن، مجاہدین خلق تے ہور آزادی تے انصاف دے

دیوانے۔ ہن اوہ لوک وی نشانے تے آ گئے ہن جہڑے پہلوں پہلوں تے اسلامی انقلاب دی بھوت پھیری وچ آ گئے سن پر ہن جنہاں دیاں اکھاں کھل گئیاں ہن۔ جس راں پاکستان وچ لوکائی طالبان دے اسلام اتے منور حسن دے اسلام توں نکو نک ہو گئی ہے تے اکھاں کھول کے عمران دے داڑھی مُنے برانڈ نوں وی سیان گئی ہے۔

رولا اودوں بنیا جدوں مولبیاں کولوں اک چھوٹی جیہی غلطی ہو گئی۔ کوئی سوچوں پچھاہ حلقیاں وچ ووٹاں دی ہیرا پھیری پھڑی گئی۔ غلطی تاں چھوٹی سی۔ تسیں جاندے ای او چھوٹی غلطی کی ہوندی ہے۔ کوئی مجھیل منڈا جوانی دے جوش وچ کوئی بندہ وڈھ لیندا ہے تاں اوس دا بھایا جیہاں نوٹاں نال بھر کے ٹھانے جاوڑدا ہے 'اوئے ٹھانیدارا! ایہہ منڈے توں اک چھوٹی جیہی غلطی ہو گئی ہے۔۔۔'

ویلا لنگھن نال نویاں نسلاں آ جاندیاں ہن جنہاں نوں انہاں 'عظیم ثقافتی قدراں' دا علم نہیں ہوندا۔ ایران دی نویں پڑھی لکھی نسل نوں وی ایہہ جوک پسند نہیں آیا۔ آزادی، انصاف تے تسیں جانو مغربی قدراں ہن اتے نوجوان 'مغرب زدہ' ہن۔ امریکہ دی سازش ہونی اے تاہیوں تے لکھاں لوک سڑکاں تے انصاف منگن آ گئے۔ اوئے جھلیو، انصاف انج لبھدے ہن۔ اللہ دا اسسٹنٹ تہاڈے وچ وسدا ہے۔ اوس کہہ چھڈیا ہے ایہہ دھاندلی اللہ دے ہتھ نے کیتی ہے۔ من لو اللہ نوں من والیو۔ فیر روز سڑکاں تے آون دا کی مطلب ہویا۔ ایہہ تاں نری پری برطانیہ دی سازش ہے۔

اللہ دا غضب جوش وچ آیا تے اوسدے اسسٹنٹ دا۔ انی سو بیاسی وچ جمی اک ملوکڑی جیہی کڑی دے دل تے گولی کڈھ ماری۔ اوس وی تاں حد کر چھڈی ہائی، جینز پائیاں ہوئیاں سن۔ ایہہ جینز تاں اوہ ایٹم بمب ہے جہدے نال ملاں دا اسلام اُڈ سکدا ہے۔

پیو دے ہتھاں وچ جان دے دتی۔ بے غیرتی دی حد ویکھو، پیو تے دھی رل کے آزادی منگدے ہن۔ ہین ناں قیامت دیاں نشانیاں۔ گولی مارن نال کڑی دے مونہہ

چوں وی لہو دا فوارہ نکلیا تے اوہدے سوہنے مکھڑے تے کھلر گیا۔ پیو نے اوسدا ہتھ پھڑیا ہویا ہے، چٹے والاں والے پیو نے۔ کڑی اکھاں اکھاں وچ اپنے بابلے نوں وداع کر رہی ہے۔ برا ہووے نویں ٹکنالوجی دا ایس دی وڈیو بن گئی۔ سارے ایرانیاں تکی، سارے جگ ویکھی۔ ندا دیاں ویران اکھاں سارے ایران دی آواز بن گئیاں۔ ندائے ایران۔ وڈیوز دا ہڑھ آ گیا۔ کسے وچ اوس دے پیو ولوں مرثیہ۔ کسے وچ داریوش دا میوزک، داریوش جہڑا اپنے گیتاں دے میوزک نال ای تہاڈیاں چیکاں کڈھا دیندا ہے۔ میوزک دی طاقت جیس توں ملاں کنبدا ہے تکنی ہے تاں یوٹیوب تے ایہہ وڈیو ضرور ویکھو۔ ایہہ سبھے وڈیو دختر ایران ندا لئی' اتے 'ہر انسانی کہ ازیں دردر نجید' لئی بنیاں ہن۔ ہر اوس انسان لئی جہڑا ایس درد نال دکھی ہے۔ کہڑا ہے جہڑا انسان ہے تے دکھی نہیں ایس ملاں وکھالے توں۔ جناں، بھوتاں، مولبیاں نوں چھڈ لو۔

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔

مسیتاں تے مسیتراں دا قبضہ ہے، ندا دی غائبانہ نماز جنازہ تے پابندی لا دتو نے۔ مولبیاں دے ہتھ کنے لمے نے۔ ظالم دی رسی کنی لمی اے، رسی والیا۔

ندا داوالد اپنے ہتھاں وچ جان دیندی دھی نوں بے وسی نال تک رہیا ہے۔

ندائے سرزمین
ندائے من، ندائے من
ترا از دست نمی دہم

ایران جاگ پیا ہے۔ ایس جاگے ہوئے ایران نوں سلام۔ ایران دی بہادر لوکائی نوں سلام۔ ایران زندہ باد۔

ooo

آیا طوفان!

صوفی تے اوس دے جوائی دیاں سوہنیاں سوہنیاں گلاں نال تے اخباراں بھریاں رہندیاں ای ہن، خاص کر اردو اخباراں۔ فیر میڈیا تے اوہناں دے بندے ہن، نو مسلم مشتاق منہاس ورگے جنہاں نوں اسلام دی سمجھ ای طالبان دا قتل غارت ویکھ کے آئی ہے۔ کہندے نیں صرف اک عورت دی عزت دی خاطر تے صوفی دا اسلام قربان نہیں کیتا جا سکدا۔ عورتاں دے حق حقوق دیاں گلاں کرن والے تے ویسے وی اسلام دشمن ہن تے ظاہر ہے پاکستان دشمن وی ہن۔ فیر اوتھے دی سرکار ہے جہڑی اجمل خٹک تے صوفی دے اشتراک نال شرعی پختونستان دی آس لا کے بیٹھی ہے۔ صوفی دا بلارا امیر عزت خان ہے۔۔۔ ہن پتا لگا اے جو جماعت اسلامی توں باہر وی امیر ہوندے ہن۔ مسلم خان ہے۔ فیر اوہناں دا نواں وکیل ہے جماعت اسلامی دا نواں نواں امیر جہڑا صوفی دا اک فتوا نہیں جھل سکیا۔

ہن رب نے صوفی نوں بھاگ لائے ہن تے اک پتر وی جم پیا ہے، جوان! پہلوں دی ہوسی، پر میں اوس داناں پہلی واری ہنے سنیا ہے۔ انگریزی اکھان ہے 'واور ولا یچ

لٹو طوفان وڈھ لٹو' سوہنے پتر آندیاں سوہنی خوشخبری دتی ہے 'جے سرکار ساڈی گل ناں منی تے وڈا طوفان آسی'۔ ایہہ رضوان اللہ فاروق سرکار توں کی منگدا اے، کوئی وی مولوی سرکار توں کی منگدا اے۔۔۔ بس منگدا اے۔

مولوی جو طوفان تولدے ہن اوس نال چھوٹے چھوٹے طوفان تے جھلدے ای رہندے ہن، برخوردار رضوان نے وڈے طوفان دی دس پائی ہے، رب خیر کرے۔ ویسے ملاں مسلمان ہووے، عیسائی ہووے یاں یہودی قیامت دی خوشخبری تے روز سناندا اے۔ بدّ وڈے کہن موجب ایتھوں کدی خیر دی خبر نہ آئی۔ اج دی اک ہور خوشخبری سعودیاں دے وڈے جاسوس نے پاکستان وچ فوجی بغاوت دی دتی ہے۔ کسے نوں پتہ ہووے صوفی دے کنے پتر ہن؟

ooo

عمرانیات

عمرانیات انسانی چلن دا سائنسی مطالعہ ہے۔ بندیاں دے موہنوں تموہی وہار توں لے کے پورے وسیب دے چالے سمجھن داناں ہے۔ ایس نال لگدیاں سائنساں ہن رہتل نوں سمجھن دیاں، وسیب وچ اولا بدلی دیاں، انساناں دی اگانہہ ودھدی تواریخ داویروا، انساناں دی جرت، وسیب وچ میل جن داویروا، میل گھول دا، انسان کیویں بدلدے ہن، وسیب کیویں بدلدے ہن اتے تواریخ کیویں بدلدی ہے۔ جاگیرداری پلٹ کے قبائلی نظام ول کیوں نہیں جاندی۔ اگانہہ ول، سرمایہ داری ول جاندی ہے کیونجو تواریخ دی روڑھ اگانہہ ول ہے۔

ایہہ ڈاکٹر منظور اعجاز دا مضمون ہے پر پاکستان وچ عمران خان دا خیال ہے ایس داناں اوس دے ناں تے ہے! ایس کر کے اوہیو ایس دا ماہر ہے۔ پنجاب دا ضلع میانوالی قبائلی وسیب دا علاقہ ہے، ایسے پاروں عمران ایس رہتل داوڈا وکیل ہے۔ ایس ضلعے وچ کوئی اپنی دھی نوں پڑھالوے تے آہندے ہن فلانا بڑا بے غیرت۔۔۔ رتے چیش۔۔۔ اے، وہیاں پڑھیندا اے۔ عمران نوں قبائلی سرداروی چنگے لگدے ہن تے اوہناں دی رہتل وی۔ پاکستان دے قبائلی علاقیاں وچ اج وی عاماں لوکاں نوں ووٹ دا حق نہیں۔ عورتاں تنوں مڈھلے

حقاں توں محروم ہن۔۔۔ بولن دا حق، ایدھر اودھر جاون دا حق اتے اکٹھے ہوون دا حق۔ پاکستان داوڈا سوجھوان عمران فرمیندا ہے جے کر ایس میوزیم وچ رکھن جوگ قبائلی رہتل نوں تروڑیا گیا تے۔۔۔ اوہدے منہہ وچ کھیہہ۔۔۔ پاکستان خودکشی ول ٹرپئے گا۔ قبائلی رہتل عام بندے نوں سوچن دے عذاب توں بچاندی ہے ایسے کر کے عمران ایس دے سوہلے گاندا ہے۔ قبائیلیت دا دوجا وادھا مکھی تے مکھی مارن دی صفت ہے۔ اک رنگے لیڑے پاؤ، اک رنگیاں مچھاں، اک رنگیاں داڑھیاں، اکو رنگیاں عقلاں۔ عورت اپنی مرضی کرے تے وڈھ دیو۔ بے غیرت بندا دھی بھین وڈھ کے غیرت مند ہو جاوے۔

جیس دیہاڑے میں عمران خان دا کوئی بیان پڑھدا ہاں اوسے ویلے پچھلے دن دی اخبار کڈھ کے اوہیو بیان قاضی حسین احمد دے ناں نال پڑھ لیناں۔ تنخواہ دار قاضی تے ریٹائر ہو گیا ہے۔ عمران وچارا ہن جماعت دے نویں نویں امیر دے بیاناں دی اُڈیک وچ رہسی۔ جیہڑا کہندا ہے میں تے صوفی اک مک ہاں۔

بابے فرید آکھیا ہا، اپنی گل تے پہرا دیو، کوک فریدا کوک، جیویں راکھا جوار۔ اک عمران خان ہے پوہلیاں تے لکھ کنڈیاں دا پہرے دار۔ پر باطل تے سر پرنٹھ جاونا ہے۔ تواریخ دا روڑھ تے وڈے وڈے فرعون ناں ڈک سکے، عمران خان کیس گنتی وچ اے۔

دنیا غلام داری قبائلی وسیب توں جاگیرداری، جاگیرداری وسیب توں سرمایہ داری ول ٹرگئی ہے۔ ہن اگانہہ ودھ کے سامراج یاں سوشلزم دی پدھر تے اپڑ گی ہے۔ پر ساڈا کاکا تاں کہندا۔

بے بے میں تے سرداری لیساں

ٹیل پیس: اک خبر۔۔۔ افغانستان وچ اکو سوراے، اوہ وی چڑیا گھر دا، اج کل قرنطین وچ ہے۔ پاکستان وچ کتنے ہن؟

ooo

کنیئرڈ کالج وچ برقعے لاگو ہو گئے نیں

کنیئرڈ کالج وچ برقعے لاگو ہو گئے نیں۔ حالی نیں۔ کہندے نے سُتھناں پاؤ کیونجو ایہہ مشرق بعید دی ریت ہے تے اساں ہاں پیسے بچے، ریت دے غلام، رواج دے غلام تے ہور خورے کاہدے کاہدے غلام۔ جینز تے اُکا نہ پاؤ متاں کل تہاڈا دل سائیکل چلاون نوں کرے، موٹر سائیکل چلاون نوں کرے تے ہوندیاں ہوندیاں ملک چلاون نوں کرے۔ کنیئرڈ کالج لاہور دکھنی ایشیاء دے مشہور کڑیاں دے کالجاں وچوں ہے۔

کہندے نیں برقعیاں والیاں گجھ بی بیاں نے کڑیاں نوں تڑھی دتی ہے۔ کالج والے ایس گل توں مکردے ہن۔ مالاکنڈ دے کمشنر نیں وی تاں طالبان دی معصومیت دی سونہہ چائی سی۔

بڑھک مارن توں اسیں رہ نہیں سکدے۔ اساں کوئی ڈردے ہاں طالباں توں؟ ناں جی ناں۔ اساں اپنے حلیئے اوہناں دے ڈرتوں تے نہیں وگاڑے۔۔۔ بس شوق اے۔ ویسے وی طالبان حالی پنجاب تک نہیں پجے، صرف۔۔۔ طلبا ای پجے نیں جیہناں دیاں کرتوتاں ہر اوہ بندا جاندا ہے جس نے کالج یاں یونیورسٹی وچ جھاتی پائی ہے۔ جہالت

اوہناں دے ایجنڈے دا پہلا آئیٹم ہے، بدمعاشی دوجا، پرچی تے اپنے منڈے پاس کرانا تیجا تے فیر اوہناں نوں سرکاری نوکریاں دوانا، ایجنسیاں وچ واڑنا تے ایہو جیہے ہور چنگے چنگے کم۔

ایہو جیہے سید جاوید کمشنر وی بن جاندے نیں، مالاکنڈ وچ پوسٹنگ وی کروالیندے نیں۔ طالبان دا راہ سوکھا کردے نیں، سرکاری ملازماں نوں مرواندے نیں، سرکار دا کھاندے نیں، دین تے دنیا سواردے نیں۔

OOO

وچار ڈاٹ کام پر جو کالم، ہفتہ بھر کا بہترین کالم ہوتا اسے وہ دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کرتے۔ بھائی کے کئی کالموں کا اسی طرح ترجمہ کیا گیا۔ ایک کالم کا سندھی عکس پیش کیا جارہا ہے۔

http://www.wichaar.com/
April 30th, 2009

ڊاڪٽر مقبول اختر : ڪنيرڊ ڪاليج ۾ برقعا

ڊاڪٽر مقبول اختر



ڪنيرڊ ڪاليج ۾ برقعا لاڳو ٿي ويا آهن. اڃا نه. جيون ٿا ته سڱڻون پاپو جو جو هي مشرق بعد جي ريت آهي ۽ اسان آهيون بي يا پار، ريت جا غلام، رواج جا غلام ۽ شايد الاهي ڪنهن ڪنهن جا غلام. جيئن ته صفا نه پاپو مٿان اڀئن نه ٿي جو سوالي توهان جي دل سائيڪل هلائڻ لاءِ چئي، موٽر سائيڪل هلائڻ لاءِ چئي ۽ ڪندي ڪندي ملڪ هلائڻ لاءِ چئي. ڪنيرڊ ڪاليج لاهور ٿڪڻ ايشيا جي مشهور ڇوڪرين جي ڪاليج سان هڪ آهي.

جيون ٿا ته برقعن وارين ڪجهه بيبين ڇوڪرين کي ڌمڪي ڏني آهي. ڪاليج وارا انهي ڳالهه کان انڪاري آهن. مالاڪنڊ جي ڪمشنر به ته طالبان جي معصوميت جي سونهن چاهي ورتي هئي.

ڪوڙ ڳالهائڻ ڪان اسين رهي نٿا سگهون. اسان کو بچون ٿا ڇا طالبان ڪان؟ نه ادا نه. اسان پنهنجا حلوا انهن جي ڏب ڪان ناهن مٿايا........... بس شوق آهي. اوهان به طالبان اڃا ڌاڻين پنجاب ڌاڻين ناهن پهتا. صرف _____ طلبا ئي پهتا آهن. جنهن جي ڪرتوتن کي هر اهو ماڻهو سڃاڻي ٿو جنهن ڪاليج يا يونيورسٽي ۾ جهاتي پاتي آهي. جهالت انهن جي ايجنڊي جو پهريون اُتلم آهي، بدمعاشي پيون، پرچي ۽ پنهنجا ڇوڪرا پاس ڪرائڻ ٻيون ۽ ٽيون انهن کي سرڪاري نوڪري ڏيارڻ، ايجنسين ۾ داخل ڪرائڻ ۽ اهڙي قسم جا ٻيا چڱا ڪم.

اهڙا سيد جاويد ڪمشنر به ٿي ويندا آهن، مالاڪنڊ ۾ پوسٽنگ به ڪرائي ڇڏيندا آهن. طالبان جو رستو اسان ڪندا آهن. سرڪاري ملازمن کي مارائيندا به آهن، سرڪار جو ني ڪاٽيندا آهن، دين ۽ دنيا سنواريندا آهن.

Ah, the party

Sir

01 June, 2009

"Thus upon all the points of attack automatically converged angry human swarms... This was their battle... For the moment that incoherent multiple will was one will..."

This is an extract from the famous book by John Reed "Ten days that shook the world". It is an eye- witness account of the great October revolution, the Russian revolution of 1917. This account very aptly describes what happened in Pakistan on the15th March... "Ides of March" we had been warned to be aware of! I do not imply that what happened on 15-16 march in Pakistan was a revolution. No, not "nearly a revolution" either.

It was at the very least a dramatic moment, a turning point, We had reached a point where personal frustration had turned into national frustration. This is the point where individuals opt for suicide and nations for irrational acts that lead to blind alleys and destruction. At those points in history the people reject the dispensation handed out to them and are ready to do anything for a change AND if they have a revolutionary party to lead them they bring about a revolution. This last condition of a revolutionary party not being met we are still stuck with what we have.

There is however, one positive gain. We have another stint at life, a path to progress, if we so chose. I salute the people. I salute people's power.

A Solution to the Sugar Crisis

27 Oct, 2009

Sir

Is there any law that prevents the "free" Pakistani media to publish or broadcast/telecast

1. The total number of sugar mills in Pakistan
2. The names of all those mills
3. The names of the owners of those mills
4. The names of directors of those mills.

Just let the people know. They will find the solution.

Trust in God and the people.

Sweeping Away the Cobwebs

10May, 2009

It has been theorised that mullaism can be countered through culture and not through politics. I agree partly, having spent a lifetime for what in today's lingo will be termed liberal democracy and economic justice. Some still dare to talk of socialism and communism. We in our days called it progressive thought, secularism, people's democracy, socialism, communism or what you will. Millions like me dreamed the dream and passed on.

But how do you go about bringing a change in culture. Only a revolutionary change can bring about a fundamental change in culture and remove the redundant remains of previous ages. Then and only then it is culture. It probably can do what all the horses and all the men on the left could not and those on the right would not viz: the removal of the superstructure of mullaism. A cultural change brought about as a result of revolutionary political change can do it.

Mullah's only valid role in our culture is to preside over the rites of death and marriage. A mullah acting and impersonating as a moral and spiritual guide and a political leader? No way, sir, NO WAY.

I wish somebody woudorganise a marathon entitled "Sweeping Away the Cobwebs" from Lahore to Amritsar. I assure you all the Lahoris would be there at Amritsar in the evening, women included. Maybe some Faisalabadis, too, for good measure. Mullas would be there, of course, to show their faces and live upto their ideal of hypocracy; dragging their tired feet but too exhausted to weild their lathis or wag their tongues.

Language is the most important part of culture. Punjabi is well fitted to deliver coup de grace on mullaism.

RaateeN jagan kuttay, tethoN uttay!

"راتیں جاگن کتے تیتھوں اتے"

The Crime of Defiance

23 Aug, 2008

Sir

"I'll settle for the actual truth anytime", said Mark Twain. I agree. Truth it is that Justice Iftikhar Chaudhry defied the ruler of the day. Will any ruler, including the rulers of today, forgive and forget this heinous crime.

Using an Americanism,' NO WAY". That is 'the actual truth'.

So, my dear countrymen, stop dreaming of an honest Pakistan anytime soon. Not in 40 hours, nay not in 72 hours.

Long live our great culture, including our political culture!

A List of Those...

04 Apr, 2009

Sir

Abu Bin Adham awoke one night and saw an angel making a sort of list. I am also making a list of honor. I have put down the first two names. They are: Mr. Minhas and Mr. Shami, both star performers of talk shows. I am recruiting. If you think that the honor of "just one woman" can be sacrificed at the altar of Mullas for the sake of Peace(read surrender), please send in your name.

Warning: That one woman may be your daughter or sister!

He gently twisted the nation's neck. He changed the lodestar of the Pakistani nation. Qibla, he called it.

Lo and behold! The seats of learning were taken over by hoodlums in the garb of students. All learning stopped.

Armed bands of unlettered youth started marching up and down the blessed, now blighted, land of Pakistan.

A sovereign state became an instrument for the promotion of American foreign policy. We fought a costly proxy war.

The proud Pakistani female was made an object of ridicule. There was talk of putting half the population of Pakistan under house arrest for the heinous crime of being born female.

The minorities started trembling in their shoes, finding it hard to believe in the solemn pledges of the Quaid. Hypocrisy became the ultimate good. Corruption ran riot. The public exchequer and scheduled banks were pilfered with impunity.

Futuristic planning, even thoughts of and hopes about a brighter tomorrow, became contraband items. The legal tenders were an opiate — heroin and religious mumb-jumbo. The present and the future were contemtible. We started rushing pell-mell into the past.

General Mohammad Zia-ul-Haq twisted our neck. Did anyone hear the crunching of the bones? He pointed our face towards the dark ages, the right direction according to many of his cronies and hangers-on.

May God bless his soul on the anniversary of his death (August 17).

Nonsensical Statements

Daily Times 10-10-2003

Sir: According to the newspapers, FATA MNAs have threatened an uprising against the Pakistan army because of the operations in the Tribal Areas. An uprising? An opportunity to destabilize Pakistan! As if their statement wasn't silly enough, they have been supported by other politicians as well. Do they not realize that such measures not help the sands of bodyguards; we have none; worse, the police is itself a terrorist organization.

The last few days have witnessed the death of a man who lived by the gun and died by the gun. This has resulted in the burning of a police motorcycle, a cinema and a few prayer houses__ the score so far. It will take its death toll soon enough.

Whose war of independence is this? Will the initiators, perpetrators and supporters of terror ever think and be sorry? Not till the people at large refuse to be hoodwinked by religious sloganeering and politics of drugs and plunder in religious grab.

Gen Zia saw the Shape of Things to Come

Dawn, 17 Aug, 1998

'IT was a dark and stormy night'. This sentence was once judged as the most boring start for a story. I can't help it. This is the way my story goes.

There was this motorcyclist hurrying home on that dark and stormy night. No, he was not Jim Rogers, the Investment Biker — Just some foolhardy Alpha Bravo Charlie. The wind was strong and cold, chilling the bones. Who in his right senses would expose his chest to such a wind? He stopped his bike. Pulled off his pullover, put it on again with the V-neck on his back, better to save his lungs from the draught and the possibility of pneumonia. He trundled on through the dark night until that unfortunate moment when he slipped and fell in the village of the pious and the wise. The wise men gathered around him, checked his pulse and breathing, felt his bones. Everything OK. "He is alright", said a wise one, "it is just the face that is turned the wrong way." They gently turned his neck. With a small click the face settled into the right position. His chin pointing the same way the "V" of his imported sweater was

pointed. They laid him to rest on a hill where falls no hail and no wind blows.

End of part one of my story.

Once upon a time, Pakistan was going merrily on its way. A bump here, a stumble there. Otherwise all the vital signs were OK. Normal pulse. Normal breathing. Normal BP. Nothing abnormal detected — NAD.

It had survived the gravest crisis of its history. The two parts were torn asunder but both parts were alive and kicking. NAD all systems. The period of convalescence was over. Full recovery was expected.

The new millenium was less than a quarter of a century away. The nation, glowing with health, was vibrant. It was marching towards progress, towards prosperity and towards the 21st century. An elected government was in office. New elections had been held.

Zia was a foresighted general. He could read the signs. He saw the shape of things to come. 'Western' democracy was taking root. It was likely to get entrenched because it was in keeping with the character of our people. And once this blasted system got its hold there was no chance of a military government. Look at the US and Britain. They have never had the blessings of a martial law. Not even a country worse than the US in every respect, our neighbour India.

A firmly rooted democracy was indeed a very bleak prospect for adventurers, Bonapartes, rabble rousers and jackboots. Even more important was the question: "Where would the meddlesome world powers find a foothold?"

General Mohammad Zia-ul-Haq came. He saw. He conquered with one bold sweep his own motherland Out democracy. Out rule of law. Out Parliament. Out legitimacy.

The Brigand

24 May, 2009

The brigand is presumably (and usually) a human being and entitled, therefore, to all the basic human rights enshrined in The Universal Declaration of Human Rights. A clause missing in the extant draft but which needs to be added shall read: It is the basic right of all armed men(males to be specific) be they mad rassa students or hardened mullahs, fundamentalists or terrorists, Taliban or ordinary mortals if they fulfill the condition set out at the beginning of this section, to form armed bands for lifting cars, women and children, including NGO women; for enslaving all women; for blowing up anything that represents civilization or anything that might strengthen the state of Pakistan especially girls schools; for blowing themselves up for the specific purpose of committing suicide (with jackets specified in clause 2 of para4) when the conscience pricks or when women and children are within the range; for destroying government offices when the payment of the stipend is delayed or stopped or not increased commensurate with inflation.

The general decline of the left in Pakistan has left the onerous task of defending these rights to the two most honorable men in our midst: messrs Hussain Ahmad, Qazi or his *ex officio* replacements and that able cricketer Imran Khan. These bold men have very bravely defended the lawless louts in the tribal areas of Pakistan. And let it be known that they have done it after listening to the call of

their conscience and on matter of principle as their shrewd minds have let them conceive and not for any worldly gain or share in the booty(government agencies may duly compensate them for this sacrifice). The supreme principle as spelled out by Qazi, a religious leader, is rivaj- the traditional way. The rivaj is well known to all long-suffering Pakistanis. For the ignorant foreigners and native Pakistanis it is:

(1)car theft (2)child lifting (3)protecting and harboring murderers and hardened criminals and, lately added to the list, foreign terrorists and fundamentalists sent in by al-Qaida or imported by 'local' Taliban 4) Putting the female of the human species in its proper place i.e. shut up in high walled compounds 5)wage a holy war against all knowledge and enlightenment, specifically stopping the sinister attempt to introduce schools in these areas especially schools for girls or wage jihad enjoined by the word of mouth as spilled through the loud speakers and FM radios or with bombs, when in the mood. 6)going out to help the goons in settled areas like Gujranwala to terrorize the culturally conscious, misguided public 7) and, leaving the most important to the last, SMUGGLING, so essential for the economic health of the society.

It is the law of nature that when you set out to defend à good cause you get divine help and that too from most unexpected sources. What with the senility of Qazi and Imran, physical and mental respectively, and the other ongoing dramas sapping their energies (physical and ...), their campaign was flagging when lo and behold jump into the foray the indefatigable warriors Fazlulla, Soofi, Muslim Khan and neo- Muslim media warriors. They have raised the ante to total rule of Pakistan with the society submitting to their misogynistic credo and pre-historic ways. Zia-ul-Haq is dead. Long live Zia-ul-Haq! Smile your crooked smile, General.

talisman, lawyer or no lawyer. See for yourself the reluctance of the feudals to deliver on the promise of restoration of judiciary and the eagerness of the business classes and industrialists to support the cause even to the extent of fighting for it. And fighting in the vanguard! "Nawaz Sharif will be amongst you in person", said the PML-N chief yesterday.

It is Principles, you Fool

20 May, 2008

Sir

The average Pakistani has wondered long why Peoples Party is hindering the restoration of Chief Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry and about five dozen superior courts judges. The incumbent Prime Minister Syed Yousuf RazaGilani has spilled the beans in Sharm El Sheikh. It is a matter of principle. To do so would be unconstitutional. Constitutional is what Musharraf says or does. It is elementary, Dr Watson!

And then there is Natural Justice. Should not Justice Chaudhry be punished for defying the Establishment? Who will protect and promote the establishment if not the sitting PM?

Reminds one of a newly crowned prince who was being shown around the dungeon where long- term prisoners were kept. The first one was a dacoit who had served ten year. "Release him" ordered the new king. The next one was a murderer who had served twenty years. He was also released. Everyone was being released because the king being freshly crowned was happy. Now the king came to an old man, a mere skeleton. "He is here for the last thirty five years". The king asked about his crime. "We don't know, Your Majesty. He was put here by your great father", came the reply. The king was overwhelmed. He started crying and sobbed out the words, "Oh, keep him there for the sake of my father. May his soul rest in peace".

Justice for All

13 May, 2008

Sir

Your editorial 'PML-N's resignations' is very lucid and incisive. Here is another look at this important issue from another angle.

Marxism may be going through a lean period these days but as a means of understanding a society and the forces at war within it, it remains the best organized body of human knowledge and method of inquiry. Even the anti-Marxists, being pragmatic, use this method, perhaps more than Marxists.

The class character of PML (N) and PPP is becoming clearer with every passing day. Does the common man have some inkling? Are the intellectuals and talk show men becoming clearer in their perception? Asked about the question of feudalism vs. socialism or capitalism vs. socialism they are ready with their ready-made answers even before you formulate the question. But ask them about the question of feudalism vs. capitalism and they will be stumped. Such questions require deep thought and a system of inquiry.

Feudal socialism is beyond question the stance of PPP, but the moot question is this: is feudal socialism a kind of socialism or a face of feudalism. I contend it is feudalism, pure and not so simple. All the big feudals have gelled around Zardari as they once did around Bhutto, Sr.

The PML (N) is clearly a capitalist party, despite a few feudal faces upfront and the religious lingo of some fellow travelers. Now the real question is who to support when the contest is between feudal socialism and religious capitalism. A more important question is this: is Nawaz Sharif "ready to sustain the war/ Both of the way and likewise of the woe"(Dante)? Having asked this question I have my second thoughts. It is not for Nawaz Sharif to decide this question. The forces of the civil society that are gathering around him have taken this decision out of his hands. The strong and sustained movement of lawyers, the problems and wishes of the urban middle class and the peasantry who have no independent voice of their own and the push of the hourly swelling ranks of the poor whose problems cannot be solved by the feudals despite their apparent wish to do so. The lawyer's movement is an act in itself. Glorious and unprecedented as it is, it is still a middle class movement , fickle by its professional class character. Whence this steadfastness?

Pakistan is fast becoming a nation, stronger with each passing day despite its enemies within and without. A nation state is a concept born of capitalism and capitalism is fast gaining ground in Pakistan. Whatever the charge sheet against the excesses of capitalism, the capitalist under the compulsion of the system he represents grants to the ordinary citizen what he aspires to get for himself viz: one man one vote and justice for all. Pakistani society's transition to capitalism is also confirmed by the fact that the whole country stands with the lawyers irrespective of class and creed to get justice for all. So justice for all is the

Readable Print

07 May, 2008

Sir

May Allah bless the poor owners of your paper, the only readable paper if we consider the contents. They have condescended to print the paper on a better quality paper, at least the outer pages. I hope this is not a flash in the pan, and that the largess is ex tended to other pages. The problem is with my vision (eyesight, I mean) and not your paper. I am sure there are other old people, the so-called senior citizens, in Pakistan besides me who want to read your paper but find it a punishment for their eyes.

Twilight of the Idols

11 May, 2008

Sir

The great betrayal of the people's party has been endorsed by noon league. Yesterday's idols are lying by the roadside. Broken and hated!

There are Millions of Suns Left

18 Apr, 2008

Sir

Pakistan is astir with change, with hope. Notwithstanding, the prophets of doom are working overtime to 'dis-illusion' the nation with their learned theses making the 'confusion worse confounded'. Isn't it time we started thinking for ourselves? Let me quote at length from Walt Whitman:

"Stop this day and night with me and you shall possess the origin of all poems,

You shall possess the good of the earth and sun, (there are millions of suns left,)

You shall no longer take things at second or third hand, nor look through the eyes of the dead, nor feed on the specters in books,

You shall not look through my eyes either, nor take things from me,

You shall listen to all sides and filter them from yourself."

The Big Guns

03 Mar, 2008

Sir

Our incumbent President may be an ex-army man, he still has heavy artillery in his armour. To the very cogent and well argued statement of Itezaz Ahsan regarding the reversal of an illegal or criminal act through an executive order his spokesman has responded promptly. The said spokesman Rashid Qureshi says in his lopsided (literally) manner that the pride of the lawyers, the most clear-headed Itezaz Ahsan is spreading confusion!

Brig. Cheema. A Sleuth and Wizard par Excellence

30 Dec, 2007

Sir

"I B.U. Mahsud, in full possession of my senses, and fully competent to testify, under oath do declare that it was I who ordered the elimination of one wayward Muslim woman variously called Benazir alias Bibi or Bhutto. Andfurther that I declare that this statement is in public domain and that I, the said BUM, authorize that it may be recorded and broadcast by any competent and well-informed sleuth like brig. Cheema, the one who does not know that this said Bibi wrote a letter to the President of a country named Pakistan naming the five persons she said were a threat to her life. He may not, well-informed that he is, know about this said Benazir, now demised by the grace of Allah, having sent an email to that infidel organization CNN, the bane of all holy terrorists, naming the prime threat"

To highlight this statement was more or less the purpose of the live press conference broadcast by all the Pakistan TV channels. This press conference by the spokesperson of the interior ministry was broadcast live, contravening all PEMRA RULES!

It may, also, be of interest to note that Government of Pakistan never arrested AND released Mahsud, nor his brother, to be used another day.

Saluting the Poet of 'a Tortured Land'

01 Jan, 2008

Dear Dr Farrukh Salim!

I have always appreciated your investigative and analytical articles. You are doing a great job by shining some light into the encircling gloom of ignorance and ignominy. I never knew you had a poet's heart and sensibilities. Well done.

Your farewell to Bibi outweighs all your work, itself no less great by any measure. My friend Professor Ishfaq Bukhari, recently retired head of Urdu language and literature department of G.C. University, Faisalabad joins me in this appreciation. God bless you.

Elegy of the tortured souls is a great work indeed.

AWeird Experience

03 Dec, 2007

Sir

Boredom led me to type the word 'sonofabitch' in the search column of British daily Telegraph. Where can we Pakistanis go, O Lord! The world is becoming weirder and weirder, Alice of the Wonderland would say.

Like to try it?

A Wise Dog

10 Dec, 2007

Sir

How easy it is to bag a few seats in the upcoming national parliament. Go out and cry from your housetop, "Elections are poison for this nation, a danger for the country and likely to be rigged". You may collect a few scraps of sympathy here and there and a promise of a couple of seats for your party by the authority compiling the results of 2008 elections. Now go and file your nomination papers. Simple?

Diogenes. indeed, was a wise philosopher!

"Diogenes stood outside a brothel, shouting, "A beautiful whore is like poisoned honey! A beautiful whore is like poisoned honey! A beautiful whore . . . "Men entering the house threw him a coin or two to shut him up. Eventually Diogenes had collected enough money and he too went into the brothel."

The Basic Contradiction

29 Nov, 2007

Sir

It used to be a favorite pastime of young communists to try to find 'the basic' class contradiction of Pakistani society.

Like the 'personal service' offered by modern banks, the politics in Pakistan is centered around personalities now. All the institutions including the highest courts have been taken care of!

President Musharaf, piqued by the independent judiciary, did not forget to rail against the upright Supreme Court judges in his inaugural address. The basic contradiction is very clear now: Musharaf or Iftikhar Chaudhary, for what each one represents, Have your pick.

From the Mouth of Babes

02 Dec, 2007

Sir

"Political power flows from the barrel of a gun", said Mao. Now, does the political wisdom flow from the mouth of babes. My grandson was shouting at his mother, "Stop eating that orange. Stop! Don't do it." My daughter said, "Be reasonable, Saboor. What is this? What are you doing!"."I am the Musharaf of this house", replied the kid.

The Goonda in Civvies

27 Nov, 2007

Sir

All the citizens of Pakistan have tasted the excesses and corruption of unchallenged power. It is not just the helpless individual who has been targeted. From the supreme court judges through high profile barristers and lawyers, media persons, human rights activists and 'the pride and honor of a Muslim society'_ the ladies, have been roughed up by male, macho policemen.

The modern media has recorded all the faces committing all sort of atrocities, including a rough character holding a lady around her breasts. 'No goonda', they claim. He was a policeman in civvies!

None of the victims nor the two big of the Pakistan politics, the Bibi and the recently 'delivered' Baba, have come out with the statement that all the transgressing policemen will be prosecuted. Do they want to use them against their rivals?

Letter 'A'

28 Nov, 2007

Sir

The letter A (more precisely words beginning with the vowel sound 'a') is very important in Pakistani politics. Everyone knows the three As — Allah, America and the Army. Did you notice the new As? Beginning with the sound of "a", these are — Aitzaz, Adlia (judiciary), Ablaghiat (media), and awam!

Lincoln

Dawn, 7 Nov, 2007

Abraham Lincoln is one of the greatest, wisest and boldest of men in history. No one has done more than him for the emancipation of slaves, the dignity of man and the unity of his country. His political wisdom is surpassed only by a few. His honesty of purpose is exemplary.

To cull the insights from the sayings of great men, you need a minimum of common sense. To misquote a sage is a literary crime. To misread meanings into his text is simply foolish; childish at best, and irreverent and blasphemous at worst.

To expiate someone else's sin in distorting what Lincoln said and as a tribute to that great man, here is another quote from him:

"Every man is said to have his peculiar ambition. Whether it be true or not, I can say for one that I have no other so great as that of being truly esteemed of my fellow men, by rendering myself worthy of their esteem. How far I shall succeed in gratifying this ambition, is yet to be developed."

Normal Reactions to Abnormal Situations

15 Nov, 2007

Sir

Psychiatry is not all about madness. In fact, madness is a very small proportion of a psychiatrist's work.

And we don't use the term 'mad'. Psychiatry is mostly about interpersonal problems- the 'home front' issues- the moods, behaviours and thought disorders. The major work load of a psychiatrist comprises normal (that is, expected) reactions of people to abnormal situations. The psychiatrists in Pakistan are nowadays having a field day, in the local parlance, a good season.

A loose-loose socio-political situation with a blockade of all means of expression and interaction and frustrations galore; you have the right mix for frustration, anger, and yes, rage, anxieties, fears, phobias and depression. The-all-lies-told situation may well be spawning schizophrenia. Who knows?

The Tyrant Will Always...

07 Nov, 2007

Sir

We, as a nation, are fond of putting the time machine in reverse gear. We have done it yet again with the proclamation of emergency. We never were fond of dry facts. Our favorite diet is fiction and fable. The master of fable is AESOP, who wrote in Greek in 6th century BC. His fables contained lots of wisdom. The wisdom is optional, if you care to look for it. You may ignore it if you please, just enjoy the story! This may even be better for your life and limb, witness: lawyers in Pakistan.

The very first fable in his book goes like this:

"Wolf, meeting with a Lamb astray from the fold, resolved to lay violent hands on him, and to find some plea to justify to the Lamb the Wolf's right to eat him. He thus addressed him: "Sirrah, last year you grossly insulted me." "Indeed," bleated the Lamb in a mournful tone of voice, "I was not then born." Then said the Wolf, "You feed in my pasture." "No, good sir," replied the Lamb, "I have not yet tasted grass." Again said the Wolf, "You drink of my well." "No," exclaimed the Lamb, "I never yet drank water, for as yet my mother's milk is both food and drink to me." Upon

which the Wolf seized him and ate him up, saying, "Well! I won't remain supperless, even though you refute every one of my imputations." The tyrant will always find a pretext for his tyranny." (Italics added)

Democratic Philosophy?

Dawn 04 Nov, 2007

Sir

"I WILL drown and no one shall save me," cried the desperate man. This man who knew English as a second language (ESL) managed to drown successfully.

The most frustrating experience in the practice of a psychiatrist is the person determined to commit suicide. With the best of care and despite the best available treatment, some manage to do it.

You cannot generalise this experience and apply it to society at large. But I am tempted. The democratic philosophy being dispensed by our news channels will have us believe that the people abducting our soldiers in their hundreds and slaughtering them are 'our own', 'our brothers' (Qazi's and Imran's), therefore no action should be taken against them. The unfortunate soldiers belong to India, I presume!

Will our nation commit suicide? Or shall it!

Either or Paradigm

06 Nov, 2007

Sir

"Either you are not a Muslim or I am your Caliph", intoned blessed Zia-ul-Haq.

"Either give me the command, the absolute command ('unity of command') or to get that command, anyway, I'll destroy one of the pillars of the state- and thereby the state", says the incumbent.

To Be or Not To Be

30 Oct, 2007

Sir

I am drowning and no one shall save me, cried the desperate man.

This man who knew English as a second language (ESL) managed to drown successfully.

The most frustrating experience in the practice of a Psychiatrist is the person determined to commit suicide. With the best of care and despite the best available treatment some manage to do it.

You cannot generalize this experience and apply it to the society at large. But I am tempted. The democratic philosophy being dispensed by our news channels will have us believe that the people abducting our soldiers in their hundreds and slaughtering them are "our own", "our brothers" (Qazi's and Imran's), therefore no action should be taken against them. The unfortunate soldiers belong to India I presume!

Will our nation commit suicide? Or shall it!

Our Acts Our Angels are, or Good or Ill...

01 Nov, 2007

Sir

The greatest crime according to Saadi is to keep quiet when you must speak.

Our lads are dying right and left, abducted and butchered. They are dying to defend the cowards who do not speak because they are afraid of the mullah. Others do not speak out because they want the votes of these cowards.

I shall never come begging for your worthless votes my worthless contemporaries. And I am not afraid of the mullah.

I, therefore, condemn these abductors and butchers in the strongest words at my command. I pray for the brave departed souls.

I do pray for the surviving comrades of those martyred in the defence of the motherland. May Allah grant them the courage to wipe out the enemies of Pakistan.

of law breaking(qabza groups love qabza groups) phantoms of Islamabad who happen to be sacred. Young Harry Potter fans know them as dementors, they suck in all the happiness with their rattling breaths. Burqas are sacred, we are being told. Listen all ye who believe. Laughing on the funny antics of 'airy forms' is banned.

Open Up the Houses of Allah

25 Jul, 2007

Sir

Here are a few suggestions from a common Pakistani for the benefit of my Motherland. They may not be highly academic and intellectual as the recommendations of the cabinet but worth considering, nevertheless. So here it goes!

Do not lock the mosques. Make it a crime to lock a mosque. Allah shall guard them. If a poor man robs it of a lota or musalla, it is no big deal. Through the centuries the mosques were refuges for the destitute and the way-farer, although not for the terrorists. Unlock them and those spreading discord and mischief in God's earth shall flee. Stop giving the mosques fancy sectarian names. Let it be Mosque No.11, Islamabad, Mosque No. 20, Lahore and on and on. These measures would not require approval from the ministry of finance. They do not involve expense of a single penny.

Simple measures do not fetch votes or any commission, but they are effective.

The Snake Game

25 Apr, 2007

Sir

Mustansar Hussain Tarar has described himself as a self-styled vagabond. Who is not one in my motherland? Professor Irshad Khan used to say," How great the country I live in! It has Generals!! Tariq and Tiger and Napoleon. You name it. It has universities (self-styled...madrassas, in fact). Yes sir. Universities and professors... and even deans. Help me O Lord.

Great People to Live Under

27 Apr, 2007

Sir

Our great National assembly is debating earth-shaking issues like burqa, the slogan raised by a member of the audience in USA who had come to listen to our philosopher- politician(he should be shot for that) and the unheard of incidents of people coming out on the roads- I repeat, people on the roads! Three important issues at one go. Their brains may heat up. I advise three months bed rest, as a practicing Psychiatrist.

Nobody ever blamed Chaudhary Shujaat Hussain of being logical. No, nor of being cogent. Now he wants a certain person shot (by his goons?).

The fault of the person-to-be-shot? He shouted a slogan"na-Pak faujmurdabad". (Dawn, April, 27 ,2007. Govt's Double Retreat...) would he rather have him shout--naaoozobilla-- Pak faujmurdabad.

The heaviest issue on the agenda is a drama playing in Lahore, Burqavaganza. Who ever said Pakistan has such measly problems as food and health and law and order? Much more urgent and profound are the problems

Professor Ghayur Hussain's Books

01 Mar, 2007

Dear Saadulla Jan Barq

I am a regular reader of your column and a great fan of yours. Your wit and choice of verse is unsurpassed. Where can I get the above-mentioned books? My daughter wanted to learn Farsi. I went shopping in the 'third largest city of Islamic republic of Pakistan' and drew a blank. One kind shopkeeper advised me to go to Jaranwala, a Tehsil town. He said a school there still teaches Farsi!! Islam Zindabad. Regards.

A Hard Stroke

16 Apr, 2007

Sir

In the hoary past Qissa Khawani Bazaar of Peshawar was literally, factually a storytellers' square. Old storytellers in their flowing robes and turbans would tell the tales of long dead legendary heroes. They would hold their audience in thrill, making them laugh and cry at will. One of the storytellers, dissatisfied with the response changed the storyline- ' the enemies, hard-hearted as they were, deprived our hero of food and water... there was a lukewarm warm response. They deprived, he thundered, our hero of food and water and... and ' naswaar'. The pushtun crowd burst into tears.

Lal Masjid mullas have threatened to stop the sale of liquor in Islamabad. Now! This will really shake up the bureaucracy. They will do something about the red mullas.

A Letter from the Dead

22 Feb, 2007

Sir

I can not thank you enough for your editorial "Demise of Gujranwala". I belong to the long-dead city of Lyallpur. The carcass was renamed Faisalabad. Lyall became Faisala and Pur turned Bad! You have lamented the slumber of ' the politician and the officer'. I am ashamed to admit that you will find champions of Maulvis Sarwar amongst the doctors, lawyers and professors, the so-called elite of Pakistani society- the best amongst the nations, you know. For the poor departed soul of Zille Huma Usman let Maulana Jalaluddin Rumi speak:

My love is beautiful--one of her faults.

Delicate... soft... that's two and three.

But what's the reason people really shun her?

She's perfectly faultless, that's the sin they flee.

A Lesson from Wild West

23 Feb, 2007

Sir

Zane Grey is perhaps the greatest writer of the Wild West. One of his characters with a sense of honor (not a Pakistani honor killer) says somewhere," My mother taught me to respect her sex." Not so, unfortunately, the son of a wife-beater. A son who has seen his mother repeatedly abused, ridiculed and beaten will always abuse, ridicule, beat and murder women. Other sons of other wife-beaters will applaud him

Good Old Nawaz Sharif

05 Feb, 2007

Sir

These faujis they are trying to sow seeds of distention between brothers. I am saying that no need to do deal with faujis but Shbaz Saab is not agree. He wants to get back into verandahs of power. Faujis they are trying to swoon him away from me. They will not secede because we two brothers have solid under statement and biology in between us. Then there was big snow storm. I said to Shbaz Saab that forget about politics and let's play snowman-snowman. He took cold breath (thandasaans) and said okay. I said I will build Shbaz Snowman and you build Nwaz Snowman. I built quickly one snowman and three wives next to snowman. Like this, this, this. Shbaz Saab also built Nwaz Saab snowman but it took long time because he had to hollow out the head so that it was completely empty. I said how nice and that Mohtarma Benazir Sahiba must be making BB Snowman and PPP executive committee called "Snow White and Seven Dwarfs".

At home Shbaz Saab started saying "so-and-so fauji called and – " I interpreted him and said please, mention not faujis. I told you no deal with them. Is that Christmas clear? Shbaz Saab went off in a puff, slammed door and shouted, "Yes, it's CRYSTAL clear!" Next day I decided that this tension is too much for me and I am going on Hajj. I went to Heathrow and got into fuss class cabin of Saudia. Somehow Shbaz Saab fallowed me there and kept pooling my sleeve and saying please don't go, please don't go. I shook his hand off my sleeve and turned my face away. He kept pooling it and saying please don't go. "What's to you?" I said. "Nothing" he said, "it's just that fuss class is not going to Hajj, only economy is". Then only I got off it.

At home lantern gosht was cooked. I shouted at the children that come to the table and eat lantern with mutton and white rice. What you will remember? Kyayaadkaro gay? Your bhabi asked that where Shbaz Saab is. I said he told me he had to go out for dinner with twin brother of Defence Attache of Pak Embassy. She said I am telling you there is black in lantern.

Daal mein kala hai "دال میں کالا ہے"

Cut Throats

26 Jan, 2007

Sir

The thread that cuts the throat has been outlawed. Great activism on the part of higher judiciary!

Who will outlaw the throat that cuts through my sleep, my rest; my meditation, my peace of mind; my concentration, my study; my thoughts, my creativity?

Wish I were a sod of earth. Laitani kuntu turaba!

Imagine

01 Feb, 2007

John Lennon

Imagine there's no heaven.
It's easy if you try.
No hell below us,
Above us only sky.
Imagine all the people
Living for today.
Imagine there's no country.
It isn't hard to do.
Nothing to kill or die for,
And no religion, too.
Imagine all the people
Living life in peace.
Imagine no possessions.
I wonder if you can.
No need for greed or hunger,
A brotherhood of man.
Imagine all the people
Sharing all the world.
You may say I'm a dreamer.
But I'm not the only one.
I hope someday you'll join us,
And the world will be as one.

Good Old Nawaz Sharif

05 Feb. 2007

Sir

These faujis they are trying to sow seeds of distention between brothers. I am saying that no need to do deal with faujis but Shbaz Saab is not agree. He wants to get back into verandahs of power. Faujis they are trying to swoon him away from me. They will not secede because we two brothers have solid under statement and biology in between us. Then there was big snow storm. I said to Shbaz Saab that forget about politics and let's play snowman-snowman. He took cold breath (thandasaans) and said okay. I said I will build Shbaz Snowman and you build Nwaz Snowman. I built quickly one snowman and three wives next to snowman. Like this, this, this. Shbaz Saab also built Nwaz Saab snowman but it took long time because he had to hollow out the head so that it was completely empty. I said how nice and that Mohtarma Benazir Sahiba must be making BB Snowman and PPP executive committee called "Snow White and Seven Dwarfs".

At home Shbaz Saab started saying "so-and-so fauji called and – " I interpreted him and said please, mention not faujis. I told you no deal with them. Is that Christmas clear? Shbaz Saab went off in a puff, slammed door and shouted, "Yes, it's CRYSTAL clear!" Next day I decided that this tension is too much for me and I am going on Hajj. I went to Heathrow and got into fuss class cabin of Saudia. Somehow Shbaz Saab fallowed me there and kept pooling my sleeve and saying please don't go, please don't go. I shook his hand off my sleeve and turned my face away. He kept pooling it and saying please don't go. "What's to you?" I said. "Nothing" he said, "it's just that fuss class is not going to Hajj, only economy is". Then only I got off it.

At home lantern gosht was cooked. I shouted at the children that come to the table and eat lantern with mutton and white rice. What you will remember? Kyayaadkaro gay? Your bhabi asked that where Shbaz Saab is. I said he told me he had to go out for dinner with twin brother of Defence Attache of Pak Embassy. She said I am telling you there is black in lantern.

Daal mein kala hai "دال میں کالا ہے"

Cut Throats

26 Jan, 2007

Sir

The thread that cuts the throat has been outlawed. Great activism on the part of higher judiciary!

Who will outlaw the throat that cuts through my sleep, my rest; my meditation, my peace of mind; my concentration, my study; my thoughts, my creativity?

Wish I were a sod of earth. Laitani kuntu turaba!

Imagine

01 Feb, 2007
John Lennon

Imagine there's no heaven.
It's easy if you try.
No hell below us,
Above us only sky.
Imagine all the people
Living for today.
Imagine there's no country.
It isn't hard to do.
Nothing to kill or die for,
And no religion, too.
Imagine all the people
Living life in peace.
Imagine no possessions.
I wonder if you can.
No need for greed or hunger,
A brotherhood of man.
Imagine all the people
Sharing all the world.
You may say I'm a dreamer.
But I'm not the only one.
I hope someday you'll join us,
And the world will be as one.

uncovered meat. Uncovered, uncooked meat does not arouse even the culinary appetite of a normal man. Maybe nausea, hunger NO. A nauseating mullah, indeed.

Thanks for the courage you have shown in highlighting the idiocy. It is a quality very rare in my Muslim brothers.

A Proposal for Retirement

26 Jan, 2007

Sir

With Imran Khan and Nawaz Sharif already taking up cudgels for obscurantism on behalf of Qazi Hussain Ahmad, the induction of a new force is more than welcome. Our Prime Minister, enlightened to the hilt, avoided a handshake with the female foreign minister of Israel at Davos. This has been reported in the Urdu press, which very keenly picks up such important news.

Time for Qazi Hussain Ahmad to retire honorably! He is passing the baton to safe hands.

A Precocious Child

02 Nov, 2006

Sir

Qazi Husain Ahmad says small children were killed in the strike on Bajaur. Qazi Hussain Ahmad is an honourable man, we all know. Wednesday's papers carry the photograph of a child, one who survived. The face is covered with thick unkempt beard. Wonder of wonders! I call it a MOJZA.

There are no photographs of the children who died in the attack by USA. (source: Qazi Husain Ahmad)

Uncovered Meat

02 Nov, 2006

It is easy to go down into hell:

Night and day the gates of dark

Death stand wide; but to climb

Back up again, to retrace one's

Steps to the open air, there lies

The problem, the difficult task.

Virgil

Will the grand mufti of Australia and myriads of muftis in every nook and cranny of the Muslim world take notice of what this infidel has to say?

I do not agree with your suggestion to "send the mufti back"(DTnov1, 2006."The dangerous mullah of Australia"). This is a typical Pakistani solution. The SHO of your area is corrupt (they all are, I mean very corrupt) transfer him to my neighbourhood. What is my fault?

I try not to get into diagnostic mode, but can't help wondering about the mental health of a man(forget the moral health) who is sexually aroused to the point of committing rape on the sight of

lords, crony capitalists, the uniformed and civil bureaucracy and their fellow travellers. The working classes (poor souls), labourers, peasants and the urban poor of the contrary, have only one option: waging a relentless struggle in the form of kidnappings of ladies and infants and takeover and nationalisation of enemy property like children's libraries. Inqilab Zindabad.

The Turkish Example

02 Nov, 2006

Sir

President Musharaf is fascinated with Turkey. He romanticises it and wishes to follow its example. This is what he should do. They are prosecuting a 92-year-old academic and a specialist in Sumerian culture and history for the un-Islamic activity of research. She has traced the use of head scarf to Sumerian civilization which dates back to 4000BC. The head scarf was first used by Sumerian priestesses while initiating young people into sex. I think she should be hanged. Then we should look for some woman in Pakistan indulging in this ungodly activity...no, not of being a priestess but doing research work. If you can't find anyone Jugnu is there!

Thank You "N"

14 Oct, 2006

Sir

Some of my PML (N) friends were criticizing the General's book. I bet them a cup of what is banned for ordinary Pakistanis if they can show me ONE member of their party who has read this book. Included in this challenge were their great national leaders like Ch. Sher Ali, Rana Sana Ulla and the Ameerul himself, Mian Muhammad Nawaz Sharif (lately of Ittefaq industries).

I have won the bet going by the news item in Friday's Daily Times and other papers informing us about the incendiary protest against the book. They are not book readers.

THEY ARE BOOK BURNERS, ALONG WITH THEIR MMA BEDFELLOWS!

A Live Communist

23 Nov, 2007

Sir

Everything in history happens twice, said Marx, first time as tragedy, the second as farce. I met an old communist, a comrade of mine, who like many of the left-over Left in Pakistan claims that fundamentalists and terrorists are fighting an anti-imperialist war. This is today's primary contradiction. You would surely know what a 'primary contradiction' is if you have ever met a communist.

I had very studiously avoided that friend to avert the shock of his 'ideological analyses'. Here it goes. He declared the red capped mullah as the vanguard of the infant-snatching, baton brigade of the veiled forms — presumably ladies — to be engaged in a bitter class war. Then lapsing into the favourite pastime of communists, he relegated the acts of kidnapping and anti-women, anti-minorities and anti-commonsense attitudes of this vanguard of the people as a secondary contradiction. He said we should look behind the apparent façade into the real class interests, you know. Prostitution as you all know, he added, is the pastime of the decadent ruling classes — the feudal

is sex deprivation- witness gang rapes and abductions and sex crimes against minors.

The good lady, the wife of the scholar warrior we were talking about, has advised women to wear bomb belts around their ample bellies. This is women empowerment, I say! The amazons would then threaten to pull the pin if the hubbby as much as dares to tread within a one mile radius of the lady.

The scared (and sacred in this case) husband would think of other ways to get his martyrdom. A better way in a better place, say the heavenly vale of Kashmir. A martyrdom that will make it to the front pages of the Urdu dailies, and with luck to the breaking news of infidel channels.

Salute to NADRA

15 June, 2006

Sir

A great organization this! This truly is a lesson for the lazy, the inefficient and the shirker... in short for every Pakistani. NADRA has reversed the trend. They have "collected data of over 780.5 million people, out of which 520 million had been issued with (sic) cards. AND THIS POOR NATION NUMBERS ONLY 150 MILLION, INFANTS AND CHILDREN INCLUDED. This is efficiency, I say.

Leave all Meaner things, to Low Ambition

02 Apr, 2006

Sir

On a wing and prayer we fly to USA. The wings of a plane chartered at the expense of poor Pakistani people, and our prayers of a lifetime to see that infidel country, the Mecca of all our political riffraff, religious or otherwise. A class fellow of mine in school translated ' He went to the land of stars and stripes' as WOH MAR GAYA!(he died or in other words went to heaven, the land of stars.) So every bigwig worth his salt hooks a free ride on PM's plane.

Khalid Hasan in his beautiful article (On a wing and a prayer, DT 2Apr06) asks a plaintive question. "Why does the prime minister need to travel so much and with so many. I hope this answer from Alexander Pope satisfies him:

To be, contents his natural desire,

He asks no angel's wing, no seraph's fire;

But thinks admitted to that equal sky,

His faithful dog shall bear him company.

Psycho Parlour

14 May, 2006

Sir

One of the more common games that people play is assigning each other psychological/psychiatric diagnoses. "Oh, you must be mad" is nauseatingly common. I see no harm in indulging in this harmless pastime/game once in a while.

The occasion for this comment is the address to women by the wife (number?) of the chief of a lashkar (a private army), a professor (sic) and a hafiz. Professorship or learning the Quran by rote has nothing to do with intellectual pursuits in Pakistan. One wonders about this professor and his life-work. Why would a professor opt for the killing fields of jihad and terror instead of the class room and the library?

Frustration, the parlour psych would say. But why frustration with guns and naked power and pelf galore? Parlour psychologists are all Freudians, so your guess is as good as mine. If the graffiti on the walls and advertisements in Sunday editions of Urdu dailies is anything to go by the causa prima of frustration in Pakistan

Yes, Israel has Jericho 1 SSMs, Jericho 2 Shavit space launchers and Popeye Turbo submarine launched missiles. But, there are a dozen other countries whose nuclear arsenal is a hundred times bigger than Israel's. Ever wondered why Jews control the levers of world power?

Here is why: The first micro processing chip was invented by a Jew (named: Stanley Mezor) and so was the microphone (Emile Berliner), nuclear chain reactor (Leo Szilard) vaccination for Hepatitis B (Baruch Blumberg), leukemia fighting drug (Gertrude Elion), optical fiber cable (Peter Schultz), videotape recorder (Charles Ginsburg), traffic lights (Charles Adler), sound movies (Isador Kitsee), stainless steel (Benno Strauss), kidney dialysis machine (Willem Kolff) and vaccinating needle (Benjamin Rubin).

Harrison Ford, Tony Curtis, Charles Bronson, Sandra Bullock, Billy Crystal, Woody Allen, Dustin Hoffman, Michael Douglas, Ben Kingsley, Paul Newman, Kirk Douglas and Jerry Lewis are all Jewish.

In the business world, famous Jews include Ralph Lauren (Polo), Levis Strauss (Levi's Jeans), Howard Schultz (Starbuck's), Sergey Brin (Google), Michael Dell (Dell Computers), Larry Ellison (Oracle), Donna Karan (DKNY), Irv Robbins (Baskins & Robbins) and Bill Rosenberg (Dunkin' Donuts).

More interestingly, Albert Einstein, TIME magazine's 'Person of the Century', was a Jew. Other famous Jews include Sigmund Freud (ids and egos), Estee Lauder (Cosmetic Queen), Jonas Salk (Polio vaccine), Steven Spielberg (director-producer), Alan Greenspan (Fed Governor under Reagan, Bush, Clinton and Bush), Casper Weinberger (US Secretary of Defence), Madeleine Albright (US Secretary of State), Michael Howard (British Home Secretary), Benjamin Disraeli (British statesman and author), Ari Fleisher (Bush's Press Secretary), Wolf Blitzer

(CNN), Barbara Walters (ABC News), Eugene Meyer (Washington Post), Henry Grunewald (editor-in-chief Time), Max Frankel (New York Times) and Henry Kissinger (US Secretary of State).

On March 2, 2001, UNESCO Director-General Koichiro Matsuura said, "In Afghanistan, they are destroying statues that the entire world considers to be masterpieces". Matsuura urged all Islamic countries to pressurise the Taliban.

March 4-8, 2001: Taliban soldiers using antiaircraft weapons, tanks and explosives blew up the 'Standing Buddha's'. Following the destruction, Maulana Qudratullah Jamal, the Taliban's Minister of Information, announced the sacrifice of 100 cows.

There is not a single Buddhist either in Afghanistan or in Denmark but there are 390 million Buddhists in China, 90 million in Japan, 62 million in Thailand, 8 million in India, 2 million in Indonesia, 3 million in the United States, 700,000 in Bangladesh, 500,000 in France, 380,000 in Australia and 300,000 in Canada. All put together, world Buddhist population stands at 708 million or 11 percent of humanity.

Interestingly, not a single Buddhist monk around the world issued any edict, decree or command for the 708 million Buddhists to avenge the destruction of 'Standing Buddha's'. Not a single Buddhist killed another human being or burnt an embassy (Islam always insisted that the killing of another human being is the equivalent of killing the entire humanity).

Nextfact. There are 213 million Muslims in Indonesia, 156 million in Pakistan, 144 million in India and 127 million in Bangladesh. All put together, world Muslim population stands at 1.4 billion or 23 percent of humanity.

Collectively, a total of 1.4 billion Muslims, 23 percent of humanity, produce less than 5 percent of global GDP. Even more worrying, GDP of Muslim countries as a percent of global GDP is declining over time. To be certain,

6 out 10 Muslims cannot read or write (of the 1.4 billion Muslims 800 million are illiterate).

Intriguingly, over the past 105 years, 1.4 billion Muslims have produced seven Nobel Laureates; 23 percent of world population with a 1 percent share of Nobel Prizes. Of the seven Muslim Nobel Laureates, four – Anwar Sadat, Yasser Arafat, Shirin Ebadi and Mohamed El Baradei – actually won Peace Prizes. The three who won in Physics, Chemistry and Literature are Abdus Salam, Ahmed Zewail and Najib Mahfooz (respectively).

Interestingly, Abdus Salam became a Nobel Laureate while pursuing his scientific work in Italy and the UK and Ahmed Zewail won his prize pursing his studies of the 'transition states of chemical reactions using femtosecond spectroscopy' at the California Institute of Technology. Furthermore, Abdus Salam is not considered a Muslim in his home country and Najib Mahfooz was stabbed in the back by his Muslim brothers in Egypt (Najib was partially paralysed).

Next fact. There are 6 million Jews in the US, 5 million in Israel, 700,000 in Russia, 600,000 in France, 400,000 in Argentina and 390,000 in Canada. All put together, world Jewish population stands at 14.5 million or 0.227 percent of humanity.

In all probability, there are more Muslims in Karachi than there are Jews in the world. There are more Muslims in Faisalabad, Rawalpindi and Multan combined than there are Jews in the world.

Interestingly, a total of 14.5 million Jews have produced 169 Nobel Laureates; a mere 0.227 percent of humanity with a 22 percent share of Nobel Prizes (a total of 758 individuals have been awarded the Nobel Prize, 33 women and 725 men).

Pakistan will set you right

17 Mar, 2006

Sir

Pakistani law forces the people to respect the prophet of Islam. If they don't they are hanged. Now we will bring an amendment to the constitution (our favorite pastime) and then this law will apply to all the inhabitants of all the worlds (AALMEEN). You just wait and see!

Great Muslims?

31 Mar, 2006

In 2nd century AD, Emperor Kanishka began the construction of two monumental statues of 'Standing Buddha's'. The largest 'Standing Buddha's' on the face of the planet measured 180 feet and 121 feet tall.

The 'Standing Buddha' of Bamiyan was designated as a World Heritage site by UNESCO (United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization). Each World Heritage Site is protected under the Convention on the Protection of the World Cultural and Natural Heritage (ratified by 180 countries). There are around 812 World Heritage Sites, 628 cultural, 160 natural and 24 mixed properties; each World Heritage site is considered to be of "outstanding value to all humanity".

On February 26, 2001, Mullah Mohammed Omar informed 29 million Muslims of Afghanistan that "on the basis of consultations between the religious leaders of the Islamic Emirate of Afghanistan, religious judgments of the Ulema and rulings of the Supreme Court of the Islamic Emirate of Afghanistan..." the pre-Islamic 'Standing Buddha's' would be destroyed. The task of destroying the 'Standing Buddha's' was given to the Ministry of Information and Culture and Vice and Virtue.

Oaths and Oaths

03 Sep, 2005

Sir

Today's Post (Sep 1, 2005) carries a photograph of Mr Justice Rana Bhagwandas. He looks so sober, so wise. He is taking oath of his new office as the acting Chief Justice of Pakistan, one of the angles of the triangle- the triumvir-I of this country -that rules our destinies.

Oaths are nothing new for ordinary mortals of Pakistan. Members of ruling elite escape the clutches of law by taking an oath, or somebody taking an oath on their behalf. "I declare under oath that my nephew did not commit this murder." And it suffices. The commoners have their oaths aplenty. "I declare under oath that this enemy of mine committed blasphemy." Unbailable offence! I want to do my Ph.D. from Punjab University on worms, plants or wayward atoms. I shall have to declare on oath that I believe that prophet-hood has ended. I may not be required to state my belief about the institution of prophet-hood while applying for my driving license because I have done so for my national identity card which,of course, is a basic requirement for getting my driving license.

Did Mr. Justice Rana Bhagwandas state it on oath that he believes that the institution of prophet-hood has finished. If not, why not? (no blasphemy intended for the high office.)

Wrong Technique

13 Feb, 2006

Sir

Shoaib Malik has scored ninety plus runs in each innings of the last three matches in the opening spot where we are supposed to have a problem. Are the powers that be in Pakistan cricket sleeping. He should be immediately replaced. He is technically flawed, I tell you.

Pakistan Last

02 Sep, 2005

Sir

"All is not rotten in the state of Pakistan," I tell my friends proudly. "There is still the Daily Times." And now you put Qazi Hussain Ahmad on the front page pontificating on a very important and sensitive foreign policy issue viz: relations with the state of Israel. (DT Sep 2, 2005) This is a person on record disclaiming the interests of the state of Pakistan. "I cannot put the interests of Pakistan above everything else (SAB SAY PEHLAY PAKISTAN). This interferes with my Eeman." What a leader and what Eeman!

You have honoured him unduly and this may help him in bringing more harm to our Pakistan, our Eeman. I protest as a Pakistani citizen and a reader of your esteemed paper from day one of your existence.

I wonder

11 Feb, 2006

Sir

We don't abuse Hindu gods and idols. We don't abuse and lampoon Ahmadis' prophet. We do not declare Jews and Christians as our perpetual enemies. We don't shun godless people. We don't fight communists. We don't make fun of Sikhs' beards, clothes and hair styles. We don't bomb peaceful communities. We don't even make their school children our hostages.

I wonder why all the world hates and ridicules us.

I JUST STAND AND WONDER.

A Veiled Threat

01 Sep, 2005

Sir

The men usually get up in the middle of the night to go to the toilet. Some get up to go home, says the wit. A good many get up to raid the fridge.

Veiled women raid liquor shop in Srinagar, says Post (Sep1, 2005). Up till now beard was the license to poke your nose in everybody's affairs. Henceforth it shall be the veil! Beware all ye who wear nor beard nor veil.

A Point to Ponder

02 Sep, 2005

Sir

"I love the valiant; but it is not enough to wield a broadsword, one must know against whom."
-- Friedrich Nietzsche

Love to the valiant at Khanewal and Peshawar and now at Lahore. Please consider: ordinary citizens of Pakistan do not hold Danish nationality. Our cars were not bought with their money. The shops in Peshawar were not stocked with the help of Danish Krone. The cars burnt in Lahore belonged to poor Pakistanis, most probably bought against a loan from the bank. The poor passenger's in the train at Khanewal were NOT going to Denmark. May Allah lead you in the straight path! Shout to your heart's desire but spare ordinary Pakistani mortals.

Natural Pakistani Males

Daily Times 29 Aug, 2005

Sir

London zoo is exhibiting humans in their natural environment (Infotainment, DT, August 28, 2005). The accompanying photograph corroborates the claim that they are "barely clothed (and) within a rocky enclosure". Natural enough I will say as far as the ladies are concerned. They are not hiding their faces in veils- and faces not ugly! They are not ashamed of their bodies, although shapely, to sneak in wrap-around. The men, however, are "shaven and shorn". Haven't they seen natural men. We can lend them a few natural specimens of 'the best of all creations'.

A chemist amongst the group at display resents the fact that "a lot of people think humans are above other animals....here; it kind of reminds us that we're not that special". Now, aren't we? Just examine the specimens we intend to export for your benefit and education and then decide. They are guaranteed to look as natural as if they were raised in a jungle. And that is not all. Their minds are also guaranteed to be natural, nay, pristine to match their primate relatives. So natural and primitive in fact that they have not heard of Dawin. And if they have they do not 'believe' him.

Here you Flunked!

29 Aug, 2005

Sir

You have done well to audit the performance of our banker PM (One Year of Shaukat Aziz: The Post August28, 2005). Audit is necessary for all public performers, media included. More so the print media- the opinion makers in Pakistan. The English press in Pakistan is by and far balanced and fair. So is the Post.

There is one lapse, however, that I want to bring to your notice. History produces certain outstanding personalities albeit rarely. If we are lucky to have someone belonging to this category in our midst he needs special treatment. Someone so great, so self-effacing that he does not take over Islam Abad although he can do it easily, according to his modest claim.

In the 14 days of your existence you have not published even 14 statements, sermons and threats from the said great man.

You have guessed it right. I am talking of the warrior-statesman Qazi Hussain Ahmad.

Be careful in future. Or else!

The election commission should publish two lists, one of the winning candidates- say list A and a list B which should contain the names of all the rest of the candidates whose electon was rigged. Nobody lost. Period.

Letters to the post

28 Aug, 2005

Sir

With the power divided between Musharraf and the mullahs, I don't know if it is kosher to dig out old jokes. I do hope I do not fall foul of a blasphemy law. A major presiding over a military court was asking the respondent why he had beaten a man in uniform, when he knew that it was a very serious crime. The chastened civilian replied that he had nothing personal against this man or the uniform in general but, having seen another civilian boxing the soldier's ears for personal reasons, he "thought the Martial Law had been lifted and gave him a couple of blows for good measure." I was reminded of this joke by a column in The Post (August 17, 2005) titled: "Siraj ordered to stay out ofNowshera." With civilised countries throwing Pakistani clerics out of their countries and airports, this news from Peshawar about the senior minister is good.

The minister has defended himself in the usual logic(mantiq) of the mullaviz: one crime justifies another. "...a man wearing khaki...had got free hand even to play with the institutions..." says Siraj "shocked with the court decision".

But we Never Loose...

26 Aug, 2005

Sir

This nation was born to lead, to rule, to succeed and to win. Sans education, sans hard work, sans honesty. That, somehow, is our destiny. To loose is not in our dictionary.

When we lose a hockey match it is the sheer cussedness of biased European referees. A loss in a cricket match is unimaginable. It is always bad umpiring. We do not loose battles, nor wars. The blunder of 1965 was a CLEAR VICTORY. The unmitigated disaster of 1971 was our march to NEW PAKISTAN. We do not even loose face. If all the terrorists turn out to be Muslims, it is a Jewish conspiracy to malign Islam.

We have just had local 'non- party' elections. And nobody lost. It was not one of the options. You either win or the elections were rigged.

Welcome and Godspeed

The Post 16 Aug, 2005

Sir,

Your high-sounding resolve in your inaugural editorial is almost Musharafesque, to wit:

"The truth will lead, and we will follow, no matter where this quest may lead..."

This is what frightens me. Musharaf, the enlightened moderate, has got a long beard inside his tummy, as the Punjabi saying goes. Have you?

An English language paper from the house of Khabrain is welcome. Hope the house maintains its, by now legendry, courage even when threatened by beardies.

Jokes, Old and New

17 Aug, 2005

Sir,

With the power divided between Musharraf and mullas I don't know if it is kosher to dig out old jokes. I do hope I do not fall foul of a blasphemy law. Now this major presiding over this military court was asking the respondent why did he beat that man in uniform. Did he not know this was a very serious crime if a civilian beats a military man. It should be other way round, normally. The duly chastened civilian said he had nothing personally against this man or uniform in general. "I just saw this other respondent who is a cousin of the aggrieved soldier boxing his ears for personal and very private reasons. I thought the Martial Law has been lifted and gave him a couple of boxes for good measure."

I was reminded of this joke by the seven column lead in the Post(17Aug05): "Siraj ordered to stay out of Nowshera." With civilised countries throwing Pakistani clerics out of their countries and airports this news from Peshawar about the senior minister is good. Ha, Ha.

Welcome Home

Daily Times 22 Jul, 2005

Sir

There is news that Pakistanis form the largest percentage of men expatriated from various countries. I am hurt and happy at the same time, for I was very jealous of my uncouth compatriots enjoying the privileges of the first world, hating their gentle hosts at the same time.

Welcome home to the dust and heat; to flies and fundos!

I have a Khalifa

Daily Times 22 Jul, 2005

Sir

Pakistan is teeming with authorities: housing authorities, water and power authorities, civil and military authorities and many many more. The latest authority is an individual and not even a Pakistani!

An Iranian individual named Ali Khamenei, according to Iranian constitution, is "the highest religious authority for all Muslims througout the world"(Amir Tahiri: Ahmadinejad uses his...DT 10Jul05). Well, well, well.

Beats Pakistani mullas hands down.

On the Death of a Particular Friend

29 Apr, 2005

"As those we love decay, we die in part,
String after string is sever'd from the heart;
Till loosen'd life, at last but breathing clay,
Without one pang is glad to fall away.

Unhappy he who latest feels the blow!
Whose eyes have wept o'er every friend laid low,
Dragg'd ling'ring on from partial death to death,
Till, dying, all he can resign is—breath."

A Dog and A Mulla

20 May, 2005

Sir

A cartoon in Washington Times has aroused a lot of interest in Pakistan. The crowd that must play to the gallery has shown some resentment and made much of a newspaper cartoon. One can only pity a human being who has no sense of humour. The national assembly, sadly, is completely filled with the type. Humour is as rare in Pakistan as commonsense, with the possible exception of working classes.

Various columnists have penned articles on the subject, ensuring no humour creeps in. You know it is such a solemn affair. What all and sundry have failed to realise is the significance of the whole affair.

Bill Garner's cartoon showed a dog holding a mulla by the scruff of the neck. This is something the liberal and left forces in Pakistan including enlightened generals have failed to do all these years. And the whole nation is with the dog and not with the mulla. This is a seismic shift in the thinking of Pakistani nation. And, yes, the nation has one voice, it is unanimous.

The Power of the Parliament

Sir

I was moved by the concern you showed last night about the possible attack on the Parliament by Musharaf, our venerated ex-army chief through the soon to removed powers of the President. The said person declared us unfit for democracy a few weeks ago. He cited Europe's four-century long struggle for democracy. Now, what did this struggle entail? I bring to your notice a brilliant chapter from this glorious struggle.

In France the general assembly was created on the 7th of June 1789. People got one third share in this assembly. The 'people' comprised of poor peasants mostly. Included in this group were servants, skilled and unskilled workers, doctors, lawyers, teachers, storekeepers, and laborers. Religious establishment got one third seats, the other one third went to royalty and landed gentry.

King Louis XVI, foreshadowing today's Pakistan resented even this limited sovereignty of people. He locked the chambers of deputies. The members met in a covered tennis court to forestall a coup by the ruler against the people. They took a solemn oath known as the oath of the tennis court:

"We swear never to separate ourselves from the National Assembly, and to reassemble wherever circumstances require, until the constitution of the realm is drawn up and fixed upon solid foundations." This oath was signed by 576 members out of 577(Europe kay bay iman loge!)

With the general populace on the streets they forced the 'chief' to cancel his orders.

Our assembly has the solid backing of the people. They are the sovereign rulers of the country. I am sure they will assert people's sovereignty and hold onto the Assembly as the seat of people's power and sovereignty.

Who will dare to pull them out of their rightful abode! Instead of the tennis court they have the four provincial assemblies defended by the valiant and awakened people of Pakistan!

What about my hurt feeling and sentiments?

Daily Times 25-10-2003

Sir: One often bears that the police is overworked and regularly reads about their leisurely pursuits: picking up kids for watching movies: arresting respectable citizens for following the cricket match 'with an intent to bet': and smelling peoples breath to tell apart onions and alcohol. But I wonder why no one ever tells the busybodies to get on with their job of policing __ solving murders, dacoities, thefts etc.

One also hears about the judiciary being terribly busy and overworked and the innumerable pending cases. One regularly reads about higher courts pondering the hurt feelings and religious sensibilities of a couple of Lahoris who threw a tantrum because a child flew a kite or another lit some fireworks or because some Pakistani women decided to play a game. The latest affront has been a fashion show where some cricket personalities showed up 'on a holy night'. What more will they have to witness in this evil world?

But I wonder why no court ever heard or took suomoto notice of the devilish din created by

loudspeakers at 3 am, 365 unholy nights a year. This is, probably, condoned and, possibly, encouraged by the establishment as a good way to take care of the "reading" public (If there are any silly souls out there who still indulge in such habits). Who in his right mind will read late into the night knowing that loud-speakers start earlier than dogs, in fact earlier than sparrows and even earlier than the cock who is supposed to herald the new day.

No one ever litigates for decency and good sense. The rumpus is only about 'profound theodicy' — to borrow a phrase from Voltaire. We recently saw a government official in NWTP, who bartered away his clean-shaved good looks for the 'job', addressing an international conference of women. The good ladies were all in hijab and the speaker the only bare-faced male around. Mullahs seem to be fond of addressing purda-observing ladies. Would it not be better to blindfold the bull rather than shroud the entire china shop! That way the ladies can enjoy 'the rights that we have given them that the world cannot imagine' and escape being overdressed.

As for the litigating Victorian prudes, perhaps we should establish a special court to look into these complaints. At least this way the ordinary courts can get on with the mundane daily fare. Maybe I can also approach this special court with hurt feelings, emotions and sensibilities because of the unashamed display of idiocy and hypocrisy. Maybe this court will try the people who tarnish the image of my country and make Islam the laughing stock of the world.

"Bibi (or baba), if you don't have a jarnailisiri, it will have a brain. And you will have a mind. You can, sometimes, get sick in the head." This usually gets her talking.

What this patient was doing is called denial. It is one of the narcissistic defence mechanisms of the unconscious. It affects the perception of external reality.

"My chest pain is not heart pain. It is just indigestion. Some home made chooran, the pride of every housewife, or a simple antacid will cure it." And things like that.

Seeing and hearing, but refusing to acknowledge. Denying that illiteracy is a handicap. It may be a way of averting anxiety or a character trait. It may lead to regression or secondary depression.

"I refuse to recognize the progress that others have made. Our primitive ways are better. Sacrosanct, in fact." This is just one example of the behaviour.

In certain given circumstances, it is a normal reaction. In bereavement, for instance.The loss of a dear one, a near one or a valued object. But then it is limited in time and is not worn as a medal.

"Oh, no my brother can't be dead. No, he isn't. Look doctor! He is still breathing."

Tailpiece: Pakistan recently invited Crown Prince Abdullah of Saudi Arabia in the hope of attracting Saudi investment. In the investiture ceremony in Lahore, on October 25, the secretary concerned requested the president to allow him to "declare the investment ceremony closed." This unconsciously motivated lapse of logic is called the Freudian slip. In common language, slip of the tongue or 'lapsus linguae'.

Freud observed that parapraxes, or mistakes, in speech provided concrete evidence of the role of the unconscious in everyday life. The secretary of an investment-hungry country turned an investiture ceremony into an investment ceremony. Freud would have loved to quote it as an example!

Psychiatric terms in everyday life

Faisalabad, a city born as Lyallpur, is built on the pattern of the Union Jack. It has eight bazaars emanating from the Clock Tower, made famous in Pakistani political parlance as a symbol of self-serving two-bit dictators. The field marshals. This third largest population aggregate in Pakistan has been proudly acclaimed as the largest village of Pakistan.

During daytime, you can see upto 25,000 people rubbing shoulders in the largest of the eight, the Jhang Bazaar. The sheer numbers make it look like an Indian city. Every weekday is a market day here, a mela with loudspeakers blaring, selling the latest audios from Pakistan and India.

This bazaar sells fresh fruits, vegetables and provisions. This bazaar has those quack specialists who clean your ears, pull out your teeth and sell the poor man's Viagra. They tend to your mental, psychological and spiritual (roohani) problems. And to cure them they prescribe 'actions' or umleeaat.

They read your future in the stars, the lines on your palm, your mama's name and the date of your birth in a

country where 70 percent of the people are too illiterate to know their dates of birth. They manage to find a way into your unconscious. And, yes, they have been interpreting your dreams before Freud was born. They are the true ancestors of psychiatry.

In Jhang Bazaar they sell beef and mutton and poultry. Also available are spare-parts of goats-heads, livers, kidneys and paws which go into various spicy dishes, generally, for breakfast. The heads fetch two prices, the regular and the discounted. You get a discount on a head that contains no brain which is sold separately. This later variety is called JarnailiSiri on the "General's head."

Whey you tell your patient that you have a psychological problem, they immediately denies it. "Oh, no! We have never had it in our family."

"Okay," I say. "You have a heart. You can have, sometimes, a heart problem. The same for kidneys and the liver and the lungs. Now there is a small organ well protected by a thick skull. Weighs about one kilogram and a half. It is called the brain."

"Each and every organ of the body when it becomes ill, produces signs and symptoms which are related to its normal functions. Example, the kidney! It normally produces normal urine. When it is sucked you get less than normal, more than normal, or high coloured, or infected burning urine.

"The brain is normally concerned with thinking, emotions and behavior which is the result of the first two. So, when you have a problem in these areas, we say you have a psychological problem, a psychiatric problem, a mind or brain problem."

"Well, doc, yes… but… we've never had it in our family."

religions was imparted. There was no contact with the books of those religions. I have not seen any of the books of those religions. None are found in college or university libraries. I never demanded that these books be made available. On the other hand I agitated for the banning of this, this and the other book.

I can criticize communism for hours without ever having read that short communist manifesto.

The result is a constitution that has no instrument to enforce itself, a Parliament that has no sovereignty, a leadership that has no direction, a judiciary that includes those who were sworn in under an emergency proclamation and an executive that has no morals and no checks, either. We have religious parties that practice politics without religion, political parties that compete in religious sloganeering, and an army that cannot defend itself or 'the long porous border'---making it up by defending ideological borders, whatever that means. We can't fight the anti-state elements, so we hold political dialogue with the elements that do not recognize the state itself. The people who kill our innocent citizens have the full backing of our patriotic media which brands them as" our co-coreligionists, our compatriots." What are those soldiers whose throats aie slit? We tolerate this butchery to "save the peace accord".

In our daily life we have air conditioned transport without working air conditioners, a broad band Internet without speedy download, young show-offs who have 'first class first masters' (compared to the old pedestrian M.A.)in various languages without the ability even to order a glass of water in those tongues; myriad food outlets without quality control. We have Professors (and, yes, Deans!) without any academic output. Have the international Academia ever had the benefit of great contributions of our

great Pakistani scholars (barring a few Britons or Americans of Pakistani origin)? And yet we shall teach the world, lead the world and ...and, yes, DOMINATE the world!

We are trundling along sans direction, sans morals sans everything. Pray for us o! those who still believe.

Decaffeinated Pakistan

05May, 2009

There was a time when I used to laugh at the idea of decaffeinated tea. Why take tea at all, I would say. That was ages ago, eons ago. Am I old! Ancient? Now I take tea that has no caffeine in it. I sweeten it with a powder that has no sugar. I imbibe 'zero' cold drinks. I salt my curries with a powder that has no salt in it. I sprinkle it on my fried egg-without-yolk. My butter has no relation to dairy.

Are these new ideas? No, not new when I look back. I was raised on them. The little education that I have had included Biology sans Darwin, Psychology sans Freud, Economics sans Marx and philosophy without logic. No scientific course included methodology of science. High school students are not taught geography in our schools. [The girls should not be taught geography, says an Urdu wit, otherwise they will run away from their homes!] They have Pakistan studies instead. They can't name the continents and when questioned about volcanoes they flit from Algeria to Indonesia with a stopover in Samarkand and Bukhara. In my school and 'mad rassa' I learned to criticize other religions without the vaguest idea of what those religions were. I just hated those religions in "good faith". Not even a basic understanding of those 'weird'

ہجر اور وصال کے پھول

ہجر کی رات اور وصال کے پھول
آج پھر درد و غم کے دھاگے ہیں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھول

تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تری یاد پر چڑھا آئے

باندھ کر آرزو کے پلّے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

(فیض)